

سلسلہ مطبوعات نمبر ۳۳۳

رؤی کی ادب

محمد مجیب بنی۔ لے (آکن)

استاد جامعہ ملیہ اسلامیہ

پہلا حصہ

شائع کردہ

انجمن ترقی اردو ہند، دہلی

۱۹۴۰ء

نئی مطبوعات

اضافیت یہ کتاب ڈاکٹر محمد رضی الدین صدیقی صاحب پروفیسر ریاضیات جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن کی، جنہیں اس سال نوبل پرائز ملا ہے، تصنیف ہے۔ اس میں ڈاکٹر صاحب موصوف نے آئن ٹائن کے نظریہ اضافیت کو عام فہم زبان میں بیان کیا ہے۔ جس نظریہ کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ اس کے سمجھنے والے دنیا میں صرف دو چار ہیں۔ اس کی تشریح ایسی سلیس زبان میں کی گئی ہے کہ معمولی ریاضی جاننے والا آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی یہ تصنیف اردو ادب میں بیش بہا اضافہ ہے قیمت مجلد ۴۰ غیر مجلد ۱۲

عظما معمار اسٹیم - یہ یورپ کے بلند پایہ ڈراما نگار ابن کے نہایت ممتاز ڈرامے "ماسٹر بلڈر" کا ترجمہ ہے۔ جس میں مصنف نے نفسیاتی نکات کے بیان کرنے میں بڑا کمال دکھایا ہے۔ اور جو بقول پروفیسر فرانسس بل "جہاں تک بنیادی امور، اس کے مقصد اور بنی نوع انسان کے متعلق اس کے تصور کا تعلق ہے یہ ڈراما وقت اور مقام کی قیود سے آزاد ہے۔ اور دنیا کے دور دراز حصے میں بھی جہاں انسان بستے ہیں یہ سب کی سمجھ میں آسکتا ہے۔ عزیز احمد صاحب بی۔ اے۔ آنرز (لندن) نے ایسی خوبی سے ترجمہ کیا ہے کہ اہل کٹھن آجاتا ہے۔ قیمت مجلد ایک روپیہ چار آنے ۴۰ غیر مجلد بارہ آنے ۱۲

کا

انجمن ترقی اردو ہند دہلی

سلسلہ مطبوعات نمبر ۱۳۳

رؤی ادب

محمد مجیب بی۔ اے (اسکن)

استاد جامعہ ملیہ اسلامیہ

پہلا حصہ

شائع کردہ

انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی

۱۹۳۰ء

خاں صاحب عند اللطیف نے لطفی پریں دہلی میں چھاپا

اور

نیچرا انجمن ترقی اردو دہند نے دہلی سے شایع کیا

فہرست مضامین

۱-۲۹	دیباچہ
۳۰-۴۰	تمہید
۴۱-۱۰۲	پہلا باب : ادب العوام دوسرا باب : پہلی کوششیں رؤسی شاعری
۱۰۵-۱۰۶	پہلا باب : پشکن
۱۳۶-۱۳۸	دوسرا باب : لیرنٹوف
۱۶۹-۲۰۰	تیسرا باب : چیوچف
۲۰۱-۲۳۸	چوتھا باب : ریل بے یف، باراتین سکی، مہزنی کوف، کولٹ سوف، نی کی تن، تالتائی، نکر اسوف،
۲۳۹-۲۴۸	پانچواں باب : پارناسی شاعر، استعاریت اور انقلاب
۲۴۹-۲۹۰	رؤسی حکایتیں رؤسی ڈراما
۲۹۱-۳۱۱	پہلا باب : ابتدا
۳۱۲-۳۵۰	دوسرا باب : ادس تروف سکی
۳۵۱-۳۸۱	تیسرا باب : ادس تروف سکی سے انقلاب تک



دیباچہ

رؤسی ادب کی یہ تاریخ آٹھ برس میں تیار ہوئی۔ میرے لیے بڑے فخر کی بات ہوتی اگر میں یہ کہہ سکتا کہ میں نے آٹھ برس اس کتاب پر محنت کی، لیکن سچ تو یہ ہے کہ یہ مدت کتاب کی قدر بڑھانے بغیر گزرتی۔ میں نے اس کا بہت بڑا حصہ مولوی عبدالحق صاحب کے زیر سایہ اور رنگ آباد میں ۱۹۳۱ء میں لکھ لیا تھا، اور بعد کو میں بیشتر مسودے پر نظر ثانی کرتا رہا۔ مولوی صاحب کی مروت نے گوارا نہ کیا کہ مجھ سے کام جلدی ختم کرانے کو کہیں، اور مجھے اتنی یکسوئی نصیب نہ ہوئی کہ کتاب کو مکمل کر کے مولوی صاحب کی خدمت میں پیش کر سکوں۔

اب جو کتاب تیار ہوگئی ہے تو میں سوچتا ہوں کہ اسے کس حیثیت سے پیش کروں۔ وہ لوگ جو انگریزی میں رؤسی ادب کے شاہ کاروں کا مطالعہ کر چکے ہیں رؤسی نظم کے سوا اور کسی حصے کو نیا یا پڑھنے کے لائق نہ پائیں گے، وہ جو اس کتاب کو رؤسی ادب سے تعارف کا ذریعہ بنا میں شاید اسے بہت طویل اور اکثر اسے دلچسپی سے خالی دیکھیں گے۔ سب سے زیادہ اندیشہ مجھے ان دوستوں کی طرف سے ہے جنہیں رؤس کی قدر کرنا انقلاب کی تعلیم نے سکھایا ہے اور جنہیں صرف رؤسی ادب کے اس حصے سے مطلب ہے جو انقلاب کی طرح تازہ اور انقلاب کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ یہ حضرات شاید اس کتاب کو ایک صریحی دھوکا سمجھیں، اس لیے کہ انقلاب کے زمانے کے نئے مصنفوں کا اس میں ذکر ہی نہیں۔

میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ مجھے ان نظریوں سے اتفاق ہے جو انقلاب کے زمانے میں ادب اور ادیبوں کے فرائض سمجھانے کے لیے پیش کیے گئے، لیکن اس کا میں یقین دلانا چاہتا ہوں کہ رؤسی ادب کی اس تاریخ میں یہ کمی کسی اصولی اختلاف کی وجہ سے نہیں گئی۔

اس کا سبب صرف میری معذوری ہے۔ میں اس زبان کو اچھی طرح نہیں سمجھ سکتا جو روس میں اچانک انقلابی تحریک کے ساتھ رائج ہو گئی اور اس زمانے کی تصانیف اصل زبان میں حاصل کرنا خاصاً دشوار بھی تھا۔ جو دو چار مصنف قدیم زبان میں لکھتے رہے ان کا میں نے مطالعہ کیا، مگر یہ مطالعہ ان ادیبوں یا ادب کے اس دور کا حق ادا کرنے کے لیے کافی نہ تھا۔ اب شاید نئے روسی ادیبوں کو زبان اور اسلوب بیان میں اپنا الگ طریقہ اختیار کرنے کا وہ شوق نہیں رہا جو پہلے تھا، اور ممکن ہے اس نئے دور کی تصانیف اصل روسی زبان میں جلد دستیاب بھی ہو سکیں۔ اگر ایسا ہوا تو انشا اللہ روسی ادب کی تاریخ کا تیسرا حصہ بھی تیار کر دیا جائے گا۔

انقلاب کے ادیبوں کے ساتھ چند ایسے مصنفوں کا ذکر بھی رہ گیا ہے جو نئے اور پرانے دور کی درمیانی کڑی ہیں۔ ان کی اس خاص حیثیت کو نظر انداز کر کے ان پر تبصرہ کرنا میں نے مناسب نہ سمجھا، اور ان کی تصانیف کا ذکر بھی میں نے اُس وقت کے لیے اٹھا رکھا ہے جب انقلاب اور اُس کی کیفیتیں زیر بحث ہوں گی۔ یہیں اس کتاب کی وہ خامیاں جن کو مجھے بحیثیت مصنف خود بیان کر دینا چاہیے۔ ان کے علاوہ بہت سے عیب ہیں جنہیں تنقید کی نظر دیکھے گی اور دکھائے گی اور انہیں بھی تسلیم کرنا میرا فرض ہو گا لیکن اگر اس کتاب سے کسی کا جی بہلے یا کام بکھے، اگر کسی کا خیال ہو کہ اس سے اردو ادب کے ذخیرے میں اضافہ ہوا ہے اور تذکرے اور تنقید کا ایک بہتر معیار قائم کرنے کی عام تحریک کو اس سے کچھ فائدہ پہنچا ہے تو اسے مولوی عبدالحق صاحب کی اس ادب پروری کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ جس نے مشق کی سداد اور استعداد کا ثبوت مانگے بغیر اتنا بڑا کام ایک انجان امیدوار کے سپرد کر دیا میں جانتا ہوں کہ میں اس لایق نہ تھا کہ مجھ پر اس طرح بھروسہ کیا جائے اور دوسری ذمہ داریوں نے مجھے اس کا موقع نہ دیا کہ محنت سے ادبی استعداد کی وہ کسر پوری کر سکوں جسے میں قدم قدم پر محسوس کرتا رہا۔ یہ مولوی عبدالحق صاحب کی قدر دانی تھی کہ جس نے میری ہمت کو قائم رکھا، ان کی صحبت سے میں نے اتنا فیض اٹھایا ہے کہ مجھے یقین ہو گیا ہے کہ ان کی قدر شناسی اور حوصلہ افزائی دوسروں سے اُس معیار کا کام کرائے گی جو مجھ سے نہ ہو سکا، اور ان کی بدولت اردو ادب کو وہ فروغ ہو گا جس کی انہیں اور ہم سب کو

تمنا ہے :- محمد مجیب - جامعہ ملیہ اسلامیہ - ۱۷ نومبر ۱۹۳۹ء

روسى ادب

تہید

ایک زمانہ تھا جب مورخ ہر نسل کی ابتدا حضرت نوح کے کسی بیٹے سے کرتے تھے اور اس طریقے سے صرف مذہبی عقیدے کی پیروی نہیں ہوتی تھی، بلکہ نسلوں کے آواز کے پیچیدہ مسائل آسانی سے حل ہو جاتے تھے۔ اب علم تاریخ رسی فرضی کارروائی کا روادار نہیں اور مورخوں کو مجبوراً اپنی لاعلمی کو علم کی صورت دینی پڑتی ہے، لیکن اگر سچ پوچھا جائے تو نسلوں کے شجرے ایسے اُبکھے ہوئے ہیں اور صحیح معلومات حاصل کرنے کے ذریعے اس قدر کم کہ ہماری کوششیں کسی طرح سے بار آور نہیں ہوتیں اور آخر میں یہی اقرار کرنا ہوتا ہے کہ پُرانا طریقہ بہتر تھا۔ مثلاً اگر روسی قوم کو سلاف، فن، قوت، ستھین، وریاگ، مورڈ، باشکیر، ہن، تاتار اور متعدد دیگر معروف ایشیائی نسلوں کا مجموعہ کہنے کے بجائے حضرت نوح کے کسی بیٹے کی اولاد بتا دیا جائے تو علم تاریخ کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا اور روسی قوم کی فطرت سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی۔ روسی قوم کی موجودہ خصوصیات ہم کسی ایک نسل کی طرف منسوب نہیں کر سکتے، کیونکہ یہ خصوصیات رفتہ رفتہ سرزمین اور فطری ماحول نے پیدا

کی ہیں اور جب کوئی نسل یا نسلوں کا مجموعہ ایک ملک میں آباد ہو جائے تو نئی نسلوں کا میل اس کی قدیمی سیرت نہیں بدل دیتا۔ روس کی آبادی میں بہت سی نسلیں شامل ہیں جو مل جل کر تقریباً ایک سی بن گئی ہیں اور ایک ہی سر زمین کی پیداوار معلوم ہوتی ہیں تفتیش کے لائق اگر کوئی مسئلہ ہے تو صرف یہ کہ یہ نسلیں زیادہ تر یورپی ہیں یا ایشیائی، اس لیے کہ روسی تہذیب یورپ کے زیر اثر رہی ہے، لیکن روسی فطرت یورپی اثرات کو کبھی اچھی طرح سے جذب نہ کر سکی، جس سے قوم اور تہذیب دونوں کو بہت سخت نقصان پہنچا اور ہمیں اس نقصان کی وجہ معلوم ہو جائے تو روسی تاریخ اور ادب کے سمجھنے میں بہت کچھ مدد ملے گی۔ جغرافیہ کے لحاظ سے روس ایشیا کا ایک ٹکڑا ہے، اگر اس کا بھی قطعی علم ہو جائے کہ روسی نسلیں زیادہ تر ایشیائی ہیں تو ادیب اور مورخ کی بہت سی مشکلیں آسان ہو جائیں گی اور ایشیائی نسلیں جو اس وقت روسی قوم کی طرح یورپ کی تقلید کر رہی ہیں، روس کی سرگزشت سے عبرت حاصل کر سکیں گی۔

شمالی روس کی آبادی تقریباً ساری فن نسل سے ہے۔ فن لینڈ کے باشندے بلحاظ صورت و سیرت چینیوں سے مشابہ ہیں، ان کا مذہب بھی گوتم بدھ کی تعلیم کا ایک چربا سا معلوم ہوتا ہے، گوہارے پاس اس کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں لیکن اغلب یہی ہے کہ یہ نسل چین یا منگولیا سے ہجرت کر کے شمالی یورپ تک پہنچی اور نسلوں کے اس سیلاب نے جو وسط ایشیا اور جرمنی سے ہر طرف بہ رہا تھا اس نسل کے ایک حصے کو فن لینڈ میں پناہ لینے پر مجبور کیا۔ دوسرا، جس کی تعداد کثیر تھی مغلوب ہو کر شمالی روس میں رہ گیا۔ وسط روس کی آبادی سلاو نسل سے ہے۔

سلاف نسل جس زمانے تک تحقیق سے دریافت ہو سکا ہے کوہ کارپتھین۔ کی مشرقی پنجاب اور موجودہ سربیا اور بلغیریا کے حدود میں دریائے ڈینیوب کے کنارے کنارے آباد پائی جاتی ہے۔ اس نسل کی ایک شاخ درمیانی روس کے مغربی اور جنوب مغربی حصے میں آباد ہوئی، جو "چھوٹے روس" کے نام سے مشہور ہے۔ اس نسل کے لوگ قد و قامت میں دوسری سلاف نسلوں سے چھوٹے ہوتے ہیں، اس وجہ سے یہ چھوٹے اور باقی بڑے کہلاتے ہیں۔ دریائے دون اور دنیپر کی وادیوں میں کو سک آباد ہیں، ایک نسل جو سلاف، تاتار اور غالباً کچھ اور ناپید نسلوں کے میل سے بنی ہے روس کا مشرقی اور جنوب مشرقی حصہ کوہ اورال سے بحر کیپین اور کوہ قاف تک زیادہ تر تاتار، باشکیر، کرگز اور دیگر ایشیائی نسلوں سے آباد ہے، جو ابھی تک اپنی پرانی وضع پر قائم ہیں: تاتاریوں میں سے کچھ عیسائی ہو کر سلاف نسل میں گھل مل گئے، جو مسلمان ہوئے اور جنہوں نے بعد میں یورپی تہذیب اختیار کرنے سے بھی انکار کیا وہ دوسری حقیر نسلوں کے ساتھ اقوام جرایم مشہ میں شمار ہوتے رہے۔ بحیثیت مجموعی روس میں سلاف نسل کی اکثریت ہے، اس لیے باوجود اپنے غیر محلول اجزا کے روسی قوم سلاف کہلاتی ہے۔

اس امر کا قطعی فیصلہ مشکل ہے کہ سلاف نسل یورپی ہے یا ایشیائی۔ عام طور سے ہم یہ دیکھتے ہیں کہ نسلیں وسط ایشیا کے سپاٹ میدانوں اور وادیوں کو چھوڑ کر لے روسی میں انہیں کزاک کہتے ہیں۔ لفظ قزاق اسی نام کی ایک اور شکل اور اس قوم کی ایک اور تعریف ہے۔

لے بولشوک نظام نے انہیں اب انسانیت کا رتبہ عطا کر دیا ہے۔

مغرب یا جنوب مغرب کی طرف رخ کرتی رہی ہیں اور جنوبی روس مہاجر نسلوں کی شاہ راہ رہا ہے، جن میں سے تمام مشرق سے مغرب کی طرف گئی ہیں۔ سلاو نسل کی ہجرت کے بارے میں تاریخی ثبوت کوئی نہیں، لیکن یہ فرض کر لینے کی بھی کوئی وجہ نہیں کہ یہ نسل عام قاعدے کے خلاف چلی۔ وسطی یورپ سے جن نسلوں نے جنوب یا مشرق کا رخ کیا ہے ان کا حال تاریخ میں ملتا ہے، لیکن سلاو نسل ان میں سے نہیں ہے اور اس کے علاوہ جرمن نسلوں کی ہجرت سلاو نسل کے جنوبی یورپ میں آباد ہونے کے بعد شروع ہوئی۔ یونانی مورخ ہیرودوٹس کا بیان ہے کہ اس کے زمانے میں وحشی نسلیں ایک دریا کے دھارے کی طرح وسط ایشیا سے بہتی ہوئی یونان اور ایران کی شہر سپاہوں سے آکر ٹکراتی تھیں۔ سلاو نسل کا ذکر ہیرودوٹس یا کسی اور قدیم مورخ کی تصانیف میں نہیں ملتا، لیکن غالباً وہ بھی اسی سیلاب کی ایک موج تھی جسے کوہ کارستھیں کی لعل میں اور دریائے ڈینیوب کے کنارے ٹھکانا ملا۔

چوتھی صدی عیسوی میں ایک یورپی نسل بحر بالٹک کی طرف سے آئی اور روس پر قابض ہو گئی۔ اس کا رہبر اور بادشاہ ہرمانرش تھا، اور یہ نسل جرمن تھی۔ ہرمانرش نے روس کو پہلی دفعہ ایک سلطنت بنایا، مگر یہ معلوم نہیں کہ جس نسل سے اس نے ملک چھینا وہ سلاو تھی یا کوئی اور۔ سلاو نسل ایک بارگی یا ایک ریٹے میں ملک پر قابض نہیں ہوئی اور اس کے شمال اور شمال مشرق کی طرف پھیل کر آباد ہونے کا حال جہاں تک ہمیں معلوم ہے وہ ہرمانرش کے بعد کا ہے۔ نویں دسویں اور گیارھویں صدیوں میں جب سلاو نسل روس پر بتدریج قابض ہو رہی تھی

یورپ کی طرف سے درباگ اور دوسری جرمن اور سکینڈی نیوین نسلوں کے حملے ہوئے اور روسی شرفا کا دعویٰ تھا کہ وہ یورپی ہیں اور انھیں نسلوں کی اولاد میں فاتح نسلوں کی طرح ان جرمن مہاجرین نے بھی زمین پر قبضہ کر لیا زمیندار بن گئے اور انھوں نے مغلوب سلاف نسل کی محنت کو اپنا ذریعہ معاش بنا لیا۔ اگر یہی صورت قائم رہتی تو یہ تسلیم کیا جاسکتا تھا کہ روس کے زاری عہد کے شرفا اور امراسب جرمن نسل سے ہیں، لیکن تیرھویں صدی عیسوی میں تاتاروں نے روس کو تہ و بالا کر دیا، کوئی شہر، کوئی شریف خاندان ان سے نہ بچ سکا، اور مشرقی روس میں انھوں نے دیہاتی آبادی تک کو نیست و نابود کر دیا۔ جس ملک میں تاتاروں نے قدم رکھا اس کے باشندوں میں تاتاری خون پہنچ گیا اور اگر روس میں کچھ ایسے خاندان بھی باقی رہ گئے جو تاتاروں کے بچوں سے جان بچانے گئے تو یہ مشکل سے ثابت کیا جاسکے گا کہ ان کی نسل میں تاتاری خون نہیں۔

شریف خاندانوں کے شجروں میں نقایص پیدا کرنے کے علاوہ تاتاری حملوں نے روس کو ایک اور نقصان پہنچایا۔ شہر کیف میں نویں صدی کے شروع سے عظمت کے آثار نمایاں ہو رہے تھے۔ پہلے اسے سلاف نسل نے چورفتہ رفتہ وادی و نیپر کے عرض و طول میں پھیل رہی تھی، اپنی ایک منزل بنائی اور چونکہ قسطنطنیہ کی شاہ راہ پر واقع تھا، اس لیے وہ بہت جلد تجارت کا مرکز بن گیا۔ اسی صدی میں جب وریاگ نسل نے روس اور شہر کیف پر قبضہ کیا تو کیف کی سیاسی حیثیت بھی بڑھ گئی، یہاں تک کہ ۱۰۲۵ء میں اس کے بادشاہ نے قسطنطنیہ پر بھی حملہ

کر دیا۔ لیکن تجارتی لحاظ سے کیف کے بادشاہ حکومت قسطنطنیہ اور ان اسلامی
 ممالک کی سرپرستی کے محتاج تھے جن کے راستے میں قسطنطنیہ واقع تھا۔ مسلمانوں کا
 اثر تو صرف اس قدر ہوا کہ روسی بول چال میں بہت سے فارسی اور عربی الفاظ رائج
 ہو گئے، قسطنطنیہ کے اثر سے کیف کے بادشاہوں اور روس کی تقریباً کل آبادی
 نے عیسائی مذہب قبول کر لیا، شاہ زادہ عظیم، دلاجمیر مولوناخ (۱۱۲۵ء) کے
 عہد میں روسی نسلیں عیسائی ہونے کی وجہ سے خود کو روشن ضمیر اور مہذب تصور کرنے
 لگی تھیں اور فی الواقعہ قسطنطنیہ کے رہبانوں اور اسلامی ممالک کے تاجروں نے
 روس کی وحشی فطرت میں تہذیب اور تمدن کے بیج بو دیے تھے۔ ان خانقاہوں
 میں جو باجیا قائم ہوئی تھیں چند روسی رہبانوں نے لکھنا پڑھنا سیکھا، مذہبی ضروریات
 نے روسی ابجد اور ابجد کے ساتھ باقاعدہ زبان کی تخلیق لازمی کر دی۔ چنانچہ اسی
 زمانے میں کلیسائی روسی زبان کی بنیاد پڑی۔ لیکن تہذیب کی یہ روشنی بجلی کی سی
 چمکتی تھی اور ملک کو ایسی تاریکی میں چھوڑ گئی جو پہلے کی جہالت سے بھی زیادہ ہولناک
 تھی۔ شاہ زادہ عظیم کی موت کے بعد ملک میں سیاسی انتشار پیدا ہو گیا اور گذشتہ عہد
 کی جو تھوڑی بہت یادگار باقی تھی، اُسے تاتاروں نے لوٹ کر برباد کر دیا۔ تاتاری
 حملوں کے بعد کئی سال تک وہ شہر جو شاہان کیف کے زمانے میں آباد اور
 خوش حال تھے راکھ کے انبار بنے رہے، شہری زندگی اور شہری تہذیب کے تمام
 آثار مٹ گئے۔ تاتاریوں کے کشت و خون نے ایشیا اور یورپ میں باہمی بر کے
 لہ اسے اسلات زبان بھی کہتے ہیں۔ انجیل کا ترجمہ اصل یونانی سے اسی زبان میں ہوا اور
 کلیسا میں بولشوک انقلاب تک یہی لارنج تھی۔

بیچ بودیے، عیسائی مذہب کے رہنماؤں نے حسب معمول فتنے کو بڑھایا اور روسی قوم کو تاتاریوں کے توسط سے تمام ایشیائی نسلوں سے ایسی گہری نفرت ہو گئی جس کا صدیوں تک اثر باقی رہا۔ اب ہمارے زمانے میں آخر کار پولشوک انقلاب نے اُس کے نقشِ دلوں سے مٹائے ہیں۔

محض نسل کے لحاظ سے روسی قوم کو بحیثیت مجموعی یورپی تصور کرنا غلط ہے۔ لیکن وہ ایشیا کے تمدنی مرکزوں سے دور اور یورپ سے نزدیک رہی ہے یا جیسے روسی خود کہتے ہیں، اُن کا منہ یورپ کی طرف ہے اور پیٹھ ایشیا کی طرف، اس لیے روسی ذہنیت پر یورپ ہی کا اثر رہا ہے۔ تاریخی واقعات اور یورپ کی تقلید نے اسے ایشیا کا دشمن بنا دیا، بااقتدار ریاست ہونے کے بعد اس نے ایشیائی اقوام سے وہی عداوت برتی جو شروع سے اس وقت تک یورپ کی قوموں کا معمول رہی ہے۔ روسی کسانوں پر یورپی تہذیب کا اثر کبھی نہیں ہوا مگر مذہبی تعصب نے انھیں یورپ ہی سے وابستہ، یا کم از کم ایشیائی نسلوں اور ایشیائی تمدن سے بیگانہ رکھا۔ ایشیائی سیرت پر یورپی تہذیب کی قلم لگانے سے روس یورپ اور ایشیا کی درمیانی کڑی بن گیا، اور اگر اس تعلق سے روس کو نقصان ہوا اور یورپ اور ایشیا کو مطلق فائدہ نہ پہنچا، اگر روس نے یورپی اور ایشیائی تہذیب کو ارادۂ یک جا کر کے اپنی خاص تہذیب تعمیر نہیں کی اور بنی نوع انسان میں باہمی مفاہمت کا ذریعہ نہیں بنا تو اس کا سبب اس کے رہنماؤں کی تنگ نظری تھی۔ لیکن پھر بھی روسی سیرت، تہذیب اور ادب میں ایشیائی عنصر موجود ہے، کہیں کہیں ایسی صورت میں بھی کہ ایشیا کے وطن پرستوں کو یوسف

گم گشتہ کی کہانی یاد آجائے۔

تاتاری حملوں کے بعد سے پندرھویں صدی کے وسط تک روس میں طوائف الملوکی رہی۔ ملک چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم تھا جو ایک دوسرے سے لڑتے تھے مگر کسی میں اتنی طاقت نہ تھی کہ فتح یا شکست سے کوئی خاص نتیجہ نکلے۔ قسمت ریاست مسکو وی کی، جو خاندان رومنوف کے قبضے میں تھی کسی قدر مددگار رہی اور وہ اپنے ہمسروں کے مقابلے میں پھیلتی اور مضبوط ہوتی رہی، یہاں تک کہ پندرھویں صدی کے وسط تک کوئی ایسی ریاست نہ تھی جو تنہا اس کا مقابلہ کر سکتی۔ ایک صدی کے بعد اوان چہارم (۱۵۲۳ - ۱۵۶۴) نے اس کے اقتدار کو اس قدر بڑھا دیا کہ وہ ملک پر حاوی ہو گئی اور بہت سی ریاستیں اس میں شامل ہو گئیں۔ اوان چہارم کے مظالم نے ملک میں بہت بے چینی پیدا کر دی اور اس کی موت پھر طوائف الملوکی کا باعث ہوئی، ریاست کا انتظام ابتر ہو گیا، جان و مال تک محفوظ نہ تھے اور گزشتہ بد نظمی کے مقابلے میں اگر اس وقت حالت کچھ بہتر معلوم ہوتی تو صرف اس لحاظ سے کہ اب روس ایک باقاعدہ ریاست بن گیا تھا، پہلے کی چھوٹی خود مختار ریاستیں غائب ہو گئی، تھیں اور بیسیوں ظالم بادشاہوں کی بجائے صرف ایک بادشاہ تھا۔ اگر اوان کو سلیقے کا وارث ملتا تو غالباً روس اسی صدی میں مہذب نہیں تو باوقار اور مضبوط ریاستوں میں شمار ہونے لگتا، لیکن اوان کے مرتے ہی فساد اور خانہ جنگیاں شروع ہو گئیں اور ملک کا نہ کوئی پرسان حال تھا نہ ہمدرو۔

۱۵ اس ریاست کا دارالسلطنت شہر مسکو (ماسکو) تھا۔

سوٹھویں صدی کے آخر تک کم و بیش یہی کیفیت رہی۔ اوان چہارم کے
 ہاتھ کا گراہوا عصا اور اس کی ناکام اُسیدوں کا ورثہ پیٹر اعظم کو ملا چاہئے مورث
 کی طرح خود سر، بے رحم اور بے باک تھا اور اتنا سنگ دل بھی کہ فساد اور بد نظمی کو جوہر
 سے اکھاڑنے کے لیے جتنا خون بہانا ضروری تھا وہ بہا سکے۔ اس کے علاوہ وہ بلند
 حوصلہ بھی تھا اور اس کے تخیل میں بھی وہی بہت تھی جو اس کے دل میں۔ اس نے
 یہ محسوس کیا کہ روس کو یورپ میں اقتدار حاصل کرنے کے لیے صرف اندرونی
 انتظامات درست کرنا اور فوج کی تعداد بڑھانا کافی نہیں تھا بلکہ انگلستان، جرمنی
 اور فرانس کا صنعت و حرفت میں ہم پلہ بننا بھی ضروری تھا۔ روس کی یہ حاجت
 پوری کرنے کے لیے اس نے خود ہالینڈ میں جا کر جہاز بنانا سیکھا اور روسیوں کو
 صنعت و حرفت میں کمال حاصل کرنے کی بہت ترغیب دلائی۔ روس کا قدیم
 دارالسلطنت ماسکو یورپ اور سمندر سے بہت دور تھا، پیٹرنے دریاے نیوا
 کے کنارے بحر بالٹک کے ساحل پر ایک نیا دارالسلطنت سینٹ پیٹرز برگ
 تعمیر کیا جو یورپ کے بڑے شہروں کی وضع پر تھا اور جس میں یہ دونوں صفتیں
 بھی موجود تھیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی پیٹر کو یقین ہو گیا تھا کہ روس کی ترقی
 صرف یورپ کی تقلید کرنے سے ہو سکتی ہے اور اُس نے روس کے سربراہ اور وہ
 طبقوں کو یورپی معاشرت اختیار کرنے پر مجبور کیا۔ کچھ مخالفت کے بعد جو خون
 کے دریاؤں میں بہا دی گئی، روسیوں نے پیٹر کے آگے سر تسلیم خم کر دیا۔ چند
 پشتوں کے بعد وہ اپنی پرانی وضع ایسی بھول گئے کہ اسے یاد کر کے انھیں خود
 تعجب ہوتا تھا اور اپنی نئی معاشرت کے ایسے فریفتہ ہو گئے کہ انھیں اپنی

گزشتہ زندگی اور اپنی تاریخ پر شرم آنے لگی۔ یورپ کی پیروی میں روسی ریاست نے عظمت اور اقتدار تو بہت کچھ حاصل کیا، لیکن اندھا دھند تقلید میں روسی قوم نے اپنی شخصیت گم کر دی، جو اُس کی روحانی اور اخلاقی زندگی کے لیے نہایت مہلک ثابت ہوا۔ اُس نے دنیا کی نعمتیں تو سب جمع کر لیں، لیکن دل کی وہ کیفیت ہو گئی کہ کسی بات میں مزہ نہ رہا۔

پیٹر نے روسی ادب کو ریاست کے زیر سایہ لے کر اُس کی نشوونما کے لیے راستہ صاف کر دیا، لیکن وہ زمانہ بھی بہت جلد آ گیا جب ریاست قوم کی ذہنی ترقی میں رُکاوٹیں ڈالنے لگی اور جیسے پیٹر نے روسی ذہنیت کو قدیم روسی فلسفہ زندگی سے پاک کرنے کے لیے خون کے دریا بہائے تھے، ویسے ہی ایک صدی بعد زاری حکومت نے آنا و خیالی کو موت کا خوف دلا کر اور اکثر موت کی سزا دے کر روکنا چاہا۔ روسی ذہنیت پر اس دارو گیر کا بہت گہرا اثر ہوا، اور اُس عہد کی اکثر تصانیف پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہذیان کی حالت میں لکھی گئی ہیں، یا مصنف کے تخیل نے دیوانگی اختیار کر لی ہے۔ تقریباً ہر مصنف کے دل کو معلوم ہوتا ہے کہ مایوسی ایک روگ کی طرح لگ گئی ہے۔ مگر اس کیفیت کا الگ اور مفصل ذکر لازم ہے۔

روسی ادب کو جو سمجھنا چاہتا ہوں اس سے پہلے روسی فطرت کی نرالی خصوصیتوں، روسی دل کی نادر کیفیتوں سے ضرور واقفیت پیدا کر لینا چاہیے۔ روسی ادب کا مورخ بھی اس پر مجبور ہے کہ اپنے پڑھنے والوں کو موضوع کی دشواریوں سے باخبر کر دے، اس لیے کہ روسی قوم کی طرح روسی ادب نے بھی باقاعدہ نشوونما

ہیں پامی، یعنی صحیح معنوں میں روسی ادب کی کوئی تاریخ نہیں۔ اُس کی صورت ایسے باغ کی نہیں ہے جس میں باغبان نے شوق اور نزاکت احساس سے ترتیب قائم کی ہو۔ وہ ایک خود رو جنگل ہے جس میں ہر پودا اور ہر پھول اپنی طبیعت کے زور سے اُگا ہے اور اپنی خوبیاں نمایاں کرنے کے لیے کسی غور پر داخت یا قدر دانی کا احسان مند نہیں۔ اس خود رو جنگل پر ایک سرسری نظر ممکن ہے کہیں نہ جھے یا بھارتیوں اور کانٹوں میں اُلجھ جائے، دیکھنے والے کو منظر کی سادگی اپنی طرف کھینچ نہ سکے اور وہ فطرت انسانی کی جلوہ افروزی کے دیدار کے لیے کسی اور طرف رُخ کر لے۔ روسی ادب کا مورخ اس جنگل میں آرائش کی رونق یا نظام پیدا کرنے کا دعویٰ نہیں کر سکتا، جو خود ادراک اور اشتیاق نہ رکھتا ہو اُسے اس جنگل کی سیر میں کوئی لطف نہیں آ سکتا، اس جنگل کا کوئی پھول اُس کے دل پر اپنا نقش قائم نہیں رکھ سکتا۔ سیرت کی دلفریبی اکثر صورت سے نہیں ظاہر ہوتی ہے، لیکن جسے حقیقت کی جستجو ہو اُسے ان ظاہری باتوں کے پھندے میں نہ پڑنا چاہیے اور یہ نہ بھولنا چاہیے کہ اُس کا مقصد تلاش کرنا اور پانا ہے، اعتراض کرنا اور بایوس ہو جانا نہیں۔ روسی ادب کی تاریخ صرف اسی اُمید پر لکھی جاسکتی ہے۔

روسی انقلاب کے کارناموں اور اس کے بعد ایک مکمل اشتراکی ریاست تعمیر کرنے کی پیہم اور بڑی حد تک کامیاب کوششوں نے روسی زندگی کا نقشہ راساً بدلا ہے کہ اب انقلاب سے پہلے کی ساری ادبی تصانیف اور ان کی حقیقت نگاری بھوٹ اور روسی قوم پر ایک صریحی تہمت معلوم ہوتی ہے، صرف ان لوگوں کو نہیں

جو انقلابی تحریک سے ہمدردی رکھتے ہیں بلکہ انہیں بھی جن تک صرف روس کے تنظیمی کارناموں کی شہرت پہنچ گئی ہو۔ روسی ادب کے مورخ کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ اس کا یا پلٹ کے اسباب بیان کرے، یا اس پر بحث کرے کہ جو کچھ ہم اپنے زمانے میں دیکھ رہے ہیں اس سے روسی طبیعت کا زیادہ صحیح اندازہ ہوتا ہے یا انقلاب سے پہلے کی حقیقت نگاری سے۔ اصل میں تو یہ معتمد زمانہ خود طے کرے گا۔ اس وقت اگر ہم یہ طے کر لیں کہ انقلاب سے پہلے کے ادیب اندھے یا جھوٹے تھے کہ روسی ادب کا مطالعہ نہ کرنا ہی بہتر ہے۔ لیکن اگر ہم کو یہ زیادتی اور بے انصافی معلوم ہو اور ہم روسی ادب کا بغیر کسی ذہنی تعصب کے مطالعہ کرنا چاہیں تو یہ ممکن ہے کہ ہم روس کی حیرت انگیز تبدیلی کو انسانی طبیعت کا ایک کرشمہ سمجھیں اور تاریخ اور موجودہ زندگی کا جوڑ ملا لیں۔ اس تہمید میں روسی طبیعت، خصوصاً انفرادیت اور اتحادِ عمل کے جذبے اور صلاحیت کی عدم موجودگی کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ انقلاب سے پہلے کی حالت کو مد نظر رکھ کر لکھا گیا اور اس بنا پر کہ روسی زندگی کا جس نے بھی مشاہدہ کیا، چاہے وہ ادیب ہو یا مورخ یا سیاح، اس حقیقت سے انکار نہیں کرتا۔

روسی مورخ کلیوچفسکی لکھتا ہے: "یورپ میں کوئی ایسی قوم نہیں جس کے افراد تھوڑی مدت تک اس جانفشانی اور تیزی سے کام کر سکیں جیسے کہ روسی کرتا ہے، مگر استقلال اور اندازے سے زیادہ عرصے تک محنت کرنے کی صلاحیت بھی کہیں اس قدر کیاب نہیں۔" روسی ادب کو نظام اور نشوونما سے محروم رکھنے کی سب سے زیادہ ذمہ دار قومی سیرت کی یہ خصوصیت ہے۔

ادب اور عام طور سے فنون لطیفہ میں اُن اصولوں کو بہت کم دخل ہے جن کے مطابق عمل کرنا عالم کا فرض ہے، لیکن روسیوں میں تلون مزاجی اور بقراری اس حد تک پہنچ گئی تھی کہ وہ کسی قسم کا ادبی معیار یا تنقید کے کوئی اصول تک مقرر نہیں کر سکے۔ روسی مذاق اس حیرت انگیز تیزی سے بدلتا رہا اور ہر نئے دور نے پچھلے دور کے ادبی دیوتاؤں اور بزرگوں کی یاد کو اس بے دلی سے مٹایا ہے کہ مورخ کے لیے کسی قسم کا سلسلہ قائم کرنا صرف ناممکن نہیں بلکہ غلط بھی ہو جاتا ہے۔ اگر مورخ اٹھارہویں صدی کا ادبی ذخیرہ جمع کرتا ہے اور اس کا مطالعہ کر کے انیسویں صدی کے ادب میں وہ خصوصیات تلاش کرتا ہے جن کی اسے پچھلی صدی کے کارناموں میں ایک جھلک سی نظر آئی ہے تو اسے سراسر مایوسی ہوتی ہے، انیسویں صدی کے مصنفوں نے بالکل الگ رنگ اختیار کیا اور جدت کے شوق میں انھوں نے گزشتہ دور کی آرزوؤں اور کوششوں کو بالکل بالائے طاق رکھ دیا، انیسویں صدی کے پہلے حصے کا طرز ہمیں اس کے آخری حصے میں نہیں ملتا، بیسویں صدی میں انقلاب سے قبل پھر ایک نیا دور شروع ہوا جس میں انیسویں صدی کے آخر کے اسلوب بالکل ترک کر دیے گئے اور روسی ادب کے آشنا اُسے اُس شکل میں بہ مشکل پہچان سکیں گے جو اُس نے انقلاب کے بعد اختیار کی ہے۔ اٹھارہویں صدی کے وسط سے جب ادبی جدوجہد کا آغاز ہوتا ہے، روسی زبان نے بھی کئی جنم لیے ہیں۔ پہلے یہ کوشش تھی کہ اُس کی خامیوں کی خانہ پری فرانسیسی زبان سے کی جائے، پھر جدت پسندی نے یہ عادت چھڑا کر اُسے خالص روسی بنانا چاہا۔ انیسویں صدی کے نصف

آخر میں یہ پابندی بھی اکھر نے لگی اور دستخسکی اور چنچوں نے وہ زبان اختیار کی جو معمولی گفتگو میں استعمال ہوتی تھی اور جس میں غیر زبانوں کے الفاظ کثرت سے اپنا لیے گئے تھے۔ انقلاب سے پہلے ادبی حلقوں پر پھر ایک جوش سوار ہوئی جس نے انھیں مشکل پسندی اور انوکھے پن کی طرف ایسا مائل کر دیا کہ انھوں نے معنی اور مطلب کو الفاظ پر اور الفاظ کو ندرت پر نثار کر دیا۔ انقلاب کے بعد کی زبان وہی سمجھ سکتا ہے جو روس کی دیہاتی بولیوں سے بچوبنی وقف ہو اور کچھ انقلاب کا سودا بھی سر میں رکھتا ہو۔

روسی خود رائے اور من چلا ہوتا ہے، اس لیے کہ جس فطری ماحول میں وہ زندگی بسر کرتا ہے، اس کی خاصیت تلون مزاجی ہے۔ روسی آب و ہوا اکثر انسان کی محکم سے محکم تدبیریں پلٹ دیتی ہے اور ادنیٰ سے ادنیٰ امید پوری نہیں ہونے دیتی۔ روسی ان دغا بازیوں کا عادی ہو گیا ہے اور باوجودیکہ اُس کی اپنی طبیعت احتیاط اور ہوشیاری کی طرف مائل ہے وہ اکثر اپنا سر ہلا کر ایسے ارادے کرتا ہے جن میں کامیابی کا سب سے کم امکان ہوتا ہے، ایسی تدبیریں سوچتا ہے جو بظاہر بالکل غلط ہوتی ہیں، اور یوں اپنے فطری ماحول کا منہ چڑھاتا ہے...
... پیٹ پالنے کے لیے اُسے فطرت اور آب و ہوا سے لڑنا پڑتا ہے، اُس کے کام کا تقاضا رہتا ہے کہ وہ جنگلوں اور ویرانوں میں اکیلا محنت کرنے وخت کاٹے یا ہل چلائے... وہ اپنی طبیعت کو سماجی تعلقات کے مطابق تربیت دینا نہیں سیکھ سکا، اُس کے جذبات سماجی فرائض کو مشکل سے تسلیم کرتے ہیں... اس لیے روسی تنہائی میں بہتر کام کر سکتا ہے، جب اُسے کوئی

دیکھ نہ رہا ہو، دوسروں کے ساتھ باہمی امداد کے اصولوں پر اسے عمل کرنے کی عادت نہیں اور خواہش بھی نہیں۔ وہ دل کی بات کہتے ہوئے گھبراتا ہی کسی کو اپنا راز داں بنانا نہیں چاہتا، ہر وقت چوکتا رہتا ہی، تنہائی اُسے ہر قسم کی صحبت سے زیادہ مرغوب ہوتی ہے، اپنے اوپر بیگانگی نظر میں دیکھ کر وہ اپنے ہنر چھپا لیتا ہی اور یوں صحبت میں اس کی بہت سی خوبیاں پوشیدہ رہتی ہیں“ (کلیو چفسکی: ”تاریخ روس“)

بیرونی اثرات اور ملک کی نشوونما نے اقتصادی حالت بہت بدلی ہے ”جنگلوں“ میں محنت کرنے پر روسی مجبور نہیں، دوسری نسلوں کے شمول نے روسی طبیعت اور نفسی کیفیات میں رنگارنگی پیدا کر دی ہے، مگر پھر بھی یہ قدیم سلاونی خصوصیات قوم کے بڑے حصے میں پائی جاتی ہیں اور روسی کسانوں میں اب تک ہو ہو موجود ہیں۔ آگے چل کر جب روسی ناول نویس ہمیں روسی زندگی کی تصویریں دکھائیں گے، تو ممکن ہی یہ خیال پیدا ہو کہ روسی فطرت کو ان چند خصوصیات پر محدود کرنا اُس کے حق میں نا انصافی ہے، مگر ہمیں کبھی انھیں بھولنا نہیں چاہیے، اس لیے کہ اگر یہ سطح پر نظر بھی نہ آئیں تو یہ ان کے معدوم ہونے کی کوئی دلیل نہیں اور اگر ہم نے ان کو ذہن نشین نہ کیا تو ہم روسی زندگی کے بہت سے معجزے حل نہ کر سکیں گے، ناولوں اور ڈراموں کے بہت سے کیرکٹرز ہمیں مصنوعی معلوم ہوں گے، جن فکروں میں وہ مبتلا ہیں ان کی اہمیت کا ہمیں احساس نہ ہوگا۔

یہی خصوصیات ہیں جن کی وجہ سے روسی ادب باقاعدہ نشوونما نہیں

پاسکا، انھیں نے اُس میں انفرادیت کا رنگ بھی گہرا کر دیا ہے۔ دوسری قوموں نے رفتہ رفتہ اپنے ادب کا ذخیرہ اکٹھا کیا ہے، اُن کا ادب ایک عمارت ہے جو اینٹ سے اینٹ جوڑ کر صدیوں میں تیار ہوئی، روسی ادب ایک طلسمی محل کی طرح حیرت انگیز تیزی سے وجود میں آگیا، اس کی ہستی محض جوہر ہی جوہر ہے اور اُس کا سارا سرمایہ چند عظیم الشان شخصیتیں، جن میں سے ہر ایک نے الگ رنگ اختیار کیا، جو ایک دوسری سے اور اپنی قومی تاریخ سے بالکل بے نیاز ہیں، دفعتاً نمودار ہوئیں اور دفعتاً ناپید ہو گئیں۔ کلیوچنکو نے روسی طبیعت کی جو تعریف کی ہے وہ دراصل بالکل صحیح ہے اور جس قدر ہم روسی ادب کی نرالی روش پر غور کرتے ہیں، اُس کے قول کی صداقت ظاہر ہوتی جاتی ہے: "خوش و خوشید و لے دولت مستعجل بود" روسی ادب کی کل تاریخ اس ایک مصرع میں بیان ہو جاتی ہے اور اسی وجہ سے کہ روسی طبیعت میں تیزی ہے، استقلال نہیں، روسی ادب کی بے نیازی اور جدت پسندی کو انتہائی شدت پر اسی انفرادیت کے ماوے نے پہنچایا ہے جو افراد کو تنہا اور سوسائٹی کے جوہر و احسان سے بے فکر اور بے خبر رکھتا ہے۔

انفرادیت کا لازمی نتیجہ انتشار ہوتا ہے۔ روسی ادب کی خوبیوں کو دیکھتے ہوئے ہم اس کی زیادہ شکایت تو نہیں کر سکتے، اس لیے کہ انفرادیت اور انتشار کے بغیر بہت ممکن ہے کہ یہ خوبیاں نمایاں نہ ہوتیں، لیکن روسی فطرت کی اس پھڑکتی ہوئی رگ نے کچھ خامیاں بھی پیدا کر دی ہیں، جن کا اعتراف کرنا انصاف کا تقاضا ہے۔ پہلا نقص بیان ہو چکا ہے، یعنی یہ کہ روسی ادب کی کوئی مجموعی شکل اور سلسل تاریخی نشوونما نہیں۔ تنقید کے لیے معیار مقرر ہونا اور کنار روسی ادب کی کوئی مستند اور

مفصل تاریخ نہیں لکھی گئی ہے۔ لٹیکن کے سوا روسی انشا پردازوں میں کوئی ایسی جامع شخصیت بھی نہیں ہوئی ہے جس کا ادبی حلقوں پر ایک نسل سے زیادہ اثر رہا ہو، اور لٹیکن کی بھی وہ حیثیت نہیں جو جرمنی میں گوٹے یا انگرنیری ادب میں ٹیکسیر کی ہے۔ اس کی تلافی انفرادی عظمت نے ایک حد تک ضرور کی ہے، لیکن روسی ادب اس اعتراض سے بری نہیں کیا جاسکتا کہ اس میں سلسلہ مرکزیت اور نظام نہیں۔ اس سلسلے میں ایک اور الزام بھی ہے، جس کا اقرار کرتے ہوئے زیادہ افسوس ہوتا ہے: تالستانی کی چند تصانیف کے علاوہ روسی ادب میں تشکیل زندگی کی کوئی کوشش نظر نہیں آتی اور انفرادی حیثیت سے بھی بہت کم ایسے مصنف ہیں جن کے حق میں دعویٰ کیا جاسکتا ہو کہ یہ حوصلہ ان کا محرک تھا۔ لٹیکن تو گنیف اور دستفسکی کی تصانیف میں کبھی کبھی اس کی ایک جھلک سی دکھائی دیتی ہے، لیکن اس پر حزن مایوسی اور تقدیر پرستی حاوی رہتی ہے، یا توجہ کسی اور سلسلے کی طرف منتقل کر دی جاتی ہے جس کی دلچسپی یا اخلاقی اہمیت کچھ بھی ہو اس سے تشکیل زندگی کا مقصد کسی طرح بھی نہیں پورا ہو سکتا۔ انگلستان میں ناول نویسی قوم کی اصلاح کے لیے ایجاد کی گئی تھی، اب بھی سنجیدہ ناول نویسوں سے یہ امید کی جاتی ہے کہ اگر وہ کسی خاص عقیدے یا تخیل کے مبلغ نہ ہوں، تب بھی قوم کے ان افراد کو جو ان کے زیر اثر ہیں، ایک فلسفہ زندگی تعمیر کرنے میں مدد دیں، قومی زندگی پر نکتہ چینی کریں، قوم کو اپنے دماغ اور دل اور ذہنیت کی اصلاح کرنے کی رغبت دلائیں یا کسی خاص معاملے میں اس کی ضرورت سمجھائیں۔ جرمن تہذیب میں محض گوٹے کی شخصیت نے ایک ذہنی انقلاب پیدا کر دیا، اور

اپنی قوم کے لیے جو رومی کلیسا سے قطع تعلق کر چکی تھی اور جس کی روحانی ضروریات اس کا اپنا کلیسا اور کلیسائی تعلیم نہیں پوری کر سکتی تھی، ایک مکمل فلسفہ زندگی فراہم کیا جو اب تک ایک مذہب کا کام دے رہا ہے۔ تشکیل زندگی کے لیے قومیت کا احساس لازم ہے اور اگر یہ احساس زیادہ شدید نہ ہو جائے تو اُس سے صرف ملک کی اندرونی زندگی میں ہم آہنگی نہیں پیدا ہو جاتی بلکہ قوم کو ذہنی اور روحانی نشوونما کی طرف رغبت دلانے کے لیے ایک محرک مل جاتا ہے اور افراد میں تخلیق اور تعمیر کی آرزو بھڑک اٹھتی ہے۔ اگر قومیت کا احساس نہ ہو یا ضروری نہ سمجھا جائے تب بھی انسانیت کا تقاضا ہے کہ مجموعی زندگی کا ایک مقررہ نصب العین ہو جسے حاصل کرنے کی سوسائٹی ہمیشہ کوشش کرتی رہے۔ مگر قومی نصب العین اُسی وقت قائم ہو سکتے ہیں جب قوم کے افراد انھیں اپنی انسانیت اور ترقی کی شرط سمجھیں اور انھیں یقین ہو کہ قوم میں مجھ ہونے سے اُن کے جذبات کو وہ تسکین حاصل ہو سکتی ہے جو انھیں اپنی آرزوئیں اپنی ذات تک محدود رکھنے سے نہیں مل سکتی۔ یورپ کی دوسری قوموں نے ذہنی انفرادیت یعنی فرد کی ذہنی آزادی، خود مختاری اور بے نیازی قربان کر کے ایک قومی شخصیت تعمیر کی ہے، ایک عظیم الشان ہستی جس میں انفرادیت کی تمام خصوصیات موجود ہیں، وہ اس قومی شخصیت کے کمال کو اپنا کمال سمجھتی ہیں، اُسی میں اُن کے مذہب، اخلاق جہانی اور روحانی زندگی کا سامان ہے۔ مگر روسی فطرت نہ تو اپنی انفرادیت کے ایشیا پر راضی ہو سکتی ہے، نہ یقین کر سکتی ہے کہ قوم کی شخصیت میں فرد کو کبھی فلاح حاصل ہوگی۔ قوم اور ملک اُس کے نزدیک انسان نے چند سیاسی اور

اقتصادی ضروریات پوری کرنے کے لیے ایجاد کیے ہیں۔ جب اُن کی اپنی کوئی ہستی نہیں تو وہ دوسروں کی ہستیاں کیا بنائیں یا سنواریں گے۔ چنانچہ روس میں باہمی زندگی نے کبھی صحیح معنوں میں ایک سوسائٹی کی صورت نہیں پائی، روسی قوم نے بحیثیت مجموعی کبھی ترقی کرنے کی جدوجہد نہیں کی اور کوئی سیاسی تحریک ایک نہایت محدود حلقے کے باہر اثر نہیں کر سکی۔ روس کے خوش حال طبقوں کو پیٹر اعظم نے یورپی طرز معاشرت اختیار کرنے پر مجبور کیا اور یوں اُن کے لیے یورپی تہذیب کے دروازے کھل گئے، اُنھیں اپنی انسانیت کو فرغ دینے کی کوئی خواہش نہیں تھی۔ روسی کسان انیسویں صدی میں جبراً آزاد کیے گئے، اُن کو اس طرح سے زمینداروں کے پنچے سے رہائی ملی، لیکن اُنھوں نے خود آزادی کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھی تھی، ہمیشہ سے دتیا کی ساری مصیبتیں خاموشی سے جھیلنے چلے آ رہے تھے اور اپنی اقتصادی حالت سے کبھی بے اطمینانی نہیں ظاہر کی۔ بولشوک انقلاب بھی کسی ایسی تحریک کا نتیجہ نہیں جس میں قوم کیا افراد کی بھی کثیر تعداد شریک ہوئی ہو یا اُس کے نصب العین سے ہمدردی رکھتی ہو۔ روس کی تاریخ میں سینکڑوں ایسے حوصلہ مند اور روشن ضمیر افراد ملیں گے جنھوں نے قوم کی بہبودی کے لیے کسی ایثار کو دشوار نہ سمجھا، کسی سزا کے خوف سے قدم پیچھے نہ ہٹایا۔ مگر قوم نے کبھی اُن کی تباہی اور بربادی پر افسوس نہ کیا، نہ اُن کے ایثار سے محظوظ ہوئی اور نہ کسی عملی صورت میں ہمدردی ظاہر کی، اس لیے کہ روسی ہر کوشش کی ناکامیابی فرض کر لیتے ہیں۔ روسی دماغ میں زندگی کے مسائل پر تنقید کرنے کے لیے

بہت سامان ہے، تخلیق اور تعمیر کے لیے کچھ بھی نہیں۔ روسی ادب روسی فطرت کا صحیح عکس ہے۔

لیکن روسی انشا پردازوں کی صفائی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ علاوہ ان کی اپنی طبیعتوں کے جو تخلیق کے مقابلے میں تنقید کی طرف زیادہ مائل تھیں اور علاوہ اُس انفرادیت کے جو روسیوں کو اس قدر عزیز ہے، کچھ تاریخی واقعات بھی ایسے ہوئے جنہوں نے تشکیل زندگی کی اسنگوں سے روسی ادب کو محروم رکھا۔ روسی قوم نے بحیثیت مجموعی ترقی نہیں کی، ماحول میں جو تغیر تبدیل دوسری قوموں میں تدریجی نشوونما نے پیدا کیا وہ روس میں انقلابوں کے ذریعے سے ظہور میں آیا۔ پہلا انقلاب، جو مہلک ثابت ہوا اُس وقت سے شروع ہوا جب پیٹر اعظم نے جبراً یورپی طرز معاشرت رائج کرایا۔ پیٹر اعظم کو انسانیت اور تہذیب کے گہرے مسائل سے کوئی واسطہ نہ تھا، نہ اپنی تحریک کے آخری نتائج کی پروا۔ روسی ریاست اور سربراہ اور وہ طبقوں کی تمام کوششوں سے نقل اور اصل کا فرق نہیں مٹ سکا، یورپی تہذیب روس میں بالکل سطحی رہی، اس لیے کہ روسیوں نے لباس اور طرز معاشرت بدل لیا، ان کی طبیعتیں وہی رہیں، دل وہی رہے۔ انہوں نے فرانسیسی اور جرمن زبانیں سیکھیں، اپنے آپ کو فخریہ طور پر یورپی کہنے لگے۔ اس سے زیادہ تغیر بیرونی دباؤ یا بادشاہ کا حکم نہیں پیدا کر سکتا تھا۔ اس تغیر کا سب سے اہم نتیجہ یہ ہوا کہ روسی قوم کا وہی طبقہ جو رہبری کر سکتا تھا، خود گم راہ ہو گیا، تقلید نے اُس میں خودداری اور قومیت کا احساس بالکل مٹا دیا، یہاں تک کہ وہ تمدنی اور تہذیبی سلسلہ قائم رکھنے کا

فرض بھی بھول گیا۔ ممکن ہو یہ تجربہ اس قدر مہلک نہ ثابت ہوتا اگر قوم کے ہر طبقے نے اس میں شرکت کی ہوتی۔ لیکن روس کی دیہاتی آبادی پیٹر اعظم کے ذہنی جبر و قہر کی زد سے باہر تھی، وہ اس انقلاب سے بے خبر اپنی پُرانی وضع پر قائم رہی اور رفتہ رفتہ جب یورپی تہذیب کے اثرات خوش حال شہری طبقوں میں سرایت کر گئے تو امیر اور غریب میں علاوہ اقتصادی فرق کے تہذیبی تضاد بھی پیدا ہو گیا، تعلیم یافتہ حلقے یورپ کی ترقی، یورپی زندگی کی بھرپور سے ایسے مرحوب ہو گئے کہ انھیں قوم کی حالت پر شرم آنے لگی، مگر وہ تعداد میں بہت کم تھے، ان کی اپنی روشنی ابھی تک بہت دھیمی تھی اور اگر وہ اس کی بہت بھی کرتے کہ قوم کے رہبر نہیں تو وہ تفرقہ جو تہذیب اور طرز معاشرت نے شہری اور غریب دیہاتی کے درمیان ڈال رکھا تھا انھیں ایک قدم آگے نہ بڑھنے دیتا۔ بے بسی میں وہ قوم سے نفرت کرنے لگے، اپنی قوم، اپنی قدیم تہذیب ان کی نظروں سے گر گئی، تعمیر اور تشکیل زندگی کی آمنگیوں نے مایوسی کے ایک ہمہ گیر فلسفے میں ڈبو دیں، ہر کوشش کی ناکامیابی پہلے سے فرض سے کر لی۔ وہ ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہے اور اچھی اور سطحی تقلید کی وبا پھیلتی رہی۔

انیسویں صدی کے شروع میں جب مغربی شراب کا نشہ کچھ اُترا اور روسینہ رومیوں کو اپنی تہذیبی تہی دستی کا پورا احساس ہوا تو خانہ سازی کی آمنگیوں نے پھر جوش کیا۔ تعلیم یافتہ اور خوش حال طبقوں کے لیے اب بھی موقع تھا کہ ملک کی ذہنیت درست کریں اور روسی قوم میں خودی اور شخصیت کا جذبہ پیدا کر کے اُسے بے معنی تقلید کے مہلک مرض سے بچائیں۔ لیکن یہ بیماری حد سے

گذر گئی تھی، اب صرف قوم کے مختلف اجزا کو ترتیب دینا نہیں تھا، بلکہ ایسی ریاست کا مقابلہ بھی کرنا تھا جو ان اجزا کو پریشان رکھنا چاہتی تھی اور ذہنی اور سیاسی بیداری کو اپنی موت کا پیش خیمہ سمجھتی تھی۔ روس کا محدود روشن خیال طبقہ بالکل اس ریاست کے قابو میں تھا، اور ۱۸۲۵ء کی ڈیکریسٹ بغاوت کے بعد اس نے یہ بھی دکھا دیا کہ اپنی حفاظت کے لیے وہ اس طبقے کو بیخ و بن سے اکھاڑنے پر تیار ہے۔ دوسری طرف قوم نے ایسی بے پردائی اور بیگانگی برتی کہ ایثار کی لذت جاتی رہی اور روشن خیال لوگوں کو عام طور سے دل ہی دل میں اپنی منگولوں کا گلا گھونٹ دینے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ ڈیکریسٹ بغاوت میں حاکموں کے ظلم اور قوم کی غفلت کا جو اندازہ ہوا وہ ایسا سبق تھا جسے حوصلہ مند قوم پرست کبھی نہیں بھولے۔ عمل اور تشکیل زندگی کے منصوبوں کو چھوڑ کر انھوں نے اپنے دلوں کو تحمل اور رضا کی تعلیم دی اور ان میں سیاسی جوش کو کبھی بڑھنے نہیں دیا۔ ذہنی نشوونما کے لیے انھوں نے اور راستے نکالے جو اس قدر خطرناک نہ تھے اور جن میں ہمت افزائی اور تسلی کے لیے قوم کی طرف امید کی نگاہیں اٹھانا ضروری نہ تھا، نہ اس کی غفلت اور بے پردائی سے شرمندہ ہونے کا اندیشہ۔ روسی قوم اپنی صحیح اور تاریخی شاہ راہ سے بھٹک گئی تھی، اُسے گمراہ کرنے کے لیے اس کے خمیر میں کافی مادہ موجود تھا۔ ہمیں اس کا افسوس تو ضرور ہے کہ تعلیم یافتہ طبقہ روسی قوم کی رہبری نہ کر سکا۔ لیکن روسی ادب اور انشا پردازوں پر زندگی سے بے تعلقی کا الزام لگاتے ہوئے تاریخی واقعات اور انسانی مجبور یوں کو نہ بھولنا چاہیے۔

روشن خیال روسیوں نے اگر تخلیق اور تعمیر کی تمنائیں دل سے نکال دیں تو
 انہوں نے اس کا خیارہ بھی بھگتا۔ انسان کو عام زندگی سے وابستہ اس کی آرزوئیں
 رکھتی ہیں اور اس کی فطرت کا تقاضا ہے کہ وہ آرزو کرے اور اپنی زندگی کو اپنے ماحول
 سے وابستہ رکھے جو شخص روحانی تنہائی اختیار کرتا ہے اور اسے اپنی روحانی ضروریات
 اور فرائض سے رہائی نہیں ملتی، بلکہ وہ قوت جسے سماجی فرائض کی ادائیگی میں
 صرف کرنا اس کی فطرت کا تقاضا ہے اور کیفیتیں پیدا کرتی ہے جو اس کے لیے ایک
 مصیبت ہو جاتی ہیں۔ روسی کو اپنی ذات کا احساس بہت ہے، فطرتاً تنہائی
 پسند ہونے کی وجہ سے وہ ان روحانی تکلیفوں کو بخوبی برداشت کر سکتا ہے جو
 تنہائی کی شدت کا لازمی نتیجہ ہیں۔ لیکن تنہائی کی شدت نے اس کی طبیعت کی
 ہم آہنگی اور توازن میں فرق ضرور ڈالا ہے، جو اس کے لیے کسی طرح سے فائدہ مند
 نہیں ثابت ہوا۔ انسان کو اپنی ذات کا احساس ضرور ہونا چاہئے لیکن اگر یہ
 احساس اسے عملی زندگی کی طرف مائل نہ کرے، یا عملی زندگی میں اس کی مدد
 نہ کرے تو وہ طبیعت کی خامی یا ذہن کی بیماری ہے، محض قوت مشاہدہ کی
 معجز نگاری نہیں۔ روسی ذہنیت میں اس بیماری نے بہت خطرناک صورت
 اختیار کر لی تھی اور جس اخلاقی اور سیاسی سستی سے ملک کو بولاشوک انقلاب نے
 نجات دلائی وہ سب سے زیادہ اسی ذہنی مرض کا نتیجہ تھی۔ روسی انشا پر دازوں
 نے اس خصوصیت کو بہت خوبی اور سچائی سے ظاہر کیا ہے، لیکن کبھی کبھی ان
 کی حقیقت نگاری بھی کھلنے لگتی ہے۔ جو بیان روسی طبیعت کے لیے صحیح ہے اور
 روسیوں کو اپنی فطرت کی حقیقی تصویر دکھاتا ہے، وہ ہمیشہ ان طبیعتوں کے

متعلق صحیح اور حقیقت نما نہیں ہو سکتا، جنہوں نے مختلف ماحول میں تربیت اور نشوونما پائی ہے، یا جن کی اقتاد اور ہی، اور انسانی فطرت کے بھید بوجھنے والوں پر لازم ہے کہ وہ اپنے ماحول کے محدود دائرے سے گزر کر تمام نئی نوع انسان کو اپنا مخاطب اور اپنا موضوع بنائیں۔ اس نقطہ نظر سے تقریباً تمام روسی انشا پردازوں پر کسی نہ کسی حد تک یہ اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ انہوں نے انسان کی صحت سے زیادہ اس کی بیماریوں کی طرف توجہ کی ہے، ان کی نگاہ کا رجحان انسانی پستی کی طرف ہے، بلندی کی طرف نہیں، یعنی انہیں پڑھ کر ہم اس پستی سے زیادہ واقف ہو جاتے ہیں جس میں نادانی اور قسمت کی خرابی انسان کو گرفتار کر سکتی ہے بہ نسبت اس بلندی کے جس پر اس کی فطرت کی پوشیدہ قوتیں اسے پہنچا سکتی ہیں، اور حقیقت میں اگر انسان پست بھی ہے تو اس کا بلندی اور بزرگی حاصل کرنا حقیقت سے بعید نہیں۔ مگر یہ ضرور ہے کہ جن مصنفوں نے پستی کے غار کو سب سے زیادہ تاریک دکھایا ہے اور اس کی سیر کے لیے ان کا ذوق جفا کشی بڑی کثرت سے اور بڑے انہماک کے ساتھ انہیں لے جاتا ہے وہ بلندی کے خواب بھی اکثر دیکھتے ہیں اور ان خوابوں میں اصلیت اور یقین کی ایسی تاثیر ہوتی ہے جو اعتدال پسند مصنفوں کے امکان اور تصور سے باہر اور برتر ہوتی ہے۔ مثلاً ذہن اور دل کی بیماریاں مایوسی اور سبکی کی وہ فضا جس میں معلوم ہوتا ہے کہ دستفشی کا تصور ایک زخمی پرندے کی طرح پھڑپھڑا رہا ہو دراصل امید اور کامیابی اور فلک پیا بلند پردازی کی تمہید ہے، یہ ایک ایسی منزل ہے جس سے گزرنا ہر

ذی حس انسان کے لیے لازم ہے اور جس سے گزر کر ہم انسانیت کا جلوہ دیکھ سکتے ہیں، اس جلوے کا عکس ہمارے دلوں میں محفوظ رہ سکتا ہے، اور اگر ہم چاہیں تو انسانی زندگی کو اس سے روشن بھی کر سکتے ہیں۔ میکسم گورکی جن مفلس، مصیبت زدہ اور بدچلن روسیوں کا ہم سے تعارف کرتا ہے ان کی فطرت غربت اور بُری عادتوں کی زنجیروں میں ایسی بُری طرح جکڑی ہوئی ہے ان کے دلوں کو بُرے اعمال اور اراہوں نے ایسا سیاہ کر رکھا ہے، ان کے ماحول میں راہِ راست پر چلنے کی ترغیب دلانے والے اثرات اتنے کم اور کمزور ہیں کہ ہمیں ان کے انسان ہونے کی یاد نہ رہنے پر تعجب ہوتا ہے، لیکن انسانیت کی اس عبرت انگیز بربادی میں بھی ایک روشنی کبھی کبھی نظر آ جاتی ہے جس پر ہم اگر اپنی نظر قائم رکھ سکیں تو گورکی کے تمام دیرانے آباد معلوم ہونے لگتے ہیں، اس کے بیماروں میں صحت کے وہ آثار مردوں میں زندگی کی وہ علامات ظاہر ہونے لگتی ہیں جو ہم کو یقین دلادیتی ہیں کہ انسانیت کا جوہر کبھی گم نہیں ہو سکتا، اس کے دشمن اسے چاہے جتنا چھپائیں وہ ہماری نظروں سے بالکل غائب نہیں ہو سکتا اور جب کبھی وہ نظر آئے گا تو اس شان سے کہ ہم صرف دوسروں کی نہیں بلکہ اپنی زندگی بھی اس سے روشن پائیں گے۔ گورکی نے انسانیت کا جوہر دریافت کیا ہے، وہ انسانی ہمدردی ہے، ایک جذبہ جو سبت حیوانی زندگی کی تاریکی کو اسی طرح سے ریزہ ریزہ کر دیتا ہے جیسے بجلی کالی گھٹاؤں کے اندھیرے کو۔

روسی ادب دراصل محض مایوس اور حزن کا ترانہ نہیں، جیسا کہ اس کے

چند نقادوں کا دعویٰ ہے، مگر روسی انشا پردازوں نے زندگی کو زیادہ شوخ رنگوں میں دکھا کر اکثر خود اپنی امیدوں پر پردہ ڈال دیا ہے۔ وہ ہمارے دلوں میں وہ کیفیت پیدا کرنا چاہتے ہیں جو ان کے دلوں پر گزر چکی ہو اور اس کا مطلق لحاظ نہیں رکھتے کہ ہم یہ بار برداشت کر سکتے ہیں یا نہیں، وہ ہمیں دوزخ کی سیر کراتے ہیں اور بجز جنت کا راستہ بتائے ہوئے ہمارا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔ اس طرز عمل سے شکایت زیادہ تر ان لوگوں کو ہونے کے خیال میں ادبی تصنیفات کا اصل مقصد دلچسپ ہونا جذبات میں گدگدی پیدا کرنا اور حیب فرصت یا بیکاری کا وقت ختم ہو جائے تو یاد سے محو ہو جانا ہے۔ سنجیدہ ناول نویسوں کا نصب العین کبھی اور کہیں بھی ایسا حقیر نہیں ہوا ہے کہ وہ اس مذاق کا لحاظ کریں، لیکن روسی انشا پرداز اکثر ایک قدم آگے بڑھ گئے ہیں اور ناولوں اور افسانوں سے حتی الامکان خالص دلچسپی کا عنصر بالکل نکال دیا ہے۔ روسی ناول وغیرہ عبرت اور تعلیم کا ذریعہ ہیں، صرف اس عبرت کا نہیں جو ہمارے سامنے دوسروں کی حماقتیں ایک غیبی تنبیہ کی شکل میں پیش کرتی ہے، بلکہ اس عبرت کا جو ہمارے دلوں کو انسانی ہمدردی کی جواں گاہ، محبت اور ایثار کا سرچشمہ بننے کا حوصلہ دلاتی ہے وہ تعلیم کا ذریعہ ہیں مگر اس تعلیم کا نہیں جو ہمیں "آسائش دو گیتی" حاصل کرنے کی ترکیبیں سکھاتی ہے، بلکہ اس تعلیم کا جو دل کو خود غرضی اور ذاتی کامیابی کی ذلیل خواہشوں کے پنجے سے رہا کر کے زندگی اور جذبات کا مرکز بناتی ہے، اس میں اتنی ہمت پیدا کرتی ہے کہ وہ "روح" کو نفس پر ترجیح دے سکے اور اپنے سکون اور آسودگی کو ہمیشہ

قربان کرنے پر تیار رہے۔ بہترین روسی ناولوں کا مقصد زندگی کی صحیح اور سچی تصویر پیش کرنا ہی، جن میں ایک صحیح اور سچا فلسفہ بھی مضمر ہو، جن سے ذہن میں وسعت دل میں درد اخلاق میں محبت اور ہمدردی پیدا ہو۔ اس بلند حوصلے کے ساتھ ناممکن تھا کہ وہ ہر بوا لہوس اور زندگی کی مشکلات کا مقابلہ کرنے کے ہر حوصلہ مند خدائی فوجدار کے مذاق کو اپنا معیار بنائیں اور محض لطف اور دلچسپی یا سوسائٹی کے خیالی لڑائیوں کا سامان ہیا کریں۔

روسی ادب میں تشکیل زندگی کی کوششیں بہت نایاب ہیں، لیکن بحیثیت مجموعی ایک فلسفہ زندگی اور فلسفہ کائنات ضرور ہے جو بالکل نرالا، بہت معین اور بہت با اثر ہے۔ اگر ہم اسے اپنے یا کسی اور قوم کے معیار سے جانچیں تو ہر طرف مبالغہ، کج طبعی، خود بینی اور جہاں فراموشی کا گمان ہوتا ہے۔ انفرادیت اور اس سے زیادہ ذات کا مشاہدہ اور ذاتی نفسی مسائل میں غرق رہنا ایک خبط سا معلوم ہوتا ہے جس سے کوئی طبیعت (جو زیر بحث ہو) پاک نظر نہیں آتی۔ لیکن اگر ہم زیادہ غور کریں تو ہمیں یقین ہو جائے گا کہ یہ کوئی دیدہ و دانستہ کج روی نہیں ہے، نہ جدت پسندی جو حد سے اس قدر تجاوز کر گئی ہے کہ مہمل یا ناگوار ہو جائے۔ روسی انشا پردازوں کا نصب العین انسان اور انسان کی ہستی کو کائنات میں ایک نیا درجہ، نئی اہمیت دینا، خالق اور مخلوق میں ایسی آشنائی اور بے حجابی کی رسم قائم کرنا ہے کہ کسی توسط کی حاجت نہ رہے۔ انسان کی موجودہ بے کسی اور روحانی بے مانگی دیکھتے ہوئے یہ تمنا کرنا بہت کا کام ہے۔ اگر روسی انشا پرداز اپنی کوششوں میں کامیاب ہوئے ہوتے تو وہ "اہل کتاب" ہونے کا دعویٰ کر سکتے

تھے۔ وہ ناکامیاب رہے، لیکن انسانیت کی تعمیر صرف کامیاب روحانی اور اخلاقی تجربوں پر نہیں ہوتی۔ عظمت صرف انھیں کا حصہ نہیں اور نہیں ہونا چاہیے جو اپنی تمنائیں پوری کر لیتے ہیں، اس لیے کہ تجربہ ہمیں بتاتا ہے کہ کامیابی تمنائوں اور آرزوں کو محدود کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔ ہم اگر صرف کامیابی ہی کے قائل ہوں تب بھی ان حوصلوں کی داد دینا ہمارا فرض ہے جنہوں نے بلند پروازی کا بیڑا اٹھایا اور ناکامیابی یا شکست کی پروا نہ کی۔

انسان جب کوئی مشکل ارادہ کرے تو اسے چاہیے کہ اپنی قوت اور امکان کا صحیح اندازہ کرے۔ روسی انفرادیت، خودی کا مشاہدہ، ذات سے گہری وابستگی دراصل انسان اور انسانیت کی ایک سخت آزمائش ہے اور اس آزمائش کی کل لوازمات پوری کرنے کے لیے روسی نظر نے اپنی تحلیل میں انسانی ہستی کے کسی پہلو انسانی فطرت کے کسی راز کو نہیں چھوڑا ہے۔ جستجو کے سلسلے میں بہت سی ناگوار باتیں دریافت ہوئیں جن کے اعلان کرنے میں روسی انشا پردازوں نے مطلق تکلف نہیں کیا ہے، بغیر اس کا خیال کیے ہوئے کہ دنیا کیا کہے گی اور کیا سمجھے گی، بہت سے راز فاش کر دیے جنہیں چھپانا ابھی تک ہر جگہ کا معمول تھا۔ ان پوشیدہ رازوں کے معلوم کرنے سے ہم اپنی فطرت کی اندرونی کیفیات بہت بہتر سمجھ سکتے ہیں اور کیر کٹر اور اخلاق اور اعمال کے پیچیدہ معمے بہت آسانی سے حل ہو جاتے ہیں۔ روسی طبیعت میں جتنا ذوق جستجو سرگرم ہے اسی قدر خامیوں اور خرابیوں کا اعتراف کرنے کی مہمت بلند اور اسی وجہ سے روسی انشا پردازوں کی صاف گوئی پر ہم کو اکثر تعجب ہوتا ہے اور اس سے کبھی کبھی تکلیف

بھی ہوتی ہے۔ یہ تکلیف اور معنی و مطلب سمجھنے کی دشواریاں جو اکثر روسی ادب کے مطالعے میں پیش آتی ہیں، ہمیں خوشی سے برداشت کرنا چاہئیں۔ ان کی بنا محض طرز اور اسلوب اور تخیل کی حدت پسندی نہیں، ان سے ہم کو وہ ذہنی تجربہ اور دل کی وسعت حاصل ہوتی ہے جو انسانیت کا طغرائے امتیاز ہے۔ اگر ہم اس نیت سے روسی ادب کا مطالعہ کریں کہ اپنی انسانیت کو فروغ دیں تو اس کی غفلت کا ہم کو صحیح اندازہ ہوگا اور اس کے جوہر پر کھنے کی ہم میں صلاحیت بھی بہت زیادہ ہو جائے گی۔

پہلا باب

ادب العوام

ہر ادب میں دو عنصر ہوتے ہیں، ایک فطری یا طبعی اور دوسرا اکتسابی اور اس کی نشوونما اس پر منحصر ہوتی ہے کہ یہ دونوں عنصر ایک دوسرے سے کس حد تک ہم آہنگی رکھتے ہیں۔ اکتسابی عنصر وہ ہے جو ہر نئی نسل کو ورثے میں ملتا ہے، جس میں اسلوب اور مذاق کی تمام خوبیاں ہوتی ہیں، لیکن عموماً تصنع اور قواعد کی پابندی اس حد تک پہنچ جاتی ہے کہ سچے جذبات ظاہر کرنے کی گنجائش کم ہو جاتی ہے۔ فطری عنصر قوم یا نسل یا ان دونوں کے رنگ میں رنگے ہوئے انفرادی جذبات ہوتے ہیں، جو اسلوب اور قواعد سے بے نیاز اور تنقید سے بے خون سیدھے دل سے زبان کا راستہ لیتے ہیں۔ انہیں ہم چاہیں تو کائنات کی پوشیدہ قوت سمجھ سکتے ہیں، یا فطرت انسانی کے وہ معے جن کا حل کرنا ہمارے امکان سے بالکل باہر ہے، ادبی لحاظ سے ان کی خصوصیت جوش اور سچائی، سادگی اور صاف گوئی ہوتی ہے جو ان میں کسی قسم کا تصنع اور آوروں شامل نہیں ہونے دیتی۔ ادبی نشوونما ان فطری جذبات کا وہ اسلوب مذاق اور معیار قبول کرنا ہے جو تاریخی سلسلے میں ایک نسل کو

دوسری سے ملتے ہیں۔ یورپ میں ادب کا ورثہ یونان سے روما کو ملا اور ان دونوں سے جدید یورپی قوموں کو۔ ایشیا میں بھی اسی طرح ادبی اسلوب، قواعد اور معیار ایک نسل سے دوسری کو ملتے رہے ہیں اور ہر نسل نے اپنی استعداد اور فطرت کے مطابق ان میں ترمیم اور اضافہ کیا ہے۔ مگر کبھی کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ اکتسابی عنصر کی قلم فطری عنصر پر نہیں لگ سکی اور اس کی نشوونما رگ گئی یا نہایت محدود اور مصنوعی رہی۔ اس ناکامی کی دو مثالیں ہیں، ہندوستان اور روس۔ ہندوستان میں مسلمان ایران سے ایک ایسے ادب کے اسلوب اور معیار لے کر آئے تھے جو اپنی اصل سرزمین میں مزید نشوونما کی طاقت نہیں رکھتا تھا اور اس میں تخلیق کی گنجائش پیدا کرنے کے لیے لازم تھا کہ اس کی قلم کسی اور ملک میں کسی اور قوم کے فطری جذبات پر لگائی جائے۔ ہندوستان میں تعصب اور ذہنیت کی تنگی نے اس ادبی کرشمے کو تکمیل سے محروم رکھا، فارسی اور ہندی چند روزہ دوستی کے بعد ایک دوسرے سے جدا ہو گئیں اور جب ہماری اردو زبان رائج ہوئی تو ایسا انحطاط کا زمانہ تھا کہ جذبات کا دیرینہ اور مردہ اسلوب سے آزادی حاصل کرنا یا ان کی رہبری میں اپنی تخلیقی قوت کا ثبوت دینا بالکل ناممکن تھا۔ یہی روس میں بھی ہوا۔ روسی طبیعت نہایت درجہ موجد اور تصورات اور جذبات سے لبریز ہے، یورپ کے زیر اثر ہونے سے بہت پہلے وہاں عوام نے گیتوں، قصے، کہانیوں، پھیلیوں اور داستانوں کا کافی ذخیرہ جمع کر لیا تھا، جس کی بذاتِ خود ممکن ہے کوئی بلند ادبی حیثیت نہ ہو، لیکن مذاق سلیم اس بنیاد پر ایک عظیم الشان ادب تعمیر کر سکتا تھا۔ مگر روس میں فطری اور اکتسابی عنصر جدا رہے، جس کی وجہ سے انفرادیت

بے قابو ہو گئی اور ادب کی نشوونما معینہ اسالیب کے ماتحت نہ ہو سکی۔ افراد کے ذاتی جذبات اور ان کے نرے انداز کو قوم کے عام نسلی جذبات اور ذہنیت میں تربیت پانا چاہیے تھا، مگر تقلید یورپ کی جو تحریک پیٹر اعظم کے اثر سے شروع ہوئی اس نے تعلیم یافتہ اور مہذب لوگوں کو قومی (اور فطری) ماحول سے نکال کر ایک مصنوعی دنیا میں پہنچا دیا جس میں دکھاوا تو بہت تھا لیکن روح کی تسلی اور جذبات کی تسکین کے لیے کوئی سامان نہ تھا۔ اسلوب اور معیار، چاہے وہ جس قدر بلند ہوں، دراصل مردہ قواعد ہیں، جن میں انسانی جذبات جان پھونکتے ہیں۔ جب پیٹر اعظم کے عہد میں روسی ادب کی بنیاد ڈالی گئی تو ان جذبات کا بہت کم خیال رکھا گیا اور ادب العوام سے ایسی بے تعلقی برتی گئی کہ اس پر قلم لگانا یا اسے نئے ادب کی بنیاد قرار دینا تو درکنار، اسے بالکل صغہ ہستی سے مٹا دینے کی تدبیریں کی گئیں۔ فرانسیسی ادب کا مطالعہ اور اس کی کامیاب نقل — نئے روسی ادب کی قسمت میں معلوم ہوتا تھا یہی لکھا ہوا اور اس فرضی بد قسمتی کو ایک پُر درد حقیقت بنانے کے لیے روسی عوام کی ادبی جنس کا کوئی خریدار بازار میں نہیں چھوڑا گیا۔ جب خریدار پیدا ہوئے تو یہ جنس بد مذاقی اور بے پروائی کے صفات سے بھری ہو چکی تھی اور عوام میں تخلیقی مادہ بھی باقی نہیں رہا تھا۔ برخلاف اس کے اگر ہم انگلستان یا جرمنی کی ادبی تاریخ کا مطالعہ کریں تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ کب اور کس طرح ان قوموں نے ان اسالیب کو جو انھیں ورثے میں ملے تھے قبول کیا اور انھیں قبول کرنے سے اپنی شخصیت نہیں گنوائی، بلکہ اس کی نشوونما کے لیے ایک نیا راستہ نکالا۔ یورپ میں قرون وسطیٰ

کی تہذیبی زبان لاطینی تھی، لیکن لاطینی ایک غیر اور مردہ زبان تھی اور کسی زندہ قوم کی ادبی زبان بننے کی طاقت نہیں رکھتی تھی۔ انگلستان اور جرمنی میں اس کی کوشش بھی نہیں کی گئی کہ اُس سے یہ کام لیا جائے۔ انگلستان میں چوسٹون نے کینٹربری کی کہانیاں لکھ کر اور ٹینڈیل اور ویکلف نے انجیل کا یونانی سے انگریزی میں ترجمہ کر کے انگریزی ادب کا بیج بویا۔ مگر ان سب نے لاطینی کے اسلوب قبول کیے اور اپنی تحریر کو حتی الامکان اُسی کا پابند رکھا۔ جب سولہویں صدی میں یونان اور روما کے دیوتا پھر جاگے اور اُن کے حسن نے یورپ کے دل اور دماغ کو فریفتہ اور مخمور کر دیا تب تک انگلستان اور جرمنی نے اپنی ادبی شخصیت تعمیر کر لی تھی اور اُن کی اس دور کی بے خودی نے اُن کی خودی کو اور محکم کر دیا۔ انگلستان میں سولہویں صدی کے آخری حصے کا فروغ یونانی ادب کا ایک شوخ اور روشن عکس تھا، جرمنی میں یونان کا اثر اس قدر جلد محسوس نہیں ہوا، لیکن جس وقت سے مارٹن لوتر نے انجیل کا جرمن زبان میں ترجمہ کیا، جرمنی میں ادب کی نشوونما ہونے لگی اور جرمن ادب یونانی تہذیب کا اگر زیر بار احسان ہو تو بھی اُس نے تقلید میں اپنی شخصیت ہرگز نہیں کھوئی۔ یورپ کے ہر ملک میں قومی فطرت کے کاشتکار نے یونانی اسلوب سے کھاؤ کا کام لیا اور اُس سے اپنی سرزمین کی پیداوار میں گونا گوں اضافہ کیا۔ محض کھاؤ پر کاشت کرنے کا تجربہ صرف روس میں کیا گیا، اس لیے کہ وہاں کی سرزمین ناقص سمجھی گئی۔ اسی وجہ سے روسی ادب کی نشوونما بے ڈھنگی ہوئی اور وہی دھوپ چھاؤں بارش اور بادل جو دوسرے ملکوں میں زندگی کا سرمایہ ہیں روس

میں مہلک ثابت ہوئے۔

فطری جذبات کی شان یہی ہے کہ وہ اپنی قوت سے ظہور میں آئیں اور مہذب انسان اس طرز کو جس میں اُس کے فطری جذبات شروع شروع میں ظاہر ہوتے ہیں بھونڈا اور اکثر لغو سمجھنے لگتا ہے، لیکن وہ اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ اس طرز میں ایک سادگی اور بے ساختہ پن ہوتا ہے جو تہذیب اور ذہنی نشوونما کے ساتھ غائب ہو جاتا ہے اور اگر وہ کبھی اپنی ذہنیت کو غرور اور تعصب سے پاک کر دیتا ہے تو یہی سادگی اور بے ساختہ پن اس کے جذبات میں وہ بے قراری پیدا کر دیتا ہے جو مہذب فنون لطیفہ کے امکان سے باہر ہے ہمیں روسی گیت پڑھ کر لطف نہیں آتا، بلکہ اُس قوم کے تصور کی بے مانگی پر حیرت ہوتی ہے، لیکن اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہم روسی ماحول اور سرزمین کے تاثرات سے دور اور بیگانہ ہیں اور عوام کے گیتوں کو ماحول اور سرزمین سے ایک خاص وابستگی ہوتی ہے، جس سے مہذب شاعری بالکل بے نیاز ہے۔ اس کے برعکس اگر ہم روسی قصے سنیں، خصوصاً وہ جن کا مقصد اخلاقی تعلیم ہے تو ہمیں ان میں ایک ایسا گہرا اور سچا فلسفہ نظر آئے گا کہ ہم خود اپنی اخلاقی بے مانگی اور تہی دستی پراخوس کریں گے۔ فنون لطیفہ میں عوام کا مذاق ہمارے جی کو نہیں بھاتا، لیکن یہ مذاق بھی قومی شخصیت کا ایک پہلو ہے، اگرچہ وہ اس قدر عالم گیر نہیں ہوتا جیسے ان کی اخلاقی تعلیم یا اُن کا فلسفہ۔

روسی گیت:

شاعری سے پہلے خود مذہب کو اس کا احساس ہوتا ہے کہ "مسجد کے

ذیر سایہ خرابات چاہیے“ اور بعد کو چاہے وہ ایک دوسرے سے عداوت ہی کیوں نہ برتیں، فنون لطیفہ کی پرورش شروع میں مذہب ہی کے زیر سایہ ہوتی ہے۔ روسی گیتوں کی بڑی تعداد ایسی ہے جس کی تصنیف کا اصل مقصد مذہبی رسموں کو دلچسپ بنانا تھا۔ لیکن یہ ایک خاص دور کی پیداوار ہے اور اس کے بعد ہی بہت جلد وہ گیت بھی وجود میں آگئے جنہیں مذہب اور رسوم سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ انہیں کو شاعری کی بنیاد سمجھنا چاہیے۔

مذہبی رسموں کے گیت اُس زمانے سے چلے آ رہے ہیں جب روسی عیسائی نہیں ہوتے تھے اور جاڑے، گرمی، پالے، جنگل، سورج، چاند وغیرہ کی مختلف ناموں سے پرستش کیا کرتے تھے۔ ایسے مذہبوں میں بھوت پریت، جن، چڑیل اور مہیب شکلوں کے جانور انسان کے تصور پر مسلط ہوتے ہیں، اُس کے عقیدے عبرت انگیز یا ڈراؤنے قصے اور روایات ہوتی ہیں اور مذہب کی شان تہواروں اور رسموں کے ذریعے سے قائم رکھی جاتی ہے۔ کسی زمانے میں روس کے اس فطرت پرست مذہب کے تہواروں کا باقاعدہ سلسلہ تھا اور ہر تہوار کے لیے گانے اور ناچ اور داستانیں مخصوص تھیں۔ عیسائی ہونے کے بعد کلیسا اور حکما کی کوششوں سے پرانے تہواروں اور رسموں کی جگہ عیسائی مذہب کی رسمیں رائج کرائی گئیں اور چونکہ کلیسا اور مذہب نے کامیابی حاصل کرنے کے لیے ہر طرح کی سختی جائز سمجھی، روس کی پرانی رسمیں اور پرانے دیوتا ایسے ناپید ہو گئے کہ اب ان کا نام و نشان بھی نہیں ملتا۔

جہاں تک معلوم ہو سکا ہے پڑانے تہواروں کا سلسلہ جاڑے کے آخری
 نصف سے شروع ہوتا تھا، جب یہ سمجھا جاتا کہ گرمی اور روشنی (یعنی زندگی)
 کا دیوتا پیدا ہوتا ہے۔ اس دیوتا کا نام واژ تھا۔ اس کی پیدائش کی خوشی میں قربانیاں
 کی جاتیں اور عام دعوتیں ہوتیں، جن کے لیے ہر گھر سے سامان جمع کیا جاتا۔
 جیسا کہ ایک قدیم گیت سے ظاہر ہوتا ہے، اس موقع پر جنگلوں میں آگ جلائی
 جاتی اور اس کے چاروں طرف لوگ جمع ہو کر گاتے بجاتے اور گانے بجانے
 کے بعد جو جانور قربان ہوتے انھیں بھون کر کھالیتے تھے۔ لوگوں کا یہ عقیدہ
 تھا کہ جیسے جیسے بہار کا موسم قریب آتا جاتا ہے واژ جوان اور تندرست ہوتا
 جاتا ہے۔ اس کے بلوغ کی خوش خبری سنانے کے لیے دو تہوار تھے، ایک
 عیسائی ایسٹر سے کچھ پہلے ایک اس کے کچھ بعد یعنی شروع مارچ اور آخر
 اپریل میں۔ اس زمانے تک برف گھل جاتی ہے اور زمین پر سبرے کی لہرتی
 ہوئی چادر بچھ جاتی ہے۔ دیہات کے لڑکے لڑکیاں اس سبزہ زار پر جمع ہو کر
 ناچتے تھے اور چونکہ سبزہ دیکھ کر خوش ہونے اور خوشی منانے کے لیے نہ سبھی
 احکام کی ضرورت نہیں اس لیے یہ رسم اب تک جاری ہے اور اس کے ساتھ
 جو قدیم زمانے میں گیت گائے جاتے تھے ان کی بھی ایک کثیر تعداد موجود ہے۔
 اس تہوار کے بعد عین گرمی کے مہینوں میں جو واژ کی قوت اور اس کے
 اقتدار کے عروج کا زمانہ ہوتا تھا متعدد تہوار تھے۔ چوبیس جون کو واژ کی
 شادی کا دن تھا۔ مانا یہ جاتا تھا کہ وہ اسی دن موت پر فتح حاصل
 کرتا ہے اور اسے قریبی سال کا سب سے اہم تہوار سمجھنا چاہیے۔ اس موقع پر

بھی بنگلوں میں آگ جلائی جاتی، لوگ جمع ہوتے، تماشے اور کرتب دکھائے جاتے، لڑکیاں رٹالوں سے اپنی تقدیر کا حال پوچھتیں، ناپح گانا ہوتا، شادی بیاہ بھی اسی دن کے لیے اٹھا رکھے جاتے تھے۔ گویا اس روز پورے سال کی خوشی منائی جاتی۔

اُن تہواروں پر جو گیت گائے جاتے تھے اُن میں کوئی خاص خوبی نہیں پائی جاتی۔ دوسری ایشیائی نسلوں کی طرح روسیوں کو بھی وہ دل ملا ہی جو کبھی شاد نہیں ہوتا، اُن کا تصور اپنا کمال صرف غم کے جذبات میں دکھا سکتا ہے۔ اس غم کو جو روسی دلوں پر چھایا رہتا ہے، روسی شاعروں اور ناول نویسوں نے عوام سے بہت بہتر ظاہر کیا ہے، لیکن روسی ادب العوام میں بھی اس کی اچھی مثالیں ملتی ہیں۔

ایک لڑکی جس کا سسرال میں جی گھبراتا ہے، یوں شکایت کرتی ہے:

”آہ، اگر برف نہ گرتی، پھول برستے۔“

جاڑوں میں بھی پھول کھلتے!

آہ، اگر میرے دل پر بوجھ نہ ہوتا۔

تو مجھے کوئی دکھ بھی نہ ہوتا۔

میں یوں ٹیک لگائے بیٹھی نہ رہتی،

حسرت سے میدانوں کو تکتی نہ رہتی۔

میں نے باپ سے کہا تھا:

باپ میرے، میرا بیاہ نہ کر۔

جو مجھ سا نہ ہو، اُس سے بیاہ نہ کر

دوسرے کی دولت پر نہ جا۔

اوپنے مکان کو نہ دیکھ۔

مجھے شوہر چاہیے، روپیہ کیا کروں گی۔

اُجالے دن چاہیں، بڑا مکان کیا کروں گی۔

”یہ پروردگیت دوسروں کے دلوں کے تار بھی چھڑکتا تھا، خصوصاً عورتوں

کی بہت سی شادیاں مرضی کے خلاف ہوتی ہیں اور ایسے گیت ایک طرح کا

مرہم ہیں جنہیں ہر زخم خوردہ دل تلاش یا ایجاد کرتا ہے۔ عورتیں جنہیں تدبیر یا تقدیر

سے وہی شکایت ہو جو اس گیت کی پہلی گلے والی کو تھی، بے بیاہی لڑکیاں جنہیں

ایسی ہی مصیبت کا اندیشہ ہو، سب اسے گاتی ہوں گی۔ ایسے گیت صدیوں تک

زندہ رہتے ہیں، اُن کی شکل میں چاہے کچھ تبدیلی ہو جائے مگر اُن کی ہستی ہمیشہ

قائم رہتی ہے، اس لیے کہ ایسی عورتیں بھی ہمیشہ ہوتی ہیں جن کا تقدیر سے کوئی ماجرا،

دل سے کوئی معاملہ ہوتا ہے اور ایسے گیت سے بہتر غمگسارا جنہیں نہیں مل سکتا۔

مصیبت زدہ لوگوں کے علاوہ بہت سے ایسے بھی ہوتے ہیں جو اس طرز کے

گیت سن کر انسانی ہمدردی کی خواہش پوری کرتے ہیں۔ یہی ان سب گیتوں

کی زندگی کا سامان ہے۔۔۔۔۔

”گزشتہ زمانے میں ہر شخص کو ایسے گیت یاد تھے، ہر ایک انہیں گاتا تھا۔

شادی بیاہ اور موت کے لیے مخصوص گیت تھے اور پیشہ ور گوئے جنہیں تمام

ایسے گیت یاد تھے رئیسوں کے یہاں ایسے موقعوں پر بلائے جاتے تھے۔ ان

گو یوں کا کام صرف گانا نہیں بلکہ رسمیں بتلانا بھی تھا۔
 ”شادی کے جو زیادہ تر گیت ہیں ان سے اس رسم کی پُرانی حقیقت ظاہر
 ہوتی ہے، جب دوٹھا ایک انجان بدلیسی ہوا کرتا تھا، جو دلہن کو زبردستی پکڑ لے
 جاتا تھا اور وہ اپنے باپ اور بھائیوں سے اس سے بچانے کے لیے التجا کرتی
 تھی۔ جیسا کہ ذیل کے گیت سے معلوم ہوتا ہے، فیصلہ اکثر مول تول سے ہوتا تھا:
 ”میرے بابا، میرے چمکتے چاند،

پیاری اماں، میرے روشن آفتاب!

کھیتوں کا حساب کیا لگاتے ہو،

دعوت کا سامان کیا کرتے ہو،

مجھ غریب کو بیچ کر شراب نہ پیو،

مجھ غریب غمزدہ کو پردیس میں بیاہ نہ دو۔“

گیت، گانے میں روسی تصور اپنے آپ کو مذہب یا اخلاق کا پابند نہیں
 سمجھتا۔ یہ کوئی عجیب بات نہیں، ساری دنیا میں یہی ہوتا ہے۔ لیکن روسی طبیعت
 بات بنانا نہیں جانتی، اور جو آزادی دوسری جگہ لوگ شرما کر مانگتے ہیں اُس کا
 اعلان کرنا روسی اپنا فرض یا اپنی مجبوری سمجھتا ہے۔ جنسی جذبات کے بیان اور
 جنسی تعلقات کی داستانیں سنانے میں وہ خاص طور پر نفاست سے پرہیز کرتا
 ہے اکثر اس حد تک کہ پڑھنے یا سننے والے کو ناگوار گزرتا ہے۔ روسی
 فطرت کے محرم راز اس کی وجہ یہ بتلاتے ہیں کہ روسی بہایت درجہ تقدیر پرست

ہوتا ہے، ہر مصیبت اپنی ہو یا پرانی، اُسے تقدیر کا ایک کھیل معلوم ہوتی ہے جس پر وہ راتے راتے زنی یا شکایت نہیں کرتا، اس لیے کہ تقدیر پر اُسے کوئی قابو نہیں، نہ تقدیر کی مصلحتوں میں دخل۔ یہ بھی کوئی نرالی خاصیت نہیں، لیکن روسی ایسے گناہوں کو جو اُس نے دیدہ و دانستہ کیے ہوں تقدیر کے سر تھوپتا ہے، اس لیے کہ اس کے جذبات نہایت شدید اور قوی ہوتے ہیں اور انہیں قابو میں رکھنے کے لیے جس مضبوط ارادے کی ضرورت ہے اُس سے وہ محروم رکھا گیا ہے۔ جنسی جذبات سب سے زیادہ قوی ہوتے ہیں، اس لیے ایسے گناہوں کے معاف کرنے پر روسی طبیعت آسانی سے آمادہ ہو جاتی ہے، اور ان کا اعتراف کر کے روسی اپنی بے بسی اور مجبوری ثابت کرتے ہیں۔ یہ ذہنیت نہرا رہا گیتوں کی تصنیف کی ذمہ دار ہے، جن میں روکھی پھسکی شہوت کے سوا کچھ نہیں۔

یہ ایک لڑکی کی داستان ہے:

میری ماں مجھ سے بہت محبت کرتی تھی، مجھے پوچھتی تھی،

کہتی تھی مجھ سے نظر ہٹانا دشوار ہے:

لیکن میں اسکی لڑکی، اندھیری رات کو، خزاں کے موسم میں

ایک بیگانے مرد کے ساتھ بھاگ نکلی،

میں کبھی گھٹنے جنگل میں بھاگی،

کبھی گھٹنے کنج میں،

آسمان کی طرف دیکھا، ٹھنڈی سانس بھری،

اور اپنا پیدائشی گھر یاد کیا۔

مجھے گھنے کبج سے کیا مطلب،

پیدائشی گھر سے کیا واسطہ؟

جب کبھی گھر کے پاس کا دریا یاد آیا،

تو دو ایک گرم آنسو بہا دوں گی۔

زہر کچھ زیادہ قیمتی نہیں،

دو چار پیسے کی چیز ہے۔

مگر لعنت تجھ پر، میری بے رحم زندگی،

میں تیرا بھی خاتمہ کرتی ہوں، ٹھہر تو!

میں نے اپنے رقیب سے کہا:

”تو بھی زہر کھالے۔“

مجھے تو نے اس دنیا سے مار بھگایا،

تو بھی کمبخت مر جا!

میرے دوستو، آؤ،

میں اب میز پر لٹائی جاؤں گی لہ

تم میرے اعمال پر رائے زنی نہ کرنا،

میرے جنازے کو کسی خاموش جگہ دفن کر دینا!

لہ رسم یہ ہے کہ جنازہ دفن ہونے سے پہلے لکڑی کے کفن میں میز یا کسی اونچی جگہ پر رکھ دیا

جاتا ہے، تاکہ غریزاً قارب اُسے آخری بار دیکھ لیں۔

روسی گیت پڑھنے کے لیے نہیں تصنیف کیے گئے تھے، ان کے پڑھنے میں کوئی لطف نہیں آتا۔ ان کی تاثیر کا صحیح اندازہ ہم اسی وقت کر سکتے ہیں جب وہ گائے جائیں اور گانے والے خود روسی ہوں۔ روسی عوام، دولگا کے برلاک اور وادی دون کے کوسک انھیں گیتوں کے بے معنی الفاظ کو اپنے جاں گدا جذبات کا ترجمان بناتے ہیں۔ ان کا لہجہ غم یا خوشی کی وہ داستان سنا تاہی جو گیت کے الفاظ میں مضمون نہیں معلوم ہوتی۔ عوام کے گیتوں کو دراصل نامکمل سمجھنا چاہیے جب تک وہ ایک خاص ماحول میں ایک خاص ادا سے گائے نہ جائیں۔ الفاظ دل کی ترجمانی شاعری میں کرتے ہیں، گیتوں میں نہیں کر سکتے۔

رزمیہ شاعری اور داستانیں

ادبی نقطہ نظر سے روسی گیتوں کا سب سے دلچسپ حصہ وہ ہے جس میں ”جواں مردوں“ اور ”جواں مردی“ کی داستانیں گئی ہیں۔ ان میں سے کچھ رزمیہ نظمیں ہیں اور زیادہ تر قدیم زمانے کے قصبے۔ روسی رزمیہ نظموں کی مطلق وہ حیثیت نہیں جو فردوسی کے شاہنامے یا ہومر کے ایلید یا اوڈیسی کی ہے۔ ان کے ہیرو پورے انسان بھی نہیں، سوا ایک ایلیمور و میٹز کے، جس میں رسم کی کچھ جھلک سی نظر آتی ہے اور ان کے کارنامے بھی کچھ بے تکے سے ہیں۔ کسی کی تعریف یہ ہے کہ وہ چڑیوں کی طرح بول لیتا ہے، کوئی ایک قدم میں تیس سیل طو کر لیتا ہے۔ کوئی اس قدر وزنی ہے کہ ہر قدم پر اس کا آدھا دھڑ زمین میں دھنس جاتا ہے۔ ان حضرات کے نہ دل ہی نہ دماغ، محض طاقت اور وزن ہی اور انھیں بھی وہ لہ روسی دریا۔ برلاک وہ مزدور ہیں جو اس دریا پر کشتیاں کھینتے یا گھسیٹتے ہیں۔

استعمال کرنا نہیں جانتے۔ نمونے کے طور پر الیامور و مٹز کی سوانح عمری کا ایک حصہ پیش کیا جاتا ہے۔

الیامور و مٹز اپنے گھر کے دروازے پر بیٹھا تھا۔ اسے بیٹھے بیٹھے تیس برس ہو گئے تھے۔ اس کے سر کے بال خاصا جنگل بن گئے تھے، جس میں چرند پرند آباد تھے، اس کے ہاتھ پیر پتھر کے ستون تھے، جن میں جنبش کی طاقت باقی نہیں رہی تھی۔ ایک روز حضرت عیسیٰ اپنے ایک چیلے کے ساتھ بھیس بدلے ہوئے اس کے گھر کے سامنے سے گزرے اور اس سے پینے کو پانی مانگا۔ الیامور و مٹز نے معذرت کی اور کہا کہ میں چلنا پھرنا بھول گیا ہوں۔ یہ سن کر حضرت عیسیٰ نے کچھ پڑھ کر اس پر پھونک دیا اور اس کے اعضا میں جنبش کی قوت آگئی۔ اس نے اٹھ کر مسافروں کو پانی پلایا اور وہ اسے دعا دے کر چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد مور و مٹز کو ایسی شدید پیاس لگی کہ وہ تیس گھڑے پانی پی گیا، اور ایسی بھوک لگی کہ وہ بھیڑیوں کے ایک پورے گلے کو بھون کر کھا گیا۔ کھانے پینے کے بعد اس کے جسم میں جوان مردوں کی سی طاقت آگئی اور جوان مردوں کے حوصلے پورے کرنے کے لیے اس نے سیر و سیاحت پر مکر باندھی اور پردیس جانے کے لیے اپنے باپ کے پاس اجازت لینے گیا۔ رزمینہ نظم اس موقع کا ذکر اپنے نزلے انداز میں یوں کرتی ہے:

”ہوا کے جھونکوں نے سر بفاک شاہ بلوط کو زمین تک نہیں جھکا

دیباہی، پہاڑوں میں موسلا دھار بارش نہیں ہو رہی ہے۔ الیا

مور و مٹز اپنے باپ کے سامنے سر جھکائے کھڑا ہے اور اس کی آنکھوں

سے آنسو جاری ہیں۔“

باپ سے رخصت ہو کر الیامور و مٹز شہر کیف کی طرف روانہ ہوا، جہاں اس نے سنا تھا کہ شاہ دلاجیر رونق افزو نہ ہے۔ رستے میں اُسے ایک جگہ خبر ملی کہ ایک دیونے جس کا نام سولووتی (یعنی بلبل) ہے، ساری مخلوق کو پریشان کر رکھا ہے، نہ آدمی اُس سے محفوظ ہیں نہ چرند و پرند۔ مور و مٹز اُس کے مقابلے کو گیا اور لڑائی کے بعد اُسے قید کر کے دلاجیر کے دربار میں بطور تحفے کے لے گیا۔ وہاں ایک مباحثے کے بعد جس میں مور و مٹز نے اپنی چالاکی کا ویسا ہی ثبوت دیا جیسے میدان میں اپنے زور بازو کا دیا تھا، اُس نے بادشاہ کے حکم سے دیو کو قتل کر دیا۔ اس کے بعد مور و مٹز نے میدان کارزار میں اپنی ہمت اور دلیری سے بہت شہرت حاصل کی، یہاں تک کہ وہ بادشاہ کا خاص مشیر اور سپہ سالار بن گیا۔

چونکہ زرمیہ نظمیں بڑے عرصے تک ضبط تحریر میں نہیں آئیں اور پیشہ ور گوئیوں کے حافظے کے سوا اُن کی بقا کا اور کوئی ذریعہ نہ تھا، اس لیے اُن میں بہت تبدیلیاں ہوتی رہیں اور شاعرانہ مذاق کے گویے اُن میں اپنی طرف ملے روسی زرمیہ چونکہ تمام دیہات کی تصنیف ہو اس لیے اُس کے بیان میں رنگا رنگی نہیں میدان ہر جگہ ”صاف“ میدان ہے، زمین ہمیشہ ”کھلی دھرتی مانا“ تشبیہ کا بھی یہی ایک انوکھا طریقہ ہے جس کی مثال اد پردی گئی ہے۔

۱۱۱۲ - ۱۱۲۵) کا دربار اسی طرح جوں جوں کا مرجع مانا گیا ہے جیسے آرمقرا انگلستان میں اور شارلمین کا یورپ میں۔

سے کچھ نہ کچھ اضافہ کرتے رہے۔ کہیں کہیں تو ایسی ترمیمیں کی گئی ہیں کہ ساری روسی رزمیہ شاعری کے مستند ہونے میں شک پیدا ہو جاتا ہے۔ مثلاً ایک جگہ مورد مشر دشمن کی فوج کو دیکھنے کے لیے ”جرمن نال“ یعنی دور بہین استعمال کرتا ہے۔ یہ ترمیم ۱۹۵۷ء کے بہت بعد کی معلوم ہوتی ہے۔

رزمیہ کے علاوہ جواں مردوں کی جو داستانیں ہیں وہ ادبی اور تاریخی لحاظ سے بہت زیادہ دلچسپ اور قابل توجہ ہیں۔ ان کی تصنیف کا زمانہ زیادہ تر نزار اوان چہارم کا عہد یعنی سولہویں صدی کا وسط ہے اور ان کا تعلق رزمیہ نظموں کی طرح فرضی شخصیتوں سے نہیں۔ روس میں نزار اوان کے عہد تک کامل نراج رہا، ہر شخص کو اپنی جان و مال کی حفاظت خود کرنا ہوتی تھی اور اس کے مال اور جان کے درپے بھی بہت سے رہن، قزاق اور لیٹھے ہوا کرتے تھے۔ نزار اوان نے تخت پر بیٹھے ہی تمام مفردوں کو چن چن کر مارنا شروع کیا، مگر آخر عمر میں خود ایا ظالم بن گیا کہ قزاق اور رہن اس کے مقابلے میں خلق خدا کے خیر خواہ نظر آنے لگے۔ جواں مردی کی داستانوں کے لیے اس سے بہتر فضا تصور کرنا مشکل ہے۔ لیکن اوان کے ظلم نے قوم میں ایک ہیبت ناک مایوسی اور سرد مہری پیدا کر دی۔ اس زمانے کے قصوں میں اچھے اور برے ظالم اور مظلوم میں کوئی امتیاز نہیں کیا جاتا۔ جواں مرد وہ ہے جو جواں مردی دکھائے، ارادہ اس کا چاہے جو کچھ ہو، اس لیے کہ نیت اور ارادے کی پروا نہ نزار اوان نے کبھی کی، نہ تقدیر کرتی ہے۔ ایک چوراہی زندگی کا انجام یوں تصور کرتا ہے:

”اے ہرے بھرے کتج، شور نہ مچا،

مجھ جواں مرد کے سوچ بچار میں دخل نہ دے۔

کل مجھے اپنے خوف ناک منصف کا سامنا کرنا ہی،

اپنے خوف ناک منصف، خود زار کا۔

’مجھ سے میرا آقا، روس کا زار پوچھے گا:

”تو بتا، بتا مجھے اے کسان کے بیٹے،

تو نے کس کے ساتھ مل کر چوری کی، کس کے ساتھ مال تقسیم کیا؟“

”میں کہتا ہوں تجھ سے، سچے مذہب داے بادشاہ،

بچھے ٹھیک ٹھیک سچی بات بتاتا ہوں:

میرے چار ساتھی تھے۔

پہلا ساتھی اندھیری سات تھی،

دوسرا ساتھی میرا تیز گھوڑا،

تیسرا میرا آبدار چاقو،

چوتھا میری کڑی کمان۔

میرے سفیر میرے بچھے ہوئے تیر تھے“

کیا جواب دے گا میرا سچے دین والا بادشاہ؟

لے زار روس کا خطاب ”دین برحق کا“ یا ”سچے دین والا بادشاہ“ ہے۔ عیسائی مذہب

کی جو شکل روس میں رائج ہو اسے صحیح سلاف“ کہتے ہیں۔ یہ مشرقی بازنطینی کلیسا کی

ایک شاخ ہے۔

”میں نے مانا ہی کسان کے بیٹے،

تو چوری کرنا جانتا ہی اور جواب دینا بھی۔

میں تیرے لیے تجویز کرتا ہوں۔ اے کسان کے بیٹے،

بیچ میدان میں ایک چبوترہ،

اور اُس پر تین بتلیاں، دو کھڑی ایک پڑھی“

”ستینکارازن اور ایرانی شہزادی“ کی داستان جواں مردی کے ایک اور

پہلو پر روشنی ڈالتی ہے:

جزیرے کی آڑ میں، موجوں کے میدان میں

رنگ برنگی تیز کشتیاں تیر رہی ہیں۔

سب سے اگلی پرستینکارازن

شہزادی کو بغل میں لیے بیٹھا ہے۔

اُس کی نئی نئی شادی ہوئی ہے،

جس کی خوشی میں وہ محمور ہے۔

دلوں کے پیچھے سے بڑ بڑانے کی آواز آرہی ہے

ہمیں ایک عورت کے بدے چھوڑ دیا ہے،

شادی کی ایک رات گزری مہنیں،

سویرے خود زنا نہ ہو بیٹھا۔

بڑ بڑاہٹ اور فقرے خوفناک اتمان نے سنے،
اور وہ شہزادی کو بغیل میں دبائے تھا۔

سیاہ بھنوں نے سمٹ کر طوفان کی خبر دی۔

قزاق آنکھوں میں خون بھر آیا :

” میں سب کچھ سچ دوں گا۔

اپنا سر تک نثار کر دوں گا؛“

قزاق کی بھاری آواز سے وادی گونجنے لگی۔

شہزادی نگاہیں نیچی کیے ،

بسمل، نیمجان، اتمان کی مست باتیں سن رہی تھی۔

دولگا، دولگا، دولگا مائی

دولگا روس کی مائی ناز۔

مجھے کبھی کسی دن کے کوسک نے۔

کوئی ایسا تحفہ نہ دیا ہوگا۔

تاکہ جواں مردوں میں فساد نہ پھیلے،

آپس میں بیر نہ ہو،

دولگا، دولگا، دولگا مائی

۱۵ سردار۔

۱۶ روس کا دریا۔

۱۷ روس کا دریا جس کی وادی میں کوسک نسل آباد ہے۔

تو ہی اُس حسینہ کو قبول کر لے۔

اتمان نے جوش میں آکر

حسین شہزادی کو موجوں کے حوالے کر دیا۔

اے شیطانو، تم نے کیا صورتیں بنائیں؟

فیل کا مسخرے، تو ناچتا کیوں نہیں؟

آؤ بھائیو، اُس حسینہ کی یاد میں

ایک اچھا سا گیت گائیں۔

جزیرے کی آڑ میں، موجوں کے میدان میں۔

ستینکا رازن کی رنگ برنگی کشتیاں،

تیر رہی ہیں، کھیل رہی ہیں۔

یہ اُن جواں مردوں کی داستانیں ہیں جو بادشاہ اور شاہی نظام کے

دشمن تھے۔ خود بادشاہ کے انصاف کی داستان اور بھی دردناک ہی۔

دو موسکد والوں کی سازشوں سے ہزار ہو کر سخت گیر اوان نے شہر کے

باہر محل بنوایا اور جب معصوم خون بہانے سے طبیعت سیر ہو جاتی تو وہ اپنے مظالم

کی یاد شراب خواری اور عیش و طرب کی مجلسوں میں بھلاتا تھا۔ اُن قتل و خون آؤ

بدمستی کے دنوں میں امیر اور غریب اپنی عزت اور جان کے لیے لڑتے تھے۔ صرف

اوان کا مسخرہ اپنے رنگ برنگی پونڈوں کا کفتان پہنے ہوئے اس کی جرات

لے ایک نام ہے۔

۲۷ کفتان یا خفتان، ایک قسم کی عبا تھی جو اچکن سے بہت مشابہ تھی۔

کر سکتا تھا کہ بادشاہ سے مذاق کرے اور کبھی کبھی اداں اپنی ظالمانہ حرکتوں پر نادم ہو کر سچی بات سننا گوارا کر لیتا تھا، بشرطیکہ وہ کسی دل لگی کے پیرائے میں ہو۔ ایک مرتبہ ناراوان اپنا گروہ دارعصا ہاتھ میں لیے ہوئے باسنوٹ^۱ اور ملیوٹا کے ہمراہ مجلس میں آیا۔ ساری رات تعذیب خانے میں جلاد کی تلوار خون آشام رہی تھی۔ ناراوان، ابھی تک تھکا مانڈا پیلا اور بد مزاج خورد و نوش کے کمرے میں اپنی میز پر آکر بیٹھا۔ ہر طرف سے خوش پوشاک ملازم طرح طرح کی شرابیں لا کر اس کے سامنے رکھ رہے تھے۔ مسخرہ اپنی سفید چادر پر اس کے پیروں کے پاس لیٹا تھا۔

”ارے ناراوان“ مسخرے نے بادشاہ سے کہا ”ذرا ایک پیالے میں خوب بھر کر شراب تو پلا!“ ”جا بے احمق“ نار نے جواب دیا اور میز پر ایک سنہرا قدح اُلٹ دیا۔ شراب کی موج میز پر سے بہ کر مسخرے کے کفتان اور چادر پر پکھر گئی۔ درباری سب خون سے کانپ گئے مگر کفتان سے شراب کے قطرے جھاڑتے ہوئے مسخرے نے کہا۔

”قیمتی شراب کے دریا کیوں بہاتا ہے..... کیا یہ بھی بے گناہوں کا خون ہے؟“

درباریوں میں ہل چل مچ گئی، ایک دوسرے کی آڑ لینے لگے۔ اواں کا عصا تیر کی طرح زینٹا ہوا اُڑا اور مسخرے کے حلق کے پار ہو گیا۔

کہانیاں اور قصے:

کہانیاں اور قصوں میں روسی فطرت ایک اور ہی انداز میں نظر آتی ہے۔

۱۔ ناراوان کے دو مشیر جو بڑی حد تک اس کی خونریزیوں کے ذمہ دار تھے۔

یا تو محض مذاق مقصود ہوتا ہے یا اخلاقی تعلیم، مگر نہ تو ان کے مذاق میں وہ بھونڈا پن
 ہے نہ وہ خونخواری جو اکثر مذاقیہ گیتوں میں ملتی ہے، اور نہ ان کی اخلاقی تعلیم میں اُس
 سرد مہری، حزن، ایسے رجمی اور پستی کی کوئی جھلک ہے جو اچھے روسی گیتوں تک کو تلخ
 نہیں تو بد مزہ ضرور کر دیتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ گیتوں پر مذہب کا اثر نہیں پڑا،
 اور قصہ کہانیاں روسی تصور کی گہری اور سچی مذہبیت کی گل کاریاں ہیں۔
 قصے کہانیوں کا سلسلہ بھی زمانہ جاہلیت سے شروع ہوتا ہے، جب ہوا،
 سورج، پالا وغیرہ زندہ ہستیاں سمجھی جاتی تھیں اور انسان کا ذکر اگر کیا بھی جاتا
 تو محض اُس کی اپنی سبکی اور اُس کے دیوتاؤں کی قدرت دکھانے کے لیے۔ ایک
 مختصر سا قصہ بطور نمونے کے بیان کیا جاتا ہے۔

سورج، پالے اور ہوا میں بحث ہو رہی تھی۔ سورج نے کہا: "میں قادر مطلق
 ہوں" پالے نے کہا: "ہنیں میں ہوں" ہوا بولی: "تم دعوے چاہے جتنے بڑھ بڑھ کر
 کرو، میری مدد بغیر تم کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ دیکھو یہ کسان جا رہا ہے، اگر تم میں اس کی
 قدرت ہو تو اُس سے اُس کا موٹا لبادہ اتر دالو۔ میں کوشش کروں گی کہ وہ
 اُسے پہنے رہے" سب اس امتحان پر راضی ہو گئے۔ سورج خوب زور سے چمکا،
 زمین پر آگ برسنے لگی۔ بیچارے کسان نے ادھر ادھر گھبرا کر دیکھا اور لبادے
 کے ٹن کھولے ہی تھے کہ منہ پر ٹھنڈی ہوا کا جھونکا لگا اور جیسے گرمی بڑھی ویسے
 ہی ہوا ٹھنڈی ہوتی رہی۔ کسان کو بڑی حیرت ہوئی کہ اس قدر گرمی میں ہوا ایسی
 ٹھنڈی کیسی اور اس اندیشے میں کہ کہیں اُسے جاڑا نہ لگ جائے اُس نے اپنا
 لبادہ نہیں اتارا۔ سورج کی فاش شکست دیکھ کر پالے کو بہت غصہ آیا۔

اُس نے تاؤ میں آکر کہا: ”اس بیچارے کسان کی ہستی کیا ہے۔ میں ابھی اس ہاتھ پیرا لیے ٹھٹھرا دوں گا کہ یہ ایک قدم آگے نہ بڑھ سکے گا!“ کسان پر پھر آفت آئی۔ پالے کے تیور ایسے تھے کہ اگر ہوانے کسان کی مدد نہ کی ہوتی تو اُس کے ہاتھ پیر سردی سے نیلے پڑ جاتے اور وہ وہیں کا وہیں جم کر مر گیا ہوتا۔ لیکن پالا اپنی طاقت دکھانے ہی والا تھا کہ ہوا کے تیز جھونکے چلنے لگے۔ ہوا تیز چل رہی ہو تو سردی ضرور ہو جاتی ہے، لیکن پالا نہیں پڑ سکتا۔ پالا اسی انتظار میں رہا کہ ہوا رُکے تو اپنا زور دکھاؤں۔ بھلا ہوا کب رُکنے والی تھی۔ جھونکے پر چھوٹکا آتا رہا، اور آخر پالے کو بھی ہاری ماننا پڑی۔ بیچارہ کسان خیریت سے گھر پہنچ گیا۔ زمانہ جاہلیت ہی سے وہ کہانیاں بھی تصنیف ہونے لگیں جن کے قصے جانور ہیں۔ یہ قصے زیادہ تر مذاقیہ ہیں، اور ان میں عموماً لومڑی جیسے چالاک جانور دوسروں کو بیوقوف بناتے ہیں۔ کبھی کبھی آدمی آدمی کا فرق دکھانے کے لیے زود فہم اور دور اندیش روسی کا کندھن اور احمق تاتاری سے بھی مقابلہ کر دیا جاتا ہے۔ ایک لومڑی کا قصہ بیٹے، جس نے ایک بوڑھے آدمی اور ایک بھیرے کو چکادیا۔

”بہت دن ہوئے ایک تھا بڈھا اور ایک تھی اُس کی بڑھیا۔ بڈھے نے بڑھیا سے کہا: بڑھیا تو سمو سے پکا، میں گاڑی جو تیا ہوں، جا کر مچھلی پکڑ لاؤں گا۔ اُس نے دریا پر جا کر بہت سی مچھلیاں پکڑیں، اتنی کہ پورا ڈھیر لگ گیا، اور تب واپس چلا۔ راستے میں اس نے دیکھا کیا کہ ایک لومڑی گیند

کی طرح لپٹی پڑی ہو۔ بڑھا گاڑی پر سے اتر اور لومڑی کے پاس گیا وہ ذرا بھی
 نہیں ہلی، ایسی پڑی رہی گویا بالکل مر گئی ہو۔ بڑھے نے سوچا کہ اس کی کھال
 بڑھیا کے کام آئے گی۔ لومڑی کو اٹھا کر گاڑی پر رکھ لیا اور خود آگے آگے چلنے
 لگا۔ لومڑی یہ دیکھ کر اٹھی اور ایک ایک کر کے مچھلیاں گاڑی میں سے گرانے لگی۔
 اسی طرح سب مچھلیاں نیچے پھینک دیں اور پھر خود کو دکھ کر بھاگ گئی۔

بڑھا گھر پہنچا اور جلدی سے بڑھیا کو خوش خبری سنانے گیا: ”بڑھیا، بڑھیا

دیکھ میں تیرے لبادے کے لیے کیا گلوبند لایا ہوں“

”کہاں ہے“ بڑھیا نے پوچھا۔

”گاڑی پر۔ گلوبند بھی اور مچھلیاں بھی“

بڑھیا لپک کر دیکھنے گئی۔ وہاں نہ مچھلیاں تھیں نہ گلوبند۔ وہ بڑھے کو

گالیاں دینے لگی: ”ارے نگوڑے تو بڑھاپے میں بھی ایسی چالیں چلتا ہے“

بڑھے کو کبھی دھوکا دینے کا خیال بھی نہ تھا۔ اسے تو لومڑی نے بیوقوف بنایا تھا۔

لومڑی نے سب مچھلیاں اکٹھا کیں اور اطمینان سے کھانے بیٹھی۔ اتنے

میں ایک بھورا بھیریا پہنچا۔

”بوا سلام“

”جیتے رہو بھتیا“

”و بوا اکیلی اکیلی کیا کھا رہی ہو، ہم کو بھی مچھلیاں دو!“

”مد میں کیوں دوں؟ تم آپ پکڑ لاؤ اور کھاؤ۔“

”مد میں کیسے پکڑوں“

” جیسے میں نے پکڑیں۔ بہت آسان ترکیب ہے۔ دریا میں دُم لٹکا دو اور چلاؤ: آجاؤ مچھلیو، آجاؤ، چھوٹی مچھلیو، بڑی مچھلیو، آجاؤ۔ مچھلیاں خود آکر تمہاری دُم سے چپٹ جائیں گی۔ مگر دیکھو، دیر تک بیٹھنا، نہیں تو ایک بھی نہ ملے گی!“ بھیڑیے نے جا کر پانی میں دُم لٹکا دی اور جیسے لومڑی نے سکھایا تھا ویسے ہی چلاتا رہا، تھوڑی دیر میں ساری مچھلیاں مضم کر کے لومڑی خود بھی آئی بھیڑیے کے ارد گرد گھومنے لگی اور منتر کی طرح یہ چنے لگی: آسان صاف ہو جا لے بھیڑیے کی دُم ٹھٹھر جا، بھیڑیے نے پوچھا: بوا، کیا کر رہی ہو، لومڑی نے نہایت مشفقانہ لہجے میں جواب دیا: ”تیرے لیے دعا کر رہی ہوں“

رات کو پالا پڑا، غضب کی سردی تھی، مگر بھیڑیا تمام رات پانی میں دُم لٹکائے بیٹھا رہا اور آخر کار اس کی دُم بالکل ٹھٹھر گئی۔ ایک دو بار اس کا جی چاہا کہ دُم نکال کر دیکھے کہ اس میں کتنی مچھلیاں چسپی ہیں، اور اس نے دُم کو ذرا سا جھٹکا دیا۔ مگر جب دُم پانی سے نہیں نکلی تو اس نے سوچا: افوہ، اتنی مچھلیاں آکر چسپی ہیں کہ دُم نکالے نہیں نکلتی!۔ ایسے ہی بیٹھے بیٹھے سویرا ہو گیا۔ گانٹھ سے عورتیں پانی بھرنے آئیں اور بھیڑیے کو دیکھ کر چلانے لگیں: ”بھیڑیا، بھیڑیا، مارو، مارو۔ بہت سے آدمی ان کی آواز سن کر لٹھ لیے دوڑے ہوئے آئے اور بھیڑیے کو دے لاکھی دے ڈنڈا خوب پیٹا۔ پہلے تو بھیڑیا مچھلیوں کے لالچ میں پٹسارہا، پھر ایک بار جو زور لگا کر بھاگا تو اس کی دُم ٹوٹ کر دریا میں رہ گئی یہ

لے برنگ کرنے کے بعد آسان کا صاف ہو جانا پالا پڑنے کی خاص نشانی ہے۔

۱۵ اوسمولوفسکی: روسی ادب۔

روسی ادب العوام کے روحانی قصوں کا باب بہت لمبا ہے۔ ان میں اخلاق اور مذہب کی اصلیت عجیب پیاری پیاری ترکیبوں سے دکھائی گئی ہے، جن سے صرف یہی نہیں ثابت ہوتا کہ روسی عوام نے اپنے دین کو خلوص سے قبول کیا ہے، بلکہ یہ بھی کہ مذہب عیسوی اپنی اصل صورت میں روسی کے دل کے باہر کہیں اور ملتا ہی نہیں۔ قصے کہانیاں یورپ کے ہر ملک میں، ہر قوم نے تصنیف کی ہیں مگر دین عیسوی کہیں اور اس شان سے نہیں نظر آتا۔

ہر روسی مصنف نے اپنا فرض سمجھا ہے کہ عوام کی جو اخلاقی کہانیاں اُس کے سننے میں آئیں، اُنہیں ضبط تحریر میں لائے۔ اس سے یہ فائدہ تو ضرور ہوا کہ بہت سی کہانیاں جنہیں ممکن ہے لوگ سنا سنا کر بھول جاتے، اس وقت تک موجود ہیں، مگر اتنا نقصان بھی ہوا کہ اب ہم انہیں ان کے اصل پیرایے میں نہیں دیکھ سکتے اور وہ سادگی جو ان کی خاص صفت ہے، اس ادبی لباس میں نظر سے چھپ جاتی ہے۔ ذیل میں دو قصے مختصر کر کے بیان کیے جاتے ہیں، جنہیں تالائی نے ادبی جامہ پہنایا ہے، ان سے اس قسم کے قصوں کے اوصاف واضح ہو جائیں گے پہلا قصہ ایک "احمق" کا ہے جو فطرتاً مذہب عیسوی کا پیرو ہے اور اپنی "حماقت" کی کامیابی سے اپنے مذہبی اصولوں کی سچائی ثابت کرتا ہے۔

احمق اوان

ایک خوش حال کسان کے تین لڑکے تھے، سیم یون، جو فوج میں نوکرتھا، تراس، جس نے تجارت شروع کی تھی اور اوان، جو گھر پر کھیتی کرتا تھا اور اپنی سادہ دلی کی وجہ سے احمق کہلاتا تھا۔ ان کے علاوہ اُس کی ایک لڑکی مارتھا

بھی تھی، جو پیدائش سے گونگی اور بہری تھی۔ سب سے بڑے بیٹے نے ایک امیر کی لڑکی سے شادی کی، جو اس قدر فضیول خرچ تھی کہ شوہر کی گزر اوقات قرضے پر ہونے لگی۔ دوسرے نے ایک تاجر کی لڑکی سے نکاح کیا۔ اس کی مالی حالت بڑے بھائی سے تو اچھی تھی، لیکن لالچ کی وجہ سے اُسے اپنی دولت کم نظر آتی تھی یکے بعد دیگرے دونوں بھائی باپ کے پاس پہنچے اور جائداد کا بٹوارا کرنا چاہا۔ باپ نے انکار کر دیا:

”تم جائداد پر محنت تو کرتے نہیں، تمہیں حصہ کیوں ملے؟ تم کو حصہ دینا ادا ان اور اُس کی بہن کے حق میں نا انصافی ہوگی۔“

لڑکوں نے کہا: ”ادا ان احمق ہی، مار کھا پوڑھی، یہ دونوں جائداد لے کر کیا کریں گے؟“

باپ نے جب ادا ان سے پوچھا کہ بھائیوں کو جائداد دی جائے یا نہیں، تو ادا ان نے ہنس کر کہا: ”اُن کا جو جی چاہے لے جائیں۔ میں محنت کر کے اُسے پھر حاصل کر لوں گا!“ بھائیوں نے اپنے حصے بیج ڈالے اور روپیہ لے کر اپنے کاموں پر واپس چل دیے۔

شیطان مکار کو اس سمجھوتے پر بہت غصہ آیا۔ وہ چاہتا تھا کہ تینوں میں لڑائی ہو۔ اس لیے اس نے تین چھوٹے شیطان بلائے اور اُن سے کہا: دیکھو یہ تین بھائی ہیں، انہیں آپس میں لڑنا چاہیے تھا، مگر اس احمق ادا ان نے سارا معاملہ بگاڑ دیا۔ تم جاؤ اور ان تینوں میں فساد ڈالو اور دیکھو اس احمق کا خاص خیال رکھنا۔ یہ کم بخت ایسا مہنتی ہے کہ دونوں بڑے بھائیوں کو کھلاتا پلاتا رہے گا۔“

تینوں شیطان بچے اپنے اپنے کام پر روانہ ہوئے۔ پہلے نے سم یون کو ایسا مغرور بنا دیا کہ اس نے اپنے بادشاہ کے لیے ساری دنیا فتح کرنے کا دعوٰی کیا اور جب وہ فوج لے کر لڑنے گیا تو شیطان بچے نے فوج کی ساری بارود گیلی کر دی اور سم یون کو میدان جنگ سے بھاگنا پڑا۔ بادشاہ بہت خفا ہوا۔ وہ چاہتا تھا کہ سم یون کا سر قلم کرادے، مگر سم یون قید خانے سے نکل بھاگا اور باپ کے گھر کا رخ کیا۔ دوسرے شیطان نے تراس کے دل میں ایسی ہوس پیدا کر دی کہ وہ ہر چیز خریدنا چاہتا تھا، یہاں تک کہ اُس پر ڈھیروں قرض چڑھ گیا اور وہ اپنے قرض داروں سے بچنے کے لیے گھر بھاگ گیا جس شیطان بچے نے اِدا ان کو درغلانا اپنے وقتے لیا تھا وہ بہت ناکام میاں رہا۔ پہلے تو اُس نے اِدا ان کے کٹورے میں تھوک دیا اور اِدا ان نے جب پانی پیا تو اُس کے پیٹ میں بہت سخت درد اُٹھا۔ لیکن اس کے باوجود وہ اپنے کام پر گیا اور کھیت میں ہل چلانے لگا۔ شیطان بچے اُس کی مستعدی دیکھ کر بہت حیران ہوا اور اُس کو کام سے بیزار کرنے کے لیے وہ زمین میں گھس گیا اور نیچے سے ہل پکڑ لیا لیکن اِدا ان نے ایسا زور لگایا کہ یہ ترکیب نہ چلی اور ہل کی تیز دھار سے شیطان بچے کے ہاتھ زخمی ہو گئے۔ شیطان بچے نے عاجز آ کر ہل کو دونوں ہاتھ پیر سے پکڑ لیا۔ اِدا ان سمجھا کہ ہل کسی جڑ میں پھنس گیا ہو اور اُس نے اپنا ہاتھ زمین میں گھسا دیا کہ اُسے پھینچ کر نکالے۔ لیکن جڑ کی جگہ اس کے ہاتھ میں ایک نرم نرم سی چیز تھی۔ اُسے اِدا ان نے باہر نکالا تو دیکھا کہ جڑ نہیں، شیطان بچے ہاتھ میں ہی، وہ بالکل کالا، چھپکلی کا سا تھا۔

ادان کو اُسے دیکھ کر بہت گھن آئی اور وہ چاہتا تھا کہ اُسے کسی پتھر پر
 پٹک کر مار ڈالے۔ مگر شیطان بچے نے چلا کر کہا: ”مجھے مارو نہیں مجھے چھوڑ دو، تم جو
 کچھ کہو میں کروں گا۔“ اِوان نے پوچھا: ”تو پیٹ کا درد اچھا کر سکتا ہے؟“ شیطان
 بچے نے اُسے اچھا کر دینے کا وعدہ کیا تو اِوان نے اُسے چھوڑ دیا، اور اُس نے
 وہیں زمین میں سے اِوان کو تین پتلی جڑیں نکال کر دیں اور کہا: ”جو انھیں
 کھائے گا وہ ہر بیماری سے اچھا ہو جائے گا۔“ اِوان نے ایک جڑ کھائی اور اس کا
 درد فوراً رفع ہو گیا۔ شیطان بچے نے پھر کہا: ”مجھے جانے دو، میں زمین میں دس
 جاؤں گا اور تمہیں پھر کبھی نہ پریشان کروں گا۔“ اِوان نے کہا: ”اچھا جاؤ خدا
 حافظ، مگر خدا کا نام سنئے ہی شیطان بچہ زمین میں اسی طرح غائب ہو گیا، جیسے پتھر
 پانی میں، صرف ایک سوراخ دکھائی دیا۔“

سارے کھیت میں ہل چلا کر اِوان شام کو گھر واپس آیا تو اُسے وہاں اُس کا
 سب سے بڑا بھائی سیم یون ملا۔ اُس نے اپنی پوری داستان سنائی اور کہا:
 ”اب میں یہیں رہنا چاہتا ہوں۔“ اِوان نے کہا: ”اچھا خوشی سے رہو“ لیکن رات
 کو جب سب کھانے پر بیٹھے تو سیم یون کی بیوی نے کہا: ”میں ایک میلے کھیلے کسان
 کے ساتھ کھانا نہیں کھا سکتی۔“ سیم یون نے اِوان سے کہا: ”میری بیوی تمہارے
 ساتھ کھانا نہیں کھا سکتی۔ تم باہر جا کر کھا لو۔“ اِوان نے کہا: ”بہت اچھا،“
 اور اپنا کوٹ لے کر باہر چلا گیا۔

دوسرے دن دوسرا شیطان بچہ جس کے سپرد سیم یون کی بریادی ہوئی
 تھی، اپنے ساتھی کو تلاش کرتا ہوا آیا، مگر ساتھی کے بجائے اُسے ایک سوراخ ملا

وہ سمجھ گیا کہ اس کے ساتھی کا کیا انجام ہوا ہے، اس لیے وہ اوان سے بدلہ لینے پر تُل گیا۔ لیکن پہلے کی طرح اسے بھی اوان نے پکڑ لیا اور چاہتا تھا کہ اسے مار ڈالے، مگر شیطان بچے نے چلا کر کہا، ”مجھے چھوڑ دو، میں تمہیں پھر نہیں ستاؤں گا اور تم جو کچھ کہو گے وہ کروں گا۔“ اوان نے پوچھا ”تم کیا کر سکتے ہو؟“ شیطان بچے نے جواب دیا: ”میں تمہارے لیے جس چیز سے چاہو سپاہی بنا دوں گا۔“ سپاہی میرے کس کام آئیں گے؟“ اوان نے کہا۔ ”جس کام میں لانا چاہو“ شیطان بچے نے جواب دیا۔ ”کیا وہ گا سکیں گے؟“ ہاں اگر تم چاہو۔“ اوان نے آخر میں کہا: ”اچھا تو تھوڑے سے بنا کر دکھاؤ۔“ شیطان بچے نے منتر سا پڑھا اور دو چار گہیوں کی بالیاں زمین پر پھینک دیں۔ فوراً سپاہیوں کی ایک جماعت جس میں ہر ایک کے پاس کوئی نہ کوئی باجا تھا، اوان کے سامنے کھڑی ہو گئی اور سب نے باقاعدہ باجا بنا شروع کر دیا۔ اوان باجے سن کر بہت خوش ہوا۔ ”واہ، کیا خوب! اب میں گانو کی لڑکیوں کے سامنے یہ باجا بجاؤں گا تو وہ سن کر بہت خوش ہوں گی۔“ اوان کو خوش دیکھ کر شیطان بچے نے جانے کی اجازت مانگی، مگر اوان نے کہا، ”نہیں، پہلے تم ان سپاہیوں کو پھر غلہ بنا دو۔ میں اپنا ناج نہیں خراب کرنا چاہتا۔“ شیطان بچے نے اُسے ایک منتر بتایا جس کے پڑھنے سے سارے سپاہی پھر گہیوں کی بالیاں ہو گئے۔ اوان نے شیطان بچے کو چھوڑ دیا اور کہا: ”جادِ خدا حافظ،“ مگر خدا کا نام سنتے ہی شیطان بچہ زمین میں غائب ہو گیا، جیسے پتھر پانی میں۔ صرف ایک سوراخ دکھائی دیا۔

شام کو جب اِوان گھر لوٹا تو اُس کا دوسرا بھائی تراس اپنی بیوی کے ساتھ بیٹھا کھانا کھا رہا تھا۔ اِوان کو دیکھ کر اُس نے کہا: ”دیکھو بھائی مجھے تھوڑے دن اپنے یہاں رہنے دو، اِوان راضی ہو گیا۔ مگر جب وہ نیر پٹھیا تو تراس کی بیوی نے کہا: ”میں اس احمق کے ساتھ نہیں بیٹھ سکتی۔ اس کے کپڑوں سے پسینے کی بو آتی ہے۔“ تراس نے اِوان سے کہا: ”اِوان تمہارے کپڑوں سے پسینے کی بہت تیز بو آرہی ہے۔ تم باہر بیٹھ کر کھانا کھاؤ۔“ اِوان نے کہا: ”اچھا مجھے ویسے بھی گھوڑی کو دانہ دینا ہے۔“ اور کچھ روٹی حیب میں رکھ کر چل دیا۔

تیسرے دن تیسرا شیطان بچہ اِوان کے چھپے پڑا، مگر پھلے دو کی طرح اِوان نے اُسے بھی پکڑ لیا۔ شیطان بچے نے اپنی جان بچانے کے لیے اِوان کو ایسی ترکیب بتائی کہ جب چاہے وہ پتیوں کو ہاتھ میں مل کر سونا بنالے۔ شیطان بچے کو رخصت کرتے وقت اِوان نے اپنی عادت کے مطابق ”حذا حافظ“ کہا اور پھلے دو کی طرح یہ شیطان بچہ بھی زمین میں غائب ہو گیا، جیسے پتھر پانی میں۔ صرف ایک سوناخ دکھائی دیا۔

فصل کٹنے کے بعد کسانوں کا ایک تہوار تھا۔ اِوان نے گانوں والوں کو خوش کرنے کے لیے اُن کو سپاہیوں کا گانا سنوایا، اور سونا بنا کر اُن میں تقسیم کیا۔ اُس کے بھائیوں کو خبر ہو گئی اور وہ اُس کے پاس دوڑے ہوئے آئے۔ سیم یون نے کہا: ”مجھے سپاہی بنا دو“ تراس نے سونے کی فرمائش کی۔ اِوان نے بلا تکلف دونوں کی خواہشیں پوری کر دیں۔ اور وہ اپنے اپنے

ستے چل دیے۔ سیم یون نے ایک سلطنت فتح کی اور بادشاہ بن گیا، تراس نے
 کرڈوں روپیہ جمع کیا اور اُس سے ایک ریاست خرید لی۔ ایک عرصے کے
 بعد دونوں بڑے بھائیوں میں ملاقات ہوئی، سیم یون نے کہا: میرے پاس دوا
 ہے اور سپاہی ہیں، مگر روپیہ نہیں، تراس نے کہا: میرے پاس دولت ہے، لیکن
 اس کی حفاظت کرنے کے لیے کوئی نہیں۔ دونوں نے طی کیا کہ اوان کے پاس
 پھر جانا چاہیے کہ ایک اُس سے روپیہ مانگے، دوسرا سپاہی، تاکہ دونوں کا کام
 بے کھٹکے چلے۔ چنانچہ دونوں ایک روز اوان کے پاس پہنچ گئے۔

سیم یون نے کہا: ”میرے پاس سپاہی بہت کم ہیں، مجھے تھوڑے اور
 بنا دو“ اوان نے سر ہلا کر کہا: ”اب میں ایک سپاہی بھی نہیں بناؤں گا۔ میں
 سمجھتا تھا کہ تم نے اُنھیں صرف گانا سننے کے لیے بنوایا ہے، لیکن تمہارے سپاہیوں
 نے ایک بیچارے کسان کو مار ڈالا۔ اب میں ایک سپاہی بھی نہیں بناؤں گا۔“
 سیم یون نے بہت خوشامد کی، مگر اوان نے ایک نہ سنی۔ تراس نے اس سے سونا
 مانگا تو اوان نے انکار کر دیا اور کہا: ”میں سمجھتا تھا تم نے سونا اس لیے مانگا
 ہے کہ وہ تمہیں اچھا لگتا ہے، لیکن تم نے اس کے بدلے میخائل کی لڑکی کی گائے
 خرید لی اور اب اُس کے بچوں کے پاس ذرا بھی دودھ پینے کو نہیں۔ میں تمہیں اُد
 سونا ہرگز نہ دوں گا“ تراس نے بھی خوشامد کی لیکن اوان نے ایک نہ سنی۔ دونوں
 بھائی آخر کار مایوس ہو کر چلے گئے۔

اوان اپنے ماں باپ کے ساتھ رہتا تھا۔ ایک مرتبہ خبر مشہور ہوئی کہ
 بادشاہ کی بیٹی بیمار ہے اور بادشاہ نے اعلان کیا ہے کہ جو اُسے اچھا کر دے گا وہ

آدھی سلطنت اور داماد کا رتبہ انعام میں پائے گا۔ اوان کے ماں باپ کو معلوم
 تھا کہ اُس کے پاس ایک جڑی جو ہر بیماری کو اچھا کر دیتی ہے۔ انہوں نے اوان سے
 کہا کہ شہزادی کو جا کر اچھا کر دے، پھر سب چین سے بسر کریں گے۔ اوان راضی ہو گیا
 مگر وہ ہنہا دھو کر اور صاف ستھرے کپڑے پہن کر گھر سے نکلا ہی تھا کہ اُسے ایک بڑھیا
 ملی جس کا ایک ہاتھ سوکھ گیا تھا۔ بڑھیا نے اوان سے دو اماںگی اور اوان نے
 اُسے ایک جڑ دے دی۔ اُس کے پاس یہ ایک ہی جڑ رہ گئی تھی۔ پہلی وہ خود کھا
 چکا تھا، دوسری اُس نے ایک بیمار کتے کو کھلا دی تھی، تیسری جس سے وہ شہزادی
 کو اچھا کرنا چاہتا تھا بڑھیا کے نذر ہوئی۔ اب اُس کے پاس کچھ بھی نہ تھا، لیکن
 وہ بادشاہ کے محل پر گیا اور اتفاق سے جیسے ہی اس نے دروازے کے اندر
 قدم رکھا، شہزادی اچھی ہو گئی۔ بادشاہ بہت خوش ہوا اور اس نے اوان سے
 کہا: ”میری لڑکی سے شادی کر لو۔ اوان نے کہا بہت اچھا“ اور دونوں کی
 شادی ہو گئی۔ اب تینوں بھائی بادشاہ ہو گئے۔ شادی کے تھوڑے ہی دن
 بعد اوان کا خسر مر گیا، اوان نے اپنا سنا ہا نہ لباس اتار کر کبس میں بند کر دیا
 اور پھر وہی سن کی قمیص، حپت پانچامہ اور چھال کے جوتے جو پہلے پہنتا تھا
 پہن لیے اور پُرانا شغل بھی شروع کر دیا۔ اس نے کہا: ”میری زندگی بہت
 بے مزہ ہو گئی ہے، میں موٹا ہوا جاتا ہوں، مجھے بھوک نہیں لگتی، نیند نہیں آتی،
 اس نے اپنے ماں باپ اور بہن کو بھی اپنے پاس بلا لیا اور ویسے ہی محنت کر کے
 کھانے کمانے لگا، جیسے پہلے کرتا تھا۔

لوگوں نے کہا: ”تم تو بادشاہ ہو،“ اوان نے جواب دیا: ”کیا بادشاہ بھوکوں

مرا کرتے ہیں، میں محنت نہ کروں تو کھاؤں کیسے؟“ اِوان کے پاس ایک وزیر نے آکر خبر دی: ”ہمارے پاس تنخواہیں دینے کے لیے روپیہ نہیں“ اِوان نے کہا ”تو تنخواہیں مست دو“۔ پھر ہمارا حکام کوئی نہ کرے گا“ وزیر نے گھبرا کر کہا۔ اِوان نے جواب دیا: ”نہ کریں۔ ان کو خود محنت کر کے کھانے کے لیے اور وقت ملے گا۔ اُن سے کہو کھاؤ ڈھوئیں، پانچا نہ صاف کریں“ اِوان کے پاس لوگ انسان کے لیے آئے۔ ایک نے کہا: ”فلاں شخص نے میرا روپیہ چرا لیا ہے“ اِوان نے جواب دیا: ”اچھا تو کیا ہوا؟ اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ اُسے روپے کی ضرورت تھی“

سب کو یقین ہو گیا کہ اِوان احمق ہے۔ اُس کی بیوی نے ایک دن اُس سے کہا: ”لوگ کہتے ہیں تم بڑے احمق ہو“ ”اچھا“ اِوان نے جواب دیا: ”کہتے ہیں تو کہنے دو“۔ اِوان کی بیوی اس مسئلے پر بہت غور کرتی رہی۔ آخر کار اُس نے بھی اپنا شاہانہ لباس اتار کر صندوق میں بند کر دیا اور اِوان کی بہن کے ساتھ کام کرنے لگی۔

اِوان کی سلطنت سے سارے عقلمند لوگ چل بسے، صرف احمق ہی احمق باقی رہ گئے۔ کسی کے پاس روپیہ نہ تھا، سب محنت کر کے کھاتے اور دوسروں کو کھلاتے تھے۔

شیطان نے اپنے چیلوں کا بہت دنوں تک انتظار کیا۔ جب وہ واپس نہیں آئے تو اُس نے خود جا کر تینوں بھائیوں کو آپس میں لڑانے کا ہتھیہ کیا۔ پہلے وہ سیم یون کے پاس گیا اور اُسے فوج بڑھا کر شہرت حاصل کرنے اور دنیا کے

تمام ملک فتح کرنے کا لالچ دیا اور پھر ہندوستان کے بادشاہ سے ایک عظیم الشان جنگ کرائی جس میں سیم یون کو فاش شکست ہوئی اور ہندوستان کے بادشاہ نے اُس کے ملک پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد شیطان تراس کے ملک میں ایک بڑے سوداگر کا بھیس بنا کر پہنچا۔ تراس لوگوں سے کام لیا کرتا تھا اور انہیں ہمیشہ بہت اچھی اجرت دیا کرتا تھا، مگر شیطان نے اُس سے زیادہ روپے خرچ کرنا شروع کیا۔ تراس نے اپنی رعایا کے دل میں روپے کی ہوس پیدا کر دی تھی، اور جب شیطان نے اُس سے زیادہ روپیہ دینے کا وعدہ کیا تو سب اُس کی نوکری چھوڑ کر بھاگ گئے۔ شیطان نے اُس کے ملک میں کھانے پینے کی سب چیزیں بھی خریدیں اور چند مہینوں میں یہ نوبت آگئی کہ تراس کے پاس روپے کے سوا اور کچھ نہ رہا، اور وہ بھوکوں مرنے لگا۔ ایک روز سیم یون اُس کے پاس آیا اور ہندوستان کے بادشاہ سے لڑنے کے لیے مدد مانگی۔ تراس نے کہا: ”میں تمہاری مدد کیا کروں؟ میں خود وودن سے فاقہ کر رہا ہوں“

اب شیطان اِوان کے پاس پہنچا اور اس کو سمجھایا کہ بادشاہ کو بغیر فوج کے نہ رہنا چاہیے۔ اِوان نے اُس سے فوج اکٹھا کرنے کی اجازت دیدی، لیکن اُس کی رعایا نے بھرتی ہونے سے انکار کر دیا۔ شیطان نے لوگوں کو دھمکی دی کہ اگر وہ بھرتی نہ ہوئے تو بادشاہ انہیں قتل کرادے گا۔ یہ سن کر لوگ بہت حیران ہوئے اور اِوان سے آکر کہنے لگے: ”آپ نے ایک افسر رکھا ہی، جو کہتا ہے کہ اگر ہم فوج میں بھرتی نہ ہوئے تو آپ ہمیں قتل کرادیں گے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ اِوان نے جواب دیا: ”میں احمق نہ ہوتا تو تمہیں بتا دیتا۔ مگر خود میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اکیلا

تم سب کو کیسے مار ڈالوں گا؟

شیطان نے دیکھا کہ یوں کام نہیں چلتا۔ اس لیے وہ ترکان کے بادشاہ کے پاس گیا اور اس کو اِوان سے لڑنے پر آمادہ کیا۔ لوگوں نے جا کر اِوان سے کہا: ہم نے سنا ہے کہ ترکان کا بادشاہ ہمارے ملک پر چڑھائی کرنے والا ہے۔ اِوان نے جواب دیا: ”اچھا، تو اُسے آنے دو۔“ ترکان کا لشکر جب اِوان کے ملک میں پہنچا تو اس کے مقابلے پر کوئی فوج نہیں آئی۔ لشکر کے سپاہیوں نے ٹوٹنا شروع کیا، تب بھی کسی نے روک ٹوک نہ کی۔ اِوان کی رعایا سب اُن سے کہتی تھی: ”ارے بیچارو، تمہارے گھر کھانے کو نہیں تو تم ہمارے پاس آ کر کیوں نہیں رہتے؟“ ترکان کی فوج آخر کار لوٹے لوٹے تھک گئی۔ یہ دیکھ کر اُس کے بادشاہ نے حکم دیا کہ سارے ملک میں آگ لگا دی جائے۔ یہ ترکیب بھی نہ چلی۔ اپنا گھر بار جلتے دیکھ کر اِوان کی رعایا میں بوڑھے بچے سب روتے تھے اور کہتے تھے: ”تم آخر یہ اچھی چیزیں برباد کیوں کرتے ہو؟ اگر تمہیں کسی چیز کی ضرورت ہے تو خوشی سے لے جاؤ۔“ اس انداز نے ترکان کے سپاہیوں کو تھوڑے دنوں میں غارت گری سے عاجز کر دیا۔ اور ایک ایک کر کے تمام سپاہی اپنے اپنے گھر بھاگ گئے۔

شیطان نے ایک اور چال چلی وہ نہایت نفیس کپڑے پہن کر اور بہت سا روپیہ لے کر آیا اور اِوان کی رعایا میں روپے کا لالچ پیدا کرنا چاہا۔ پہلے تو لوگوں نے چمکیلے سونے کے سکے دیکھ کر انہیں حاصل کرنا چاہا، اُن کے حاصل کرنے کے لیے محنت بھی کی، چیزیں بھی بیچیں، لیکن جب سب کے پاس بہت سے سکے

ہو گئے تو انہوں نے مانگنا چھوڑ دیا اور آخر میں یہ نوبت ہو گئی کہ شیطان اپنے چمکیلے
سکے لیے پھر تا تھا اور اُسے اُن کے بدلے میں کوئی چیز نہیں ملتی تھی۔ لوگ
کہتے تھے کہ مسیح کے صدقے کچھ خیرات مانگو تو ہم کھانے کو دیدیں گے، سونے کے
سکے ہمیں نہیں چاہئیں۔

تب شیطان نے لوگوں سے کہنا شروع کیا: ”تم بڑے بے وقوف ہو، تم
ہاتھ پیر سے محنت کر کے روزی حاصل کرتے ہو، تمہیں دماغ سے کام کرنا چاہیے۔ آد
میں تمہیں سکھاؤں کہ دماغ سے کیسے کام کرتے ہیں۔“ ادا ان کو یہ خبر ملی، اُس نے
کہا: ”ہاں ضرور سکھاؤ، ہمارے ہاتھ کام کرتے کرتے تھک جاتے ہیں۔ اگر ہم کبھی
کبھی دماغ سے بھی کام لے سکیں تو بہت اچھا ہوگا۔“ ادا ان کے ملک میں ایک
اوپنچا سا مینار تھا اور اُس نے یہ تجویز کی کہ شیطان اُسی پر کھڑے ہو کر تمام رعایا
کو اپنے دماغوں سے کام کرنے کی ترکیب بتائے۔ چنانچہ شیطان مینار کے اوپر
چڑھ گیا اور وہاں سے تقریر کرنے لگا۔ کچھ دیر تک سب بڑے غور سے سنتے
رہے، لیکن جب وہ سمجھ گئے کہ شیطان صرف بغیر محنت کیے روزی حاصل کرنے
کو ترکیبیں بتا رہا ہے تو سب اپنے اپنے گھر چل دیے۔ شیطان تین دن تک کھڑا
تقریر کرتا رہا، نہ کچھ کھایا نہ پیا، تیسرے دن اُس میں کھڑے رہنے کی بھی طاقت
نہ رہی اور وہ مینار کے زینے پر سے لڑھکتا ہوا نیچے آگرا۔ کچھ لوگ اُسے سنبھالنے
کے لیے پلکے، لیکن جیسے ہی وہ نیچے گرا، زمین بھٹ گئی اور وہ اُس میں سما گیا،
اور صرف ایک سوراخ دکھائی دیا۔

دوسرا قصہ جو بطور نمونہ پیش کیا جاتا ہے، مذہب اور پارسامی کی حقیقت

بیان کرتا ہے۔ پچھلے قصے کی طرح اسے بھی تالستانی نے عوام کی زبانی سن کر اپنی طرز پر لکھا ہے۔

تین زاہد

ایک مرتبہ ایک اسقف جاتریوں کے جہاز پر ایک خانقاہ کا معائنہ کر لے جا رہا تھا۔ راستے میں جہاز ایک جزیرے کے پاس سے گزرا، جس پر اسے معلوم ہوا کہ تین زاہد رہتے ہیں۔ لوگوں کی زبانی اس نے ان کے زہد و اتقا کے ایسے حالات سنے کہ اسے ان مقدس بزرگوں سے ملاقات کی خواہش پیدا ہوئی۔ جہاز کے افسر سے کہہ سن کر اس نے جزیرے پر جانے اور ان تین زاہدوں سے ملاقات کرنے کی اجازت حاصل کر لی اور افسر کے حکم سے چند ملاحوں نے اسے ایک چھوٹی کشتی پر سوار کر کے جزیرے تک پہنچا دیا۔ سمندر کے کنارے ہی پر اسے تینوں زاہد دکھائی دئے۔ وہ ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے کھڑے تھے اور جیسے ہی اس نے زمین پر قدم رکھا، تینوں نے جھک کر نہایت ادب سے اسے سلام کیا۔ ان میں سے ایک قدم بہت چھوٹا تھا، اس کی کمر جھکی ہوئی تھی اور ضعیفی سے اس کے بال سفید ہو کر سبز ہو چلے تھے، مگر اس عمر میں بھی اس کا چہرہ ایک دائمی تبسم سے روشن رہتا تھا۔ دوسرا قدمیں ذرا لمبا اور کافی سن رسیدہ تھا۔ اس کی ڈاڑھی کارنگا زردی مائل تھا اور وہ اس کے چوڑے سینے پر بکھری رہتی تھی۔ تیسرا قدمیں سب سے اونچا تھا۔ اس کی ڈاڑھی برف کی طرح سفید تھی، آنکھیں بھنودوں سے ڈھکی ہوئی تھیں اور چہرے پر کچھ جلالی کیفیت تھی۔ تینوں کے لباس میں بھی ایسا ہی فرق تھا۔ پہلا

اور سب سے چھوٹا، ایک بھٹی پُرانی پا دیوں کی عبا پہنے تھا۔ دوسرا میا نے قد والا، ایک کسانوں کے طرز کا کوٹ، تیسرا، جو سب سے لمبا تھا، تہہ کی جگہ ایک چٹائی پیٹے تھا۔

اسقف نے پہلے تینوں کو مغفرت کی دعا دی، جسے سن کر تینوں اُس کے سامنے زمین تک جھک گئے اور اُس کے بعد اسقف نے کہا: میں نے سنا ہے کہ تم تین خدا کے برگزیدہ بندے نجات حاصل کرنے کے لیے یہاں گوشہ نشین ہو اور خدا کے تمام بندوں کے لیے مغفرت کی دعا مانگتے رہتے ہو۔ میں بھی عیسیٰ مسیح کا ایک حقیر خادم ہوں اور خدا کے کرم سے دین عیسوی کے تمام پیروں کی نگہداشت میرے سپرد کی گئی ہے۔ میں تم تینوں سے ملنا چاہتا تھا، کہ اگر تم کچھ سیکھنا چاہو تو تمہیں سکھا دوں۔

تینوں بڑھے ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرائے، مگر خاموش رہے۔ اسقف نے پوچھا: ”اچھا یہ تو بتاؤ کہ تم خدا کے قہر سے بچنے کے لیے کیا کر رہے ہو اور اس کی خدمت کس طرح سے کرتے ہو؟“ میا نے قد والے زاہد نے ایک آہ بھری اور پتہ قد والے کی طرف دیکھا، اس نے مسکرا کر کہا: ”ہم کو نہیں معلوم کہ خدا کی خدمت کیسے کی جاتی ہے، ہم صرف اپنی لسراوقات کرتے ہیں۔“

”مگر تم خدا سے دعا کیا مانگتے ہو؟“ اسقف نے پوچھا۔

زاہد نے جواب دیا: ”ہم کہتے ہیں: تم بھی تین ہو، ہم بھی تین ہیں، ہمارے اوپر رحم کرو۔“ زاہد نے جیسے ہی یہ کہا، تینوں کی نظریں آسمان کی طرف اٹھ گئیں اور انہوں نے ایک ساتھ اپنی دعا دہرائی: ”تم بھی تین ہو“

ہم بھی تین ہیں، ہم پر رحم کرو۔“

اسقف مسکرایا: ”معلوم ہوتا ہے“ اُس نے کہا ”کہ تم نے تثلیث کے بارے میں کچھ سنا ہے۔ مگر تم جس طرح سے دعا مانگتے ہو وہ غلط ہے“ اور اس کے بعد اسقف نے انہیں وہ دعا سنائی جو حضرت عیسیٰ نے انجیل میں بتائی ہے، انہیں دین عیسوی کے عقیدے سمجھانے اور اُن سے کہا کہ یہ صحیح دعا سیکھ لو۔ زاہدوں کو دعا یاد کرنے میں بہت دشواری ہوئی۔ وہ خاموشی کے ایسے عادی ہو گئے تھے کہ اُن کے منہ سے الفاظ بڑی مشکل سے نکلتے تھے۔ جو سب سے لمبا تھا اُس کا منہ بالوں میں چھپ گیا تھا اور اُس کی آواز نہیں سنائی دیتی تھی، سب سے چھوٹے کے سارے دانت گر گئے تھے اور وہ الفاظ کا صحیح تلفظ نہیں کر سکتا تھا۔ اسقف جب تینوں کو دعا سکھا چکا تو شام ہو گئی تھی اور چاند نکل آیا تھا۔

جہاز پر واپس جا کر اسقف ایک کونے میں کرسی پر بیٹھ گیا اور خبریے کی طرف دیکھتا رہا۔ رات کا ایک پہر گزر گیا اور مسافر سب جا کر سو گئے، مگر وہ بیٹھا رہا ایک بارگی اُسے پانی کی سطح پر، جہاں چاند کی روشنی نے ایک رستہ سا بنا دیا تھا، کوئی سفید چمکیلی چیز نظر آئی۔ پہلے اُسے وہ کوئی دریائی پرند سمجھا، پھر جب وہ اور پاس پہنچی تو اُسے خیال ہوا کہ کوئی کشتی ہوگی۔ لیکن اُس کی رفتار جہاز سے بہت زیادہ تیز تھی، ایک منٹ میں وہ کہیں سے کہیں پہنچ گئی۔ اسقف کی کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا ہے اور اُس نے جا کر جہاز ران سے کہا۔ ”دیکھو جی، وہ کیا ہے، وہ کیا ہے؟“ اُس نے یہ سوال کئی بار پوچھا،

لیکن اب اُسے صاف دکھائی دے رہا تھا کہ وہی تین زاہد پانی پر دوڑے چلے آ رہے ہیں۔ اُن کے جسم سفید تھے، ڈاڑھیاں چمک رہی تھیں اور وہ جہاز کے نزدیک اس تیزی سے چلے آ رہے تھے کہ گویا جہاز کھڑا ہے۔

جہاز کے پاس پہنچتے ہی تینوں نے سر اٹھایا اور اسقف کو مخاطب کر کے بولے:

”خدا کے مہربان بندے، تم نے جو دعا ہمیں سکھائی تھی وہ ہم بھول گئے ہیں۔ جب تک ہم اُسے دُہراتے رہے وہ یاد رہی، لیکن ہم کھوڑی دیر دم لینے کے لیے رُکے تھے کہ کہیں سے ایک دو لفظ چھوٹ گئے، اور اب وہ ہمیں بالکل بھول گئی ہے۔ ہمیں پھر سے یاد کرا دو،“ اسقف نے سینے پر صلیب کا نشان بنایا اور اُن سے کہا:

”خدا کے برگزیدہ بندو، بھاری اپنی دعا خدا تک پہنچ جائے گی۔ تم خود ہم گنہگاروں کی مغفرت کے لیے دعا مانگو“

یہ کہہ کر اسقف اُن کے سامنے زمین بوس ہوا اور وہ واپس چلے گئے جہاں وہ نظر سے غائب ہوئے تھے اُس جگہ پر سویرے تک ایک روشنی سی چمکتی رہی۔

دوسرا باب

پہلی کوشش

ولاجی مر بادشاہ کی نعت کے عہد میں (۹۷۰ - ۱۰۱۵) مذہب عیسوی کا رواج
میں پرچار شروع ہوا اور مذہب کے ساتھ ہی تعلیم کا سلسلہ بھی جاری ہو گیا۔ اس
وقت تک اُن سلاطین کی جو روس میں آباد ہو رہی تھیں کوئی اپنی تحریری
زبان نہیں تھی اور بازنطینی کلیسا کے اُن مبلغوں اور سفیروں نے جو روسیوں کو عیسائی
بنارہے تھے سلاطین کی ایک شکل کو جو بلغاریہ کے اطراف میں بولی جاتی تھی اور
جس میں یونانی زبان کے الفاظ کثرت سے تھے اس نئے کلیسا کی باضابطہ زبان قرار دیا۔
انجیل کا اس زبان میں ترجمہ موجود تھا اور یوں انھیں طالب علموں کو یہ نئی زبان سکھانے
میں ایک آسانی بھی ہو گئی۔ کی نعت میں کلیسا کی بنیاد پڑتے ہی مذہبی بزرگوں کے
مقولوں، وعظوں اور خطوں کو نقل اور ترجمہ کرنے کی رسم جاری ہو گئی اور مذہبی رنگ
کی تصانیف کا ذخیرہ رفتہ رفتہ بڑھنے لگا۔

عیسائی مذہب کی اشاعت کے ساتھ جا بجا خانقاہیں قائم ہونے لگیں۔
جیسا کہ اور ممالک میں بھی ہوا ہے، روس میں رہبانوں نے اپنے زمانے کی یادگار

قائم رکھنے کے لیے وقایع نگاری شروع کر دی۔ نس تور کی تصنیف جو ۱۸۶۲ء سے ۱۱۱۰ء تک کے حالات بیان کرتی ہے وقایع نگاری کا پہلا نمونہ ہے۔ اکثر محققوں کی رائے ہے کہ نس تور دراصل ایک فرضی ہستی ہے اور اس کی تصنیف میں مختلف اجزا ہیں جن کی زبان اور طرزِ تحریر مختلف زمانوں اور مصنفوں کا پتہ دیتا ہے نس تور کی روس کے بہت سے رہبانوں نے پیروی کی اور اس وقت سے لے کر سترھویں صدی تک کی روسی تاریخ رہبانوں کے وقایع میں ملتی ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ ان وقایع نگاروں نے اصل واقعات لکھنے سے زیادہ اس شہر یا شاہی خاندان کی عظمت جتانے کا خیال رکھا جس سے ان کا تعلق تھا اور اس طرح سے اپنی تاریخی حیثیت بہت گرا دی۔ زبان کے روسے ان مصنفوں کی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے اس سلاف زبان کے بہت سے الفاظ استعمال کیے جو بول چال میں رائج تھی اور اگرچہ ان کی زبان الفاظ اور نحو کے لحاظ سے خالص روسی نہیں کہی جاسکتی، لیکن اس میں قومی عنصر اس قدر شامل ہو گیا تھا کہ وہ محض بازنطینی یا قدیم سلاف نہیں رہی۔

وقایع اور خالص مذہبی تصانیف کے علاوہ سوٹھویں صدی سے پہلے کی دو تاریخی داستانیں ہیں، ”ایگور کے حملے کی داستان“ اور ”زودن شچی نا“ جو بڑی حد تک اول الذکر کی نقل ہے۔ ایگور کے حملے کی داستان کی نعت کے بادشاہ ایگور کی پولوف ٹی نسل سے، جو روس کے جنوب مشرقی حصے میں آباد تھی، ایک لڑائی کا قصہ سنا تی ہے۔ ایگور جب اپنے ہاتھوں کو لے کر روانہ ہوا تو اس نے راستے میں بہت سی پڑشگونی کی علامتیں دیکھیں، لیکن اس نے ان کی مطلق پروا نہیں کی اور آگے بڑھتا چلا گیا۔ آخر کار پولوف ٹی کے لشکر سے مقابلہ ہوا، اور لڑائی

میں ایگور نے شکست کھائی، اگرچہ جنگ میں پرندے اور درندے روسی فوج کی اپنے اپنے طور سے مدد کر رہے تھے اور خود روسی بھی انتہائی بہادری اور جان فشانی سے لڑے۔ ادبی نقطہ نظر سے اس داستان کا جوہر ایگور کی ملکہ یاروسلافنا کا نوحہ ہے، جب وہ شہر پوتیفیل کی فصیل پر بیٹھی ایگور کا راستہ دیکھ رہی تھی اور اس کے دل میں ہر طرح کے اندیشے پیدا ہو رہے تھے۔

”یاروسلافنا کی آواز کوئل کی فریاد کی طرح گونجتی ہے۔ سورج نکلتے ہی گونجتی ہے۔“

”میں کوئل بن کر دریا کے کنارے کنارے اڑ کر جاؤں گی۔ میں اپنی سمور کی آستینیں کیا لاؤں یا میں بھگوؤں گی، ان سے اپنے شہزادے کے زخم دھوؤں گی۔ اپنے سورما کے کاری زخموں کو۔“

”یاروسلافنا پوتیفیل کی فصیل پر آہ وزاری کرتی ہے۔“

”درا می ہوا، بیدر ہو ہوا، میری آقا، تو اتنی تیز کیوں چل رہی ہے؟ تو اپنے ہلکے پردوں پر خانہ کے تیر کیوں اڑا کر لائی، کہ میرے سورما کی فوج پر گریں؟ کیا وہاں ارب پربادلوں میں اڑنے سے تیراجی نہیں بھرتا؟ سمندر پر جہازوں کو جھولا جھلانے میں جی نہیں لگتا؟ تو نے میرے پیارے کوزمین پر کیوں لٹا دیا؟“

”یاروسلافنا پوتیفیل کی فصیل پر آہ وزاری کرتی ہے۔“

”ایموشان دار دنیپر، تو نے چٹانوں بھری پہاڑیوں کو چیر کر پولوت ٹسی

لے پولوت ٹسی کا سردار آگے چل کر معلوم ہوتا ہے کہ اس کا نام کوبیاک تھا۔

لکھ جنوبی روس کا ایک دریا۔

کے ملک تک اپنا راستہ بنایا ہے۔ تو سفیا تو سلاف کی کشتیوں کو لے گیا تھا، جب وہ کو بیاک خان سے لڑنے گیا۔ آہ، میرے آقا، میرے شوہر کو میرے پاس بھیس پہنچا دے اور میں تیرے دھارے میں سمندر کی طرف اپنے آنسو بہانا چھوڑ دوں گی۔

”یاد سلافنا پوتفل کی تفصیل پر آہ وزارتی کرتی ہے۔“

”ادامی روشن سورج، امی چمکتے دکتے سورج! تو اپنی گرمی سب تک پہنچاتا ہے، سب کے لیے چمکتا ہے۔ تو نے اپنی جلتی ہوئی گرمی میرے شوہر کے جوانوں پر کیوں برسی تو نے ان خشک میدانوں میں ان کے ہاتھوں میں ان کی کمانیں کیوں سکھا دیں؟ تو ان کو پیاسا کیوں کرتا ہے، ان کے تیروں کمان کے کندھوں پر بھاری کیوں کر رہا ہے؟“

”ایگور کے حملے کی داستان“ بارہویں صدی کے آخر یا تیرھویں کے شروع میں تصنیف کی گئی اور ”زردن شچی نا“ روسیوں اور تاتاریوں کی ۱۳۷۰ کی ایک لڑائی کا بیان ہے۔ یہ زمانہ اس قسم کی داستانوں کے لیے موزوں تھا اور غالباً یہ دو یادگاریں جو محفوظ رہیں اپنی جیسی بہت سی مثالیں رکھتی ہوں گی۔ لیکن پندرھویں، سولھویں اور تیرھویں صدی میں کلیانے، اس خیال سے کہ ایسی کہانیاں بے دینی کا باعث ہوتی ہیں، لوگوں سے ان کی یاد بھلانے کی بہت سخت کوشش کی اور عوام کے گیتوں کی طرح یہ بھی کٹر مذہب کے بھینٹ چڑھیں۔ روسی ادب کو اس طرح سے جو نقصان پہنچا اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔

تیرھویں صدی میں تاتاریوں کے گشت و خون کے بعد ماسکو کی ریاست کا

لہ ایگور کا دوسرا نام ہے۔

لہ کر د پوت کن: ”روسی ادب“

عروج ہوا اور اس کے ساتھ ہی وہ شگفتگی جو روسی قوم اور اس سے قبل کی تصنیف
 اور گیتوں وغیرہ میں پائی جاتی ہے، بالکل ناپید ہو گئی۔ وقایع نگاری تک کا اندازہ
 بدل گیا۔ ٹوٹ گورود، ولاجی مر، پسکوف اور دوسرے بڑے شہروں کے وقایع
 نگار جو اپنی مقامی زندگی سے بے حد دلچسپی ظاہر کرتے تھے ماسکو کی ریاست کے
 گن گانے میں مصروف ہو جاتے ہیں اور روکھے سوکھے واقعات کے سوا کچھ نہیں
 لکھتے۔ سوٹھویں صدی میں پادری سلووتر کی کتاب "گھر کا نظام" زار اوان چہام
 اور اس کے باغی امیر گرب سکی کے خطوط اور گرب سکی کی ایک تاریخ روس اس
 دور کی ادبی یادگاریں ہیں جو تیرھویں صدی سے شروع ہوا اور اٹھارھویں صدی
 میں پیٹر اعظم کی اصلاحوں کی بدولت آخر کار ختم ہوا۔ سلووتر کی تصنیف ادب سے
 زیادہ روسی معاشرت کی تاریخ میں اہمیت رکھتی ہے۔ اس میں روسی گھر گہستی
 والوں کو طرح طرح کے مشورے دیے گئے ہیں اور عیسائی مذہب کے مطابق
 ان کے جو حقوق و فرائض ہیں وہ سب سمجھائے گئے ہیں۔ روسی عورتیں اس کتاب
 کے نام سے جلتی ہیں، کیونکہ اس میں شوہروں کو اجازت دی گئی ہے کہ بد مزاجی یا
 نافرمانی کی سزا میں اپنی بیویوں کو مارا کریں۔ کتاب کے مصنف نے تاکید کر دی ہے
 کہ ایسی چیز سے نہ مارنا چاہیے کہ بیوی کے زخم پڑ جائیں یا ہڈی پسلی ٹوٹ جائے
 نہ ایسی جگہ پر کہ ہمت سے اس کے رونے پیٹنے کی آواز سن سکیں، مگر معلوم ہوتا ہے
 یہ تاکید روسی عورتوں کے لیے باعث تسلی نہیں ہوئی ہے۔ "گھر کے نظام" کے
 علاوہ اس صدی کی دوسری ادبی یادگاریں زار اوان اور گرب سکی کے خطوط بھی
 "گھر کے نظام" کی طرح صرف ضمناً ادب میں شامل کیے جاسکتے ہیں، کیونکہ زار

اور اس کے باغی امیر کے درمیان سیاسی مسائل پر بحث ہوئی تھی اور دونوں نے نہایت بھونڈی، بھدھی اور پچیدہ زبان میں اپنے خیالات ادا کیے، اگرچہ زار اوان کی عبارت میں اس کی طبیعت کے زور اور قوت کا کچھ عکس نظر آتا ہے۔ گربسکی کی تاریخ روس اوان کے مظالم کی داستان سنلنے کی غرض سے لکھی گئی تھی۔ زبان اور طرز تحریر کی رو سے اس کی کوئی وقعت نہیں۔

پٹر اعظم (۱۶۸۲ - ۱۷۲۵) نے روسی ذہنیت پر دینی کے بجائے دنیاوی رنگ چڑھانا اپنی زندگی کا ایک اہم مقصد قرار دیا تھا اور یہ اسی کی اصلاحوں کا نتیجہ تھا کہ روسی ادب کو کلیسا کے پنجے سے رہائی ملی۔ اس کی تحت نشینی کے ساتھ جس طرح روسی ریاست نے اپنا جنم لیا ویسے ہی روسی ادب میں بھی نئی جان پڑ گئی۔ اس زبان کی جس نے انیسویں صدی میں اپنے جوہر دکھائے، اس ذہنیت کی جس میں روسی تخیل نے پرورش پائی، اس معاشرت کی جو روسی قوم نے بالآخر اختیار کی، پٹر اعظم کے عہد میں بنیاد ڈالی گئی اور صحیح معنوں میں روسی ادب کی تاریخ اسی زمانے سے شروع ہوتی ہے۔ پٹر اعظم کو ادب سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی، لیکن اسے یقین تھا کہ تعلیم کے بغیر اس کی اصلاحیں بالکل سطحی رہیں گی اور ان میں مطلق استحکام نہ ہوگا، اس وجہ سے اس نے روسی زبان کی طرف بہت توجہ کی۔ اس نے روسی ابجد میں ترمیم کرائی، عربی ہندسے رائج کئے اور ملک میں علم کو فروغ دینے کے لیے درجنوں فرانسیسی اور جرمن کتابوں کے ترجمے کرائے اور کئی خود بھی کیے۔ روسی عوام اور شرفا کی رائے عموماً حدت اور اصلاح کے خلاف

لے موجودہ ہند سے عربوں نے رائج کئے اور اس وقت یورپ میں جو ہندسے مستعمل ہیں اسی وجہ سے عربی کہلاتے ہیں

تھی، لیکن جیسا کہ کوتوشی خن (۱۶۳۰-۱۶۶۷) اور کری تراچی کی تصنیف سے ظاہر ہوتا ہے، روس میں پیٹر اعظم سے پہلے بھی اصلاح اور ترقی کے حوصلہ مند موجود تھے۔ خود پیٹر کو ایک ایسا حامی اور مشیر ملا جو علمی اور ادبی قابلیت کے لحاظ سے روس میں یکتا تھا، یعنی نے وفان پرد کو پوویچ (۱۶۸۱-۱۷۳۶) نوٹ گوردو کا اسقف۔ وہ بہترین مقرر تھا اور اس کی تصانیف، جن میں ایک دو ڈرامے بھی شامل ہیں، بہت جوشیلی اور ایک نئی زندگی کی امیدوں سے لبریز ہیں۔ پیٹر اعظم کا ہم عصر ایک اور خود آموختہ انشا پرداز تاجر پولوش نیکون تھا، جس نے اپنی تصانیف میں ریاست کو قوم کی اصلاح کرنے کی ترغیب دلائی اور بادشاہ کو معاشیات کے صحیح اصول سمجھانے کی کوشش کی۔

مضن اس وجہ سے کہ وہ اپنی کمی اور کمزوری محسوس کرتے تھے، پیٹر اعظم اور قومی اصلاح کے حامیوں نے انشا پردازی کا ہتھیار اٹھایا اور اسی کو اپنے خیالات کی تبلیغ کا ذریعہ بنایا۔ لیکن شروع میں نہ تو یہ ہتھیار ایسا تھا کہ اس کے وار کارگر ہو سکیں، نہ اسے استعمال کرنے والے ایسے ماہر کہ اس کی خامیاں دور کر سکیں۔ ابجد کی اصلاح اور بیرونی زبانوں کے ترجموں نے صرف ایک ہی مشکل حل کی، روسی انشا پردازوں کو ابھی بہت سی دشواریوں کا سامنا کرنا تھا، بہت سے مرحلے طے کرنا، جن میں سب سے پہلا اپنے فن کو سیکھنا اور سکھانے کے لیے استاد تلاش کرنا تھا۔ روسی زبان میں بھی نازک احساسات اور خیالات ادا کرنے کی صلاحیت نہ تھی، اس لیے کہ وہ ابھی تک قدیم سلاط اور مختلف عوام کی بولیوں کا ایک بے ترتیب مجموعہ تھی، جس میں تقریباً ہر ملک کے الفاظ اور محاورے بھی

شامل ہو گئے تھے۔ اس پر طرہ یہ تھا کہ صرف و نحو کے کوئی قواعد بھی نہیں تھے جن کے مطابق اصلاح کی جاسکے۔ قدیم سلاف زبان کے اصول ترک کر دیے گئے تھے، کیونکہ ان میں جدید مضامین بیان کرنے کا امکان نہ تھا اور نئی روسی زبان کے قواعد ابھی معین نہیں ہوئے تھے۔ یوں روسی انشا پردازوں کی پہلی کوششیں زبان کو درست کرنے اور جدید اسلوب کے لیے موزوں بنانے میں صرف ہوئیں روسی انشا پردازی کو خود مختار بننے کے لیے بڑے عرصے تک شاگردی اختیار کرنا پڑی اور اس کے استاد فرانسیسی شاعر، نثر اور نقاد تھے؛

روسی ادب کے اس دور کی چار ہستیاں یہ خاص اہمیت رکھتی ہیں کہ انہوں نے جدید انشا پردازی کی بنیاد ڈالی اور اپنی کوششوں سے دوسروں کی مشکلاتیں قدرے آسان کر دیں۔

نواب آنت یوخ کان تے مر (۱۷۰۹-۱۷۴۴) مول داویا کے ایک امیر کالر کا تھا جس نے روس میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ کان تے مرنے ماسکو میں جدید طرز پر تعلیم پائی تھی اور شروع ہی سے پیٹر اعظم کی اصلاحوں کا حامی تھا۔ جب پیٹر اعظم کے انتقال کے بعد قدامت پسند جماعتوں نے اس کی تمام جدتوں اور اصلاحوں کو رد کر دینے کا ہتھیہ کیا تو کان تے مرنے ان کی عملی اور تحریری مخالفت

لے آؤس ملوف سکی: "روسی ادب"

۱۷ روسی لقب "کنیاز" کا ترجمہ اکثر "پرنس" یعنی شہزادہ کیا جاتا ہے؛ یہ ترجمہ غلط ہے، اور چونکہ اردو میں خاص طور سے غلط فہمی کا اندیشہ ہے اس لیے اس کا ترجمہ "نواب" کیا گیا ہے، جو عہدے اور درجے کے لحاظ سے زیادہ صحیح بھی ہے۔

کی، لیکن اس کی شخصیت ایسی نہیں تھی کہ وہ کوئی خاص اثر پیدا کر سکے۔ اسے
 اپنی قوم کی گمراہی اور قومی رہبروں کی تنگ نظری سے جو صدمہ پہنچا وہی اس
 کی تصانیف کا محرک تھا اور اسی کی وجہ سے اس کی تصانیف مانتی ہیں یا طنز ہے۔
 اس کی سب سے قابل قدر ادبی یادگار ایک طنزیہ نظم ہے جس میں اس نے نئی روشنی
 کے مخالفوں اور ان کی ذہنیت کی ایک مضحکہ خیز تصویر کھینچی ہے۔ نظم کے ”ہیرو“ ایک
 رہباں کرسی توں اور تین رئیس، سلوان، لوکا اور مے دور میں۔ چاروں نئی
 روشنی اور جدید تعلیم کے مسئلے پر اپنے خیالات ظاہر کرتے ہیں۔ کرسی توں کہتا ہے:-
 ”فرقہ بندیاں اور اسکا د، یہ علوم کی اولاد ہوتے ہیں؛

جو سب سے زیادہ غور کرتا ہے وہی جھوٹ بھی سب سے زیادہ بولتا ہے۔
 جو کتابیں پڑھتا ہے خود بخود اپنا دین کھو بیٹھتا ہے۔

جسے دیکھو باتیں بناتا ہے، ہر بات کی وجہ، دلیلیں مانگتا ہے،
 اور کلیسا کے عہدہ داروں کا ادب نہیں کرتا ہے۔

لوگوں کے اخلاق گر گئے ہیں، کوئی کو اس لئے نہیں پیتا۔
 کیا مجال ہے کوئی بھونا گوشت چھو بھی لے۔

سلوان علوم پر دوسرا الزام لگاتا ہے۔
 ”تعلیم ہم کو فاقے کراتی ہے۔ اس سے قبل

جب ہم میں سے کوئی لاطینی زبان نہیں جانتا تھا۔
 ہم بڑے عیش و آرام سے زندگی بسر کرتے تھے۔

لہ پھلوں کا منشی شربت جو روس میں کثرت سے پیا جاتا ہے۔

جہالت میں ہمارے پاس روٹی افراط سے تھی: اب ہم نے
پرانی زبانیں سیکھ کر اپنی روٹی گنوا دی ہے۔

بحث مباحثہ، الفاظ میں اگلے پھلے کا فرق کرنا، کمینوں کا کام ہے:
شریف آدمی تو بس کرک کر "ہاں" کہتے ہیں یا گرج کر "نہیں"۔

کان تے مر کی نظم پڑھنے سے ان دشواریوں کا اندازہ ہوتا ہے جو اس زمانے میں
روسی انشا پر داری کو درپیش تھیں۔ وہ عروض کے کسی خاص قاعدے کی پابندی
نہیں کرتا، اس کی نظم کہیں مرجز ہے کہیں موزوں، محض اس وجہ سے کہ اس وقت
تک روسی نظم کے قواعد معین نہیں ہوئے تھے۔ اس کی زبان بھی کہیں بھاری
اور پُرانے طرز کی ہے، کہیں پر ایسی روزمرہ جس پر بازاری ہونے کا شبہ ہوتا ہے اور
اس معاملے میں اس پر کوئی الزام بھی نہیں لگایا جاسکتا، کیونکہ روس میں دراصل
ابھی تک کوئی ادبی زبان تھی ہی نہیں۔ عروض اور زبان کے قواعد بنانے کی
خدمت تریج یا کوف سلی اور لومونوسوف، دو عالموں نے انجام دی۔

وسیلی کیریل لوویج تریجیا کوف سلی (۱۷۰۱ - ۱۷۶۹) اپنے زمانے کے

بہترین عالموں میں سے تھا۔ اسے علم کا اتنا گہرا شوق تھا کہ ماسکو کے دارالعلوم سے
فارغ التحصیل ہو کر وہ پیدل بھیک مانگتا ہوا پیرس گیا اور وہاں مختلف شرفا
کی سرپرستی میں پڑھتا رہا۔ وطن واپس ہونے پر اس کے ادبی ذوق کی خبر ملکہ ٹیمک

لے جس طرح نثر مرجز میں قافیہ نہیں ہوتا، وزن ہوتا ہے، اسی طرح عروض کے اس قاعدے
میں قافیہ نہیں ہوتا اور الفاظ کے ارکان کے مطابق وزن ہوتا ہے۔ فرانسیسی نظم میں بھی قافیہ راج ہے

لے ملکہ ای لی زوے تا پتر دفنا (۱۷۴۱ - ۱۷۶۱)

پہنچی، دربار میں اس کی رسائی ہوگئی اور رواج کے مطابق اسے خاص خاص موقوفوں پر نظمیں پڑھنے کا حکم ملنے لگا۔

فرانسیسی شاعروں کی نقل میں روسیوں نے بھی مرجز نظمیں لکھنا شروع کر دیا تھا، ترجیا کوفسکی نے یہ ثابت کر دیا کہ روسی زبان کی خصوصیات دیکھتے ہوئے نظم کو موزوں کرنے کا قاعدہ اختیار کرنا بہتر ہوگا، گو وہ نظمیں جو اس نے اپنا نظریہ ثابت کرنے کے لیے یا ملکہ کی فرمائش پر لکھیں نہایت مہمل تھیں۔ موزوں نظم رائج کرانے کے علاوہ ترجیا کوفسکی نے روسی علم نحو میں بہت قابل قدر اضافہ کیا اور یہ بڑی حد تک اسی کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ روسی نحو کے قواعد بہت جلد ایک مستقل اور معین شکل میں مدون ہو سکے۔ ان علمی خدمات کے ساتھ ہی روسی ادب پر اس کا ایک اور احسان یہ بھی ہے کہ سب سے پہلے اسی نے تعلیم یافتہ روسیوں کو ان کے ادب العوام کی طرف متوجہ کیا اور انہیں اس کی خصوصیات اور خوبیاں سمجھاتیں۔ اس موضوع پر اس کے چند بہت اچھے مضمون اب تک موجود ہیں۔

می خائل ویٹیل یوچ لومونوسوف (۱۷۱۲-۱۷۶۵) ایک خوش حال کسان کا لڑکا تھا۔ بچپن ہی سے اس نے غیر معمولی قابلیت کا ثبوت دیا اور شوق نے اسے علم کی جستجو پر ایسا مجبور کیا کہ سترہ سال کی عمر میں وہ اپنا پیدائشی شہر آرخانگل چھوڑ کر ماسکو چلا گیا۔ یہاں اسے شروع میں بہت مصیبتیں اٹھانا پڑیں، لیکن رفتہ رفتہ اس نے اپنی استعداد تسلیم کرالی اور جب وہ ماسکو کے دارالعلوم سے سند حاصل کر چکا تو ریاست کی طرف سے اسے جرمنی جا کر اپنے

علمی حوصلے پورے کرنے کے لیے وظیفہ مل گیا جرمنی سے علم کا وہ نہایت وسیع اور ہمہ گیر ذخیرہ لے کر روس واپس ہوا۔ آؤئی لڑ، جرمنی کے مشہور عالم ریاضیات نے اس کے بارے میں لکھا ہے کہ علوم طبعی اور کیمیا میں اس نے جو کام کیا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بہت غیر معمولی ذہانت کا عالم تھا معدنیات اور طبعی جغرافیہ میں بھی اسے بہت ملکہ تھا، اور ان علوم کے علاوہ وہ ادب اور لسانیات کا بھی ماہر تھا۔ شاعر لپشکن نے بہت بجا کہا ہے کہ لومونوسوف پہلا روسی دارالعلوم تھا؛

لومونوسوف کی ذات سے روسی ادب کو جو فائدہ ہوا اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ اس نے روسی زبان کو کلیسا کی سلاطت زبان سے بالکل علیحدہ کر دیا، اور اسے سلجھانے اور صاف کرنے کا سلسلہ جو پیٹر اعظم کے زمانے سے شروع ہوا تھا اپنی کوششوں سے تکمیل کو پہنچایا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے بیرونی زبانوں سے الفاظ اخذ کرنے اور انہیں اپنانے کے لیے قواعد بنائے اور نئی روسی زبان کے قواعد صرف و نحو ایک کتاب کی شکل میں شایع کیے جو اب تک سندھانی جاتی ہے۔ ان اصولوں کے مطابق اس نے طبع آزمائی بھی کی۔ معاصرین اسے بہترین یونانی اور رومی کلاسیکی شاعروں کا ہم پلہ قرار دیتے تھے اور گو اس رائے میں بہت مبالغہ معلوم ہوتا ہے، پھر بھی اتنا ضرور ہے کہ روسی شاعر، خصوصاً انیسویں صدی کے نصف اول میں اسے استاد مانتے رہے اور اس کی نظمیں زبان اور محاورے کے لحاظ سے بہت اعلیٰ ہیں۔ لیکن لومونوسوف دراصل عالم تھا، باوجود اس کی فصاحت اور بلاغت کے ہمیں اسے شاعر کی حیثیت سے نہیں جانچنا چاہیے۔ اس کے زمانے کی تعلیمی حالت ایسی تھی کہ جو شخص تک بندی کر لیتا اسے عام رائے شاعر بنا دیتی تھی

اور لوگوں کو اس طرح زبردستی کے شاعر بنانے میں خود دربار بہت پیش پیش رہتا تھا۔ اس قدر دانی سے روسی انشا پر دازی کی کسی قدر ہمت افزائی تو ضرور ہوئی، لیکن اس بات پر افسوس ہوتا ہے کہ اس قدر دانی کی وجہ سے لومونوسوف جیسے عالم نے درباری شاعر بن کر اپنا وقت ضایع کیا اور روس میں علوم اور فنون کو فروغ دینے پر اپنی پوری قوت صرف نہ کر سکا۔

لومونوسوف کی نظمیں تعداد میں بہت ہیں، مگر ان میں سے اکثر دربار کی فرمائش پر لکھی گئی تھیں اور ان میں کوئی خاص خوبی نہیں۔ اس کے کلام کا بہترین حصہ چند نظمیں ہیں جو اس نے حمد میں لکھیں۔ ”حمد سحر گاہی“ کا ایک بند ملاحظہ ہو۔

”یہ ہیبت ناک کرۂ آتشیں تیرے نزدیک ایک چنگاری ہے۔
ہاں، جب تو اس چراغ کو روشن کرتا ہے، کہ تیری مخلوق،
جسے تو نے اپنے شوق سے بنایا، جسے تو اپنی رحمت سے زندہ رکھتا ہے،
محنت کر سکے اور اپنی حاجتیں پوری کرے،

تو کوہ اور دشت، صحرا اور دریا

رات کی تاریکی سے نجات پاتے ہیں؛

ہماری نظروں کے سامنے تیری کائنات کا منظر

بے پردہ ہو جاتا ہے اور تیرے کرشمے دیکھ کر

ہمارے دلوں سے خود بخود آفریں کی صدائیں نکلتی ہیں؛

”بے شک ہمارا خدا احسن الخالقین ہے!“

اس نظم سے ظاہر ہوتا ہے کہ لومونوسوف کے وقت تک روسی شاعری نے

بہت کم نشوونما پائی تھی، لیکن لومونوسوف کے کلام میں بڑی خوبی اس کی پائی ہے۔ اس نے کلاسیکی شاعری کو اپنا معیار قرار دیا تھا اور اکثر اس کی پیروی کرتا تھا، مگر اس کی شاگردی میں بھی ایک متانت تھی جو اس کے معاصرین میں بہت کمیاب تھی خواہ وہ انشا پر داری میں طبع آزمائی کرتے ہوں یا نہ کرتے ہوں۔ اس سجا تقلید کی کی جو اس زمانے میں روسی ذہنیت کا ایک روگ بن گئی تھی الگ سے ہی ترویج سواروکوف (۱۷۱۸-۱۷۷۷) ایک عبرت انگیز مثال ہے۔ سواروکوف کو روس کا پہلا ڈراما نویس ہونے کا فخر حاصل ہے۔ اس نے نوالیہ اور تقریباً پچاس فرجیہ ڈرامے لکھے، جن میں سے اس کے الیہ ڈرامے خاص طور سے مقبول ہوئے۔ اس نے فرانس کے مشہور ڈراما نویس کورنئی، رسین اور مولییر کا بہت گہرا مطالعہ

لی۔ پیٹرکورنئی (۱۶۰۶-۱۶۸۴) فرانسیسی ڈراما نویس کا بانی۔ اس کے ڈراموں کے اشخاص قدیم یونان اور روما کے مشابہ ہیں، مگر ان کے کیرکٹروں میں فرانسیسیت کی آمیزش بھی ہے۔ کورنئی کا موضوع عموماً اعلیٰ اور ادنیٰ جذبات کی جنگ ہے اور اس کے کیرکٹروں میں جیتے جاگتے انسانوں کے عکس نہیں بلکہ مختلف اخلاقی خصوصیتوں کے مجسمے ہیں۔

۱۷۳۹-۱۶۹۹) نے بھی کورنئی کی طرح قدیم یونان اور روما کی شخصیتوں کو اپنے ڈراموں کے اشخاص بنایا۔ کورنئی کے مقابلے میں اس کے پلاٹ بہت سلیجے ہوئے ہیں اور اسے زبان میں بھی زیادہ ملکہ ہے۔

۱۷۲۲-۱۶۷۳) فرجیہ ڈراما نویسوں کا سربراہ مانا جاتا ہے۔ زبان اور محاورے کی رو سے اس کی عظمت رسین سے کچھ کم نہیں اور اس کے ڈراموں میں ایک حقیقت نگاری ہے جو اپنا جواب نہیں رکھتی۔ اس کے اکثر کیرکٹروں میں ضرب المثل بن گئے ہیں۔

کیا تھا اور اپنے ڈراموں میں زیادہ تر ان استادوں کی نقل اتارنے کی کوشش کی۔ یہ استاد خود، خصوصاً رسین اور کورنے کی تصنع اور مردہ قواعد کے بندے تھے، سو مارو کوف نے ان کی نقل کر کے اپنی طبیعت اور مذاق کے ظاہر ہونے کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑی اور یہی اس کی تصانیف کی سب سے نمایاں خامی ہے۔ معاصرین اس کے بلند پرواز نظریہ بیان اور دقیق فلسفے سے بہت مرعوب ہوتے تھے، لیکن اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ ان کا معیار بہت گرا ہوا تھا اور چونکہ وہ سمجھتے تھے کہ جس کسی نے فرانسیسی انشا پردازوں کی کامیابی سے نقل اتار لی وہ عروج کی انتہا تک پہنچ گیا، انھیں سو مارو کوف کی ناقابل برداشت تصنع اور خیالات کی کھلی چوری سے شکایت نہیں ہوتی تھی۔

آخر عمر میں سو مارو کوف کو معلوم ہوا کہ اس کی طبیعت ڈراما نویس کے لیے اتنی موزوں نہیں جتنی کہانیاں لکھنے اور طنز یہ شاعری کرنے کے لیے۔ اس کے کلام کا یہ حصہ اس کے ڈراموں کے مقابلے میں بہت کم ہے، مگر ادبی خوبیوں کے لحاظ سے اس کے ڈراموں سے بہت بہتر ہے۔ سو مارو کوف خود اس پر افسوس کرتا تھا کہ اس کا اصل ہنر اس کی نظروں سے اتنے عرصے تک چھپا رہا۔ یہ بجا تقلید کی سزا تھی اور اس سزا کا ملنا انصاف کا تقاضا تھا۔ لیکن خطا سو مارو کوف کی نہیں بلکہ اس کے ماحول، یعنی عام روسی ذہنیت کی تھی۔

پیر اعظم کے مرنے کے بعد تعلیم یافتہ لوگوں کی تعداد بڑھتی گئی، مگر اس تعلیم سے ان کی ذہنی نشوونما مطلق نہیں ہوئی۔ جیسا کہ نووی کوف نے اپنے ایک رسالے میں لکھا ہے، اس زمانے کے بہت سے ”جاہل شریف زادوں“ کا خیال تھا کہ

”علم حاصل کیے بغیر بھی آدمی تعلیم یافتہ ہو سکتا ہے“ لوگوں کے دلوں میں ایسے اعلیٰ
 حوصلے نہیں تھے جو وہ تعلیم کے ذریعے سے پورے کرتے اور عام مذاق کو راہِ راست
 پر لانے والا کوئی رہنما بھی نہیں تھا۔ قدیم روس میں پڑھے لکھے لوگ کم تھے، کتابیا
 بہت کم تھیں اور وہ بھی خالص مذہبی۔ پیٹر اعظم نے ریاست کے تمام ملازموں
 کو اپنا علمی ذخیرہ بڑھانے پر مجبور کیا اور مطالعے کی وہ حدیں جو کلیسا نے مقرر کی تھیں
 بالکل توڑ دیں۔ اس کی کوششوں کا نتیجہ یہ تو ضرور ہوا کہ روس میں جہالت پہلے
 کی طرح فخر کی بات نہیں رہی، ”لوگ کتابوں کو دیکھ کر اس طرح نہیں جھجکتے تھے
 جیسے دوا فروش کی دوکان دیکھ کر“ اور کتب بینی کی رسم بھی ایک مجبوری کے طور پر
 تسلیم کر لی گئی۔ لیکن ریاست کے دباؤ یا ملازمت کے لیے امتحان پاس کرنے کی
 شرط سے علمی ذوق نہیں پیدا ہو سکتا تھا۔ ملازمت کے امیدوار اپنا مطلب
 حاصل کرنے کی غرض سے تھوڑا بہت پڑھ لیتے تھے مگر وہ معلومات جو اس وقت
 تک کی ترجمہ کی ہوئی کتابیں بہم پہنچا سکتی تھیں بہت کم تھیں اور خاص خاص
 لوگوں کے سوا ان سے کسی اور کو دلچسپی نہیں ہو سکتی تھی۔ تعلیم پھیلنے کا پہلا اثر یوں
 ظاہر ہوا کہ پڑھے لکھے لوگوں کو، جن میں عورتیں اور لڑکیاں بہت پیش پیش تھیں،
 عشقیہ گیتوں کا چسکا لگا اور ان گیتوں نے انھیں ادنیٰ جذبات پرست ڈراموں اور
 شہوت انگیز ناولوں کی قدروانی کے لیے تیار کر دیا جو یورپ کے مختلف ممالک
 اور خصوصاً فرانس میں اس وقت ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں لکھے اور پڑھے
 جاتے تھے۔ ”علم اور ادب لطیف، جنھیں متحد ہو کر زندگی کے مسائل کو سمجھانا اپنا
 خاص مقصد بنا نا چاہیے، ان لوگوں کی نظروں میں ایک دوسرے کے جانی دشمن

ہو گئے اور ان لوگوں نے یہ فیصلہ کیا کہ تعلیم کے گراں اور تلخ جزو کو الگ کر کے اسے خالص مسرت کا ذریعہ بنانا ممکن ہے اور انھیں ایسا کرنا بھی چاہیے، چنانچہ ناولوں کے چرچے کے ساتھ علم کی وقعت گھٹتی گئی، لوگ انسانیت کے فرائض، تہذیب اور شائستگی کی لوازمات سے بیگانہ ہوتے گئے اور لذت پرستی کے سوا انھیں اپنی زندگی کا کوئی مصروف نظر نہیں آیا جسے وہ قابل توجہ سمجھتے۔ یہ لذت پرستی جسمانی سے زیادہ ذہنی تھی اور اس نے ان کے تصور میں زندگی کا نقشہ بالکل بگاڑ دیا۔ ناول نے ان میں حقیقت بینی کی صلاحیت باقی نہیں رکھی اور جیسے بچوں کو ان کے گڈے گڑیا پتھر کے آدمی معلوم ہوتے ہیں، ان لوگوں کے نزدیک ناولوں کی خیالی دنیا میں محو ہونا تجربہ حاصل کرنے اور زندگی کا مشاہدہ کرنے کے برابر ہو گیا۔ لٹریچر کی ہیر و من تفتیانہ کی طرح وہ سب رچر ڈسٹن اور روسو پر جان دینے لگے۔۔۔ بیرونی ممالک کے ان شرفاء کو جنہوں نے روس میں سکونت اختیار کی تھی، روسی سوسائٹی کے اعلیٰ طبقوں میں اکثر ایسی سگیات اور شریف زادیوں سے ملنے کا اتفاق ہوتا تھا جو چار پانچ بیرونی زبانیں بول سکتی تھیں، موسیقی میں اچھی استعداد رکھتی تھیں اور فرانس، انگلستان اور اطالیہ کے سربراہان اور ناول نویسوں کی تصانیف کا مطالعہ کر چکی تھیں۔ لیکن اس مطالعے کو ایسے علمی ذوق کی طرف منسوب کرنا مشکل ہے جو غور و فکر کی ترغیب دلاتا ہے۔۔۔

آہ کلیوجن سکی: "مضامین اور تقریریں"

۱۷ لٹیکن کا ذکر روسی شاعروں کے سلسلے میں آگے آئے گا۔

۱۸ رچرڈسن (۱۶۸۹-۱۷۶۱) انگریزی ناول نویس۔ ٹرانزک روسو (۱۷۱۲-۱۷۷۸) فرانسیسی الشاپر داز۔

”عین اس وقت جب جذبات پرست اور شہوت انگیز ناولوں کا دورہ دورہ تھا، آزاد خیالی کے فلسفے کا اثر روسی سوسائٹی میں سرایت کرنے لگا۔ یورپ کے کسی ملک میں یہ فلسفہ اپنی بڑی صورت میں اس طرح نہیں نظر آتا جیسے روس میں... ملکہ کیتھرین (۱۷۶۲-۱۷۹۶) کی تخت نشینی کے وقت روس میں ایسے سمجھ دار اور خیر اندیش مدبر موجود تھے جو اصلیت سے واقف تھے اور جانتے تھے کہ اس فلسفے سے ریاست، قانون اور عام زندگی کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے... لیکن عام لوگوں میں یہ فلسفہ اس وجہ سے نہیں مرغوب ہوا کہ انھوں نے نئی زندگی تعمیر کرنے کے منصوبے باندھے تھے بلکہ اس وجہ سے کہ وہ انھیں اپنی قوم کی ذہنیت اور اپنے ماحول پر نکتہ چینی کرنے میں مدد دیتا اور نکتہ چینی میں چٹا پٹا پکا پیدا کر دیتا تھا۔ روس کے جدید ترین طرز پر تعلیم پائے ہوئے طبقوں نے نکتہ چینی کا وہ انداز جو یہ فلسفہ سکھاتا تھا بہت شوق سے اور بہت جلدی اختیار کر لیا، خصوصاً اس وجہ سے کہ حسب حال ہونے کے علاوہ اس میں نمک مزج بہت تھا۔ رات کے پتنگیوں اور پردانوں کی طرح ان کی غور و فکر سے نا آشنا طبیعتیں اس زمانے کے شوخ اور بیباک ذہنی رہبروں کے مقولوں پر اندھا دھند ٹوٹ پڑیں

۱۔ آزاد خیالی کے فلسفے سے وہ تعلیم مراد ہے جس کی فرانس میں اٹھارہویں صدی میں بہت تبلیغ کی گئی اور جس کا نصب العین انسانی ذہنیت کو جہالت، تعصب اور مذہب کے آغوش میں پرورش پائے ہوئے ادہام سے آزاد کرنا تھا، بائل (۱۶۴۷-۱۷۰۶) ڈول تیر (۱۶۹۳-۱۷۷۸) روسو (۱۷۱۲-۱۷۷۸) ڈی دے رو (۱۷۱۳-۱۷۸۴) اور دالیم بر (۱۷۱۷-۱۷۸۳) وغیرہ اس کے مبلغ تھے۔

اور ان کی عقل سلیم کا وہ حصہ جو عشقیہ نظموں اور ناولوں سے بچ رہا تھا ان مقولوں کی آگ نے جلا کر غارت کر دیا۔ "اس تباہی کا الزام دراصل اس تعلیم اور فلسفہٴ حیات پر نہیں لگایا جاسکتا جو اس کا باعث ہوا، کیونکہ وہ روسی جن کی عقل سلیم تباہ ہوئی حقیقت میں اس کے متعلق بہت سطحی اور اکثر غلط معلومات رکھتے تھے۔"

"ڈراما نویس فون دی زین کا بیان ہے کہ اس زمانے میں نوجوانوں نے حلقے قائم کیے تھے جن کی غرض فلسفیانہ بحث مباحثہ تھی، لیکن مذہب کی توہین اور مقدس چیزوں کی بے آبروئی کرنے کے سوا ان فلسفیوں کا اور کوئی شغل نہ تھا۔ دول تیر کے اکثر روسی پروجیفوں نے اس کے بارے میں محض افواہیں سنی تھیں اسے اکاد کا مبلغ سمجھتے تھے اور روس کی تصانیف سے انھوں نے صرف اتنا سیکھا تھا کہ عقل مندی کا اصل جوہر علم کے فریب سے بچا رہنا ہے۔ یوں آزاد خیالی کے فلسفے نے اس

لے کلیوچن سکی، "مضامین اور تقریریں"

۱۷ فرانس کا مشہور اثناسیوس پاردان (۱۷۷۸-۱۸۶۴) مذہبی رواداری کا حامی، تعصب کا دشمن طنز میں بکتا تھا۔

۱۸ سالانہ دول تیر کا مقولہ ہے کہ اگر خدا نہ بھی ہوتا تو ہمیں کوئی نہ کوئی بنانا پڑتا۔

۱۹ روس نے ۱۷۶۲ میں ایک رسالہ لکھا جس میں اس نے ثابت کیا تھا کہ علوم اور فنون انسان کے اخلاقی تنزل کا سبب ہوتے ہیں۔ اس کا خیال تھا کہ یورپ کی قوموں کو یہ سادہ اور فطری طرز معاشرت اختیار کر لینا چاہیے جو قدیم یونان اور روم میں رائج تھا۔ اس کے نادل "ژولی" یا "نئی آواز" نے، جس میں اس نے ایسی زندگی کی نہایت دل ربا تصویر کھینچی ہے، فرانسیسی ذہنیت میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ جیسا کہ دول تیر نے طنزاً کہا ہے "اُسے پڑھ کر چاروں ہاتھ پیر پر چلنے کو جی چاہتا ہے"

اس جہالت اور ذہنی جمود کو جو روس میں پہلے سے موجود تھا حق بجانب کر دکھایا اور اسے تقویت پہنچائی۔ نئے خیالات نے روسی سوسائٹی کی کوئی ذہنی پارو جانی حاجت نہیں پوری کی، ان سے لوگوں کو ویسی ہی دلچسپی تھی جیسی عنیت کرنے اور سننے، یا شہوت انگیز ناولوں کی تصویریں دیکھنے سے ہوتی ہو۔ فلسفیانہ تضحیک نے دل تیر کے روسی پیرد کو ہر سماجی اور اخلاقی پابندی سے آزاد کر دیا، پولیس والے کے سوا اسے اور کسی کا خوف نہیں رہا، جسمانی تکلیف کے سوا اس کے دل میں اور کسی قسم کا درد محسوس کرنے کی صلاحیت نہیں رہی۔ روسی ذہنیت جس میں یورپ کے بصیرت افزو اثرات نے یہ کیفیت پیدا کر دی تھی، حقیقت میں یورپ کی تہذیب نہیں حاصل کر رہی تھی بلکہ ایک مسالہ دار اور ثقیل غذا اختیار کرنے سے جس کی وہ عادی نہیں تھی اپنے آپ کو بیمار کر رہی تھی۔ اسی دوا نے جو کسی زمانے میں اس کی صحت کی اصلاح کے لیے تجویز کی گئی تھی روسی قوم کے پرانے امراض اور ابھار دیے اور اب صرف اس کی بیماریوں کا علاج نہیں کرنا تھا، بلکہ خود دوا کا۔

ملکہ کیتھرین دوم (۱۷۶۲-۱۷۹۶) روسی روشن خیالی کے اس پہلو سے آگاہ تھی۔ اس کا اپنا فلسفہ حیات بھی اسی تعلیم پر مبنی تھا جس کی شعاعیں فرانس سے ہر طرف پھیل رہی تھیں۔ اپنی ذہنی اور اخلاقی لباط کے مطابق اس نے ذاتی طور پر اصلاح کی کوشش کی، مگر اس کی زندگی کا طریقہ ایسا تھا کہ اس کی رہنمائی

لہ کلیوجف سکی: "معنایں اور تقریریں"

تہ ایضا۔

سے کسی کو فائدہ نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اس کے عہد کے مدبروں میں بھی اس قدر حس تھا کہ قومی زندگی کے دھبوں کو مٹانے کی فکر کریں اور انہوں نے قوم کو تعلیم کی رغبت دلانے اور درسگاہیں قائم کرنے میں بہت سرگرمیاں دکھائیں۔ لیکن وہ دہم اور غلط فہمیوں میں مبتلا ہو گئے۔ انہوں نے درسگاہیں قائم کیں جن میں نہ استاد تھے نہ طالب علم اور نہ ان کے لیے درسی کتابیں فراہم کی جاسکتی تھیں اگر یہ سامان سارا ہتیا بھی ہو گیا تو تعلیم یافتہ لوگوں کو پھر وہی ذہنیت جس سے انہیں آزاد کرنا مقصود تھا اختیار کر لینے سے روکنے کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ یوں ریاست کی ساری اصلاحی کوششیں ناکام رہیں، لیکن خود تعلیم یافتہ روسی طبقوں میں دو چار ایسے لوگ پیدا ہو گئے جنہیں ذہنیت کے عام رجحان میں سبک ہماری اور بد مذاقی نظر آتی تھی اور اس امید میں کہ تضحیک سے گمراہوں کی آنکھیں کھل جائیں گی اور وہ اپنی حماقتوں سے باز آئیں گے انہوں نے طنز اور تضحیک کو اصلاح کا آہ بنا لیا۔ پہلی ترکی جنگ کے زمانے میں (۱۷۶۸-۱۷۷۴) اس قسم کے انشا پردازوں نے بہت زور دکھایا۔ ان میں سب سے زیادہ جوشیلا ایک نوجوان سابق فوجی کپتان نووی کوف تھا، جس کے تین رسالے ”احدی“ ”مصور“ اور ”تھیلی“ اس وقت کی انشا پردازی کے کارنامے مانے جاتے ہیں۔

فی کولائی او انوچ نوویکوف (۱۷۴۴-۱۸۱۶) تبلیغ کے کام کے لیے فطرتاً نہایت موزوں تھا اور اس کے رسالوں میں جوش کے ساتھ حقیقت بینی اور حقیقت نگاری کا وہ مادہ پایا جاتا ہے جس سے روسی انشا پردازی اس وقت تک نا آشنا تھی اور جو بعد کو اس کا مایہ ناز بن گیا۔ نووی کوف کے تیروں کا ہدف فرانس کی

تقلید کا ضبط تھا اور قوم کی اس حماقت کو واضح کرنے اور اس پر لعنت ملامت کرنے میں اس نے کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھا۔ لیکن وہ خرابی جسے نوویکوف دور کرنا چاہتا تھا اخلاقی کمزوری یا خالص بد اخلاقی نہیں تھی، بلکہ ایک طرح کی دل کی بیماری اور بیماریوں کا علاج ہوتا ہے، مذاق نہیں اڑایا جاتا۔ روسیوں نے یورپی تہذیب اس بے ڈھنگے پن سے اختیار کی تھی کہ ان کی ذہنیت کو فروغ دینے کی بجائے اس نے ان کی نگاہ دھندلی کر دی۔ اور چونکہ وہ اپنی اصلیت سے ناواقف تھے اور اپنے آپ سے بیگانہ، اس ناواقفیت اور بیگانگی نے انہیں اپنی اصلیت سے بے پروا کر دیا اور تدریج یہ بے پروائی نفرت اور تحقیر میں منتقل ہو گئی۔

فون ویزن کے کیرکٹر اور انوشکا کی طرح روسی اس پرافسوس کرنے لگے کہ وہ روسی تھے اور انہیں صرف اس بات سے تسکین حاصل ہوتی تھی کہ ”گو ان کے جسم روس میں پیدا ہوئے ان کی روح شاہ فرانس کی تابعدار ہے“ ایسی ذہنیت کا علاج تضحیک سے نہیں ہو سکتا اور خود نوویکوف نے بھی اسے محسوس کیا۔

”مصور“ میں اس نے ایک مضمون شایع کیا جس میں ایک مصنف اور اس کے ناظرین میں گفتگو ہوتی ہے اور ایک ناظر مصنف سے کہتا ہے: ”آپ کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ جس وقت آپ سیرا مذاق اڑاتے ہیں میں خود بھی آپ کے ساتھ ہنسی میں شریک ہوتا ہوں“ یعنی مصنف کچھ بھی لکھے، پڑھنے والے پر اس کا اثر نہیں ہوتا: اگر ہوتا تو ہنسنے کے بجائے وہ خفا ہوتا یا اپنی غلطیوں پر نادم اور شرمندہ۔ کچھ اس ناکامی کے احساس، کچھ ریاست کی مخالفت نے

لہ فون ویزن اور اس کی تصانیف کا ذکر روسی ڈراما کے تحت میں آئے گا۔

نوویکوف کو یقین دلادیا کہ اس کا طرز عمل صحیح نہیں اور اس نے اپنا طریقہ بدل دیا۔
 رسالوں اور مضامین کے ذریعے سے اس نے تعلیم یافتہ لوگوں میں نام پیدا
 کر لیا تھا۔ ۱۷۷۹ء میں وہ ماسکو آیا اور وہاں کے دارالعلوم کا چھاپہ خانہ دس
 سال کے بے ٹھیکے پرے کر کتابوں کی ایک دکان کھولی اور کتابوں کی اشاعت
 شروع کر دی۔ ان ادنیٰ شہوت انگیز اور اخلاق کو برباد کرنے والے ناولوں
 کے مقابلے میں جو ڈھیروں فرانس اور انگلستان سے منگائے جاتے تھے اس نے
 انھیں ممالک کے ادب کے بہترین نمونے تعلیم یافتہ روسیوں کے مطالعے کے لیے
 ترجمہ کرائے اور اسی کے ساتھ درسی کتابوں کا ایک بہت بڑا ذخیرہ روسی
 درسگاہوں کے واسطے تیار کر دیا۔ چھاپے خانے کا ٹھیکہ لینے کے سات سال کے
 اندر اس نے تین سو چھیاسٹھ اخلاقی ادبی اور درسی کتابیں شایع کیں۔ کتب
 فروشی سے اسے اتنی ہی آمدنی ہوتی تھی جتنی ماسکو کے بڑے بڑے دکانداروں
 کو، اور ان لوگوں کا جو اس زمانے میں تھے اور خود نوویکوف سے واقف
 تھے یہ بیان ہو کہ اس نے علم کی محبت اور مطالعے کا شوق صرف پھیلایا نہیں
 بلکہ اسے پیدا کیا: اس کا کاروبار اس قدر وسیع تھا اور کام اس سلیقے سے کیا
 جاتا تھا کہ اس کی کتابیں صرف یورپی روس کے دور افتادہ گائوں میں ہی نہیں
 بلکہ سائبریا تک پہنچنے لگیں اور لوگوں نے انھیں پڑھنا شروع کر دیا۔
 ٹھیکے کے دس سال میں نوویکوف کی اشاعت کتب اور کتب فروشی کی جدوجہد
 جہد نے روسی سوسائٹی میں نئی معلومات، نیا مذاق، نئے احساسات پیدا کر دیے،
 منتشر خیالات کو ہم آہنگ بنایا اور مختلف مذاق کے ناظرین کو ایک مستقل مطالعے

سے شوق رکھنے والی جماعت کی شکل دے دی۔ اس شوق کو پورا کرنے کے لیے مترجموں، مولفوں، چھاپے خانوں اور کتب فروشوں نے جو سرگرمیاں دکھائیں، کتابوں، رسالوں اور اخباروں کے ذریعے سے روسیوں کے ذہن میں جو تحریک ہوئی، ان سب کا نتیجہ ایک چیز ہوئی جو ابھی تک روس میں ناپید تھی: عام رائے“ افسوس ہو ملکہ کیتھرین دوم ان خدمات کی قدر نہ کر سکی اور اس خوف سے کہ کہیں نوویکوف کے کاروبار کا انجام انقلابی خیالات کا پرچار نہ ہو، اس نے نوویکوف کو ۱۷۹۲ میں قید کر کے اس کا سارا کام برباد کر دیا۔ لیکن نوویکوف اس وقت تک اپنا مطلب حاصل کر چکا تھا اور روس کی ذہنی اور ادبی خودداری کی بنیاد اس قدر مستحکم ہو گئی تھی کہ بیرونی اثرات کے مہلک ثابت ہونے کا بہت زیادہ خطرہ نہیں رہا تھا۔

فون ویزن کے ڈراموں اور نوویکوف کی شخصیت کے علاوہ الکساندر نکولایوچ رادشچف (۱۷۴۹-۱۸۰۲) کا ناول ”پیتر برگ اور ماسکو کا سفر“ جو ۱۷۹۰ میں لکھا گیا اس کی دلیل ہے کہ روس میں خودی کا احساس پیدا ہو رہا تھا اور ایک خاص رنگ بھی پکڑ رہا تھا۔ رادشچف نوویکوف کی طرح رئیس خاندان کا تھا اور اس نے بھی پیتر برگ کے کیڈٹ کالج میں تعلیم پائی تھی۔ یہاں سے فارغ ہو کر وہ جرمنی گیا اور وہاں جرمن اور فرانسیسی فلسفیوں کا مطالعہ کیا۔ اس مطالعے کا نتیجہ اس کا ناول تھا، جس میں اس نے بڑی بے ترتیبی سے اپنی معلومات، احساسات اور فلسفیانہ سماجی اور معاشی نظریوں کو یکجا کر کے انھیں ناول کی لہ کلیوچف سکی: ”مضامین اور تقریریں“

پوشاک پہنا دی۔ اس ناول میں کوئی ادبی یا فنی صفت نہیں، اس کا فلسفہ بھی ادنیٰ اور اکثر اپنا نہیں پرایا ہے۔ لیکن رادشچف کی جڑائی کرنے والے بھی اس سے انکار نہیں کرتے کہ اس میں ایک درد، مظلومیوں سے ہمدردی اور قوم کی محبت ظاہر ہوتی ہے جس کا اس سے پہلے روسی ادب میں نام و نشان تک نہیں ملتا اور جس کا مقابلہ بعد کے مصنف بھی مشکل سے کر سکیں گے۔

اس زمانے کی ذہنی بیداری کا دوسرا پہلو نیکولائی میخائیلوویچ کارامزین کی تصانیف ہیں۔ کارامزین صوبہ سمارا کا ایک خوش حال زمیندار تھا جس نے اچھی تعلیم پائی تھی۔ ۱۸۵۰ء میں وہ اس حلقے میں شامل ہو گیا جسے نوویکوف نے ماسکو میں قائم کیا تھا۔ ان لوگوں کی صحبت نے اس کے دل کو بھی دلولوں اور حوصلوں سے لبریز کر دیا۔ ۱۸۸۹ء میں اس نے یورپ کا سفر کیا اور وہاں سے اس نے روسی رسالوں میں خطوط بھیجے جن میں یورپ کے علمی اور ادبی مشاہیر کے حالات زندگی اور یورپ کی مشہور درسگاہوں اور دارالعلوم کا مفصل بیان تھا، ان خطوط کا اصل مقصد یورپ کی ذہنی اور علمی ترقی کی دلفریب تصویر دکھانے اور روسیوں کو عبرت دلانا تھا، مگر کارامزین کی شخصیت ابھی تک پختہ نہیں تھی اور اس کے خیالات نے کوئی معین شکل نہیں اختیار کی تھی، اس لیے وہ اکثر مغالطوں میں مبتلا ہو گیا اور یورپی تصورات کی صحیح ترجمانی نہ کر سکا، لیکن "خطوط" کی اصل خوبی ان کی سادہ سلیجھی ہوئی زبان ہے جس سے قدیم سلاف کے ثقیل الفاظ بالکل دور کر دیے گئے ہیں اور سینکڑوں نئے الفاظ اور محاورے اس صفائی سے کھپا دیے گئے ہیں کہ کسی جدت کا شبہ نہیں ہوتا اور جس میں ایک

ایسی ہم آہنگی اور ترنم ہی جو نثر میں نظم کی شان پیدا کر دیتا ہے۔ عمر کے ساتھ کارامزن کا ذہن پختہ ہو گیا، اس کے خیالات میں نہ پچیدگی رہی نہ تلون اور وہ بلاغت اور فصاحت جس نے ”خطوط“ میں اپنی جھلک دکھلائی تھی روسی نثر کی ایک گراں بہاد دولت بن گئی۔

یورپ سے واپس آ کر کارامزن نے دو تاریخی ناول لکھے ”غریب لی زا“ اور ”تالیبا، نواب نادہی“ جو روس میں رومانی اثرات کا پیش خیمہ تھے۔ ان ناولوں میں کارامزن نے گزشتہ روسی زندگی کا عکس اُتارا ہے، مگر اپنے عقیدے اور خیال کے مطابق؛ اس کے کیرکٹر دیہاتی زندگی اور روسی مناظر قدرت کے شیدائی ہیں، دولت اور عیش و آرام کو حقیر اور ذلیل سمجھتے ہیں اور ان کا سب سے عزیز حوصلہ کار خیر کے ذریعے سے دائمی شہرت حاصل کرنا ہے۔ واقعات دیکھے جائیں تو یہ تصویریں جھوٹی ہیں اور کیرکٹروں کی یہ ذہنیت اور آرزوئیں مصنف کی صریحی ایجادیں جن کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں۔ لیکن اس زمانے میں کسی نے ناولوں کے اس عمیب پر غور نہیں کیا، سب ان کی زبان کی نفاست اور داستان کی دل آویزی پر آفریں کہتے تھے۔ کارامزن نے یہ ناول لکھ کر روسی قوم پر واقعی بہت بڑا احسان کیا، کیونکہ ان کی وجہ سے روسی اپنی زندگی کی طرف متوجہ ہوئے اور ان کی نظروں سے وہ پردہ اُٹھ گیا جو ادنیٰ یورپی ناولوں نے ڈال دیا تھا۔ ”غریب لی زا“ کی ہیروئن ایسی فصیح زبان بولتی ہے جو اس وقت کارامزن کے سوا کوئی لکھ بھی نہیں سکتا تھا، مگر وہ ایک غریب کن کی لڑکی تھی جو کسی رئیس زمیندار پر عاشق ہو گئی تھی، زمیندار نے اس کے جذبے کا

احترام نہیں کیا اور اپنی بے عزتی کا داغ مٹانے کے لیے وہ ایک جھیل میں ڈوب کر مر گئی۔ اس کی داستان کا لوگوں کے دلوں پر بہت گہرا اثر ہوا اور غریب لی زاکے طفیل میں وہ روس کے ان سبکیں اور مظلوم کسانوں سے ہمدردی کرنے لگے جنہیں وہ پہلے حیوانوں سے بھی بدتر سمجھتے تھے۔

ناول لکھنے کے بعد کارامزن نے عمر کا بقیہ حصہ روس کی تاریخ تصنیف کرنے کے لیے وقف کر دیا اور اس کی "تاریخ روس" کی بارہ جلدیں ہی اس کا کارنامہ ہیں۔ قومی زندگی کی تدریجی تعمیر میں اس نے ماسکو کے بادشاہوں کو بیجا اہمیت دی ہے اور خود قوم کی کوششوں کو بہت نظر انداز کیا ہے، وہ بادشاہوں اور مدبروں کی تدبیروں میں الجھا رہتا ہے اور ان قومی اداروں کا ذکر بھی نہیں کرتا جو دراصل قدیم ملکی نظام کی جان تھے۔ بعد کے مورخوں نے اس کی تصنیف میں اسی قسم کی بہت سی غلطیاں اور خامیاں نکالی ہیں جن کی وجہ سے وہ اب مستند نہیں قرار دی جا سکتی، لیکن جو خدمات اس تصنیف نے انجام دیں وہ بے شمار ہیں۔ گزشتہ زندگی کی یادگار اس نے ایسی شکل میں پیش کی اور اسے اتنا شاندار اور بہت افزا بنا کر دکھایا کہ وہ قومی خودداری کا سنگ بنیاد بن گئی، اس نے روسیوں میں قومی نشوونما اور ریاست کو فروغ دینے کا حوصلہ پیدا کیا اور قومیت کے احساس کو اسی قدر تقویت پہنچائی جتنی اس خون نے جو روسی وطن پرستوں نے اپنے ملک کو نپولین کے پنجے سے بچانے کے لیے بہایا تھا۔

اس دور کی نثر سے جب ہم نظم کی طرف رخ کرتے ہیں تو کسی قدر مایوسی ہوتی ہے، جرتراون میں ایچ ہے، مگر اس کے خیال میں شوخی اور بلند پروازی نہیں

ژوکون سکی کا درجہ فن کے اعتبار سے بہت بلند ہے مگر اس میں بدیع انجیالی نہیں اور اس کی کوششیں زیادہ ترجموں پر صرف ہوتیں۔ یہ دونوں شاعر محض مخبر ہیں ایک نئے دور کے جو شروع ہونے والا تھا۔

گارف رٹنی رومانوویچ جرزاون (۱۸۱۶-۱۸۴۳) صوبہ کازان کے ایک مفلوک الحال رئیس زادے کا لڑکا تھا۔ اس کا شروع بچپن شہر اورن برگ میں گزرا، اس کے باپ کے انتقال پر اس کی ماں کازان آئی اور وہاں جرزاون ایک مدرسہ اعلیٰ میں جو اسی زمانے میں کھلا تھا داخل کر دیا گیا۔ سولہ برس کی عمر میں، قبل اس کے کہ وہ اپنی تعلیم ختم کر سکے جرزاون فوج میں بھرتی کر لیا گیا اور وہ دس سال جو اس نے فوجی ملازمت میں گزارے اس کی زندگی کا سب سے تاریک حصہ ہیں۔ اس کی صحبت نہایت ذلیل تھی اور جو کام اس کے سپرد تھا وہ صرف مشکل نہیں بلکہ غیر دلچسپ تھا۔ سب سے زیادہ تکلیف اسے اس کی تھی کہ وہ اپنا علمی اور ادبی شوق پورا نہ کر سکا، لیکن باوجود تمام دشواریوں کے جرزاون نے راتوں کو جاگ کر عرض پر کتابیں پڑھیں اور لومونوسوف کی نظموں کا بہت غور سے مطالعہ کیا، کیونکہ اس زمانے میں وہی استاد مانا جاتا تھا۔ مطالعے کے علاوہ وہ خود شعر کہنے کی بھی مشق کرتا رہا اور ۱۷۷۰ء میں جب اسے افسر کا عہدہ ملا اور پیتر برگ میں رہنے کی اجازت حاصل ہو گئی، تو وہ بہت جلد مشہور ہو گیا اور اس کا کلام اس قدر پسند کیا گیا کہ سب اسے صدی کا سب سے اعلیٰ شاعر ماننے لگے۔

”فے لیٹاسا“ جرزاون کی پہلی نظم تھی جس نے لوگوں کو اس کی طرف متوجہ کیا

اس نظم میں اس نے ملکہ کیتھرین دوم کی مسیح کی ہر اور اس موقع کو اس کے درباریوں کی قلمی کھونٹے کے لیے نہایت مناسب طور پر استعمال کیا ہے۔ چنانچہ ”فے لیٹ سا“ کی تعریف کرنے کے بعد اس کا عاشق جس سے ایک خاص رئیس مراد ہے جو ملکہ کیتھرین کی نظر التفات سے بہت بیجا فائدہ اٹھاتا تھا، اپنے بارے میں کہتا ہے:

”فے لیٹ سا ایسی ہے، میں ایک عیاش ہوں،

لیکن سناری دنیا میری ہی جیسی ہے،

علم و دانش نے اسے چاہے جتنا مشہور کر دیا ہو،

ہر انسان حقیقت میں محض دھوکا ہے۔

ہم دنیا میں راہِ راست پر چلنا نہیں جانتے،

بدمستی میں اوہام کے پیچھے دوڑتے ہیں۔

خوشامد اور شکایت، غرور اور بدکاری۔

ان ویرانوں میں بھلا کسی کو

اتفاق سے بھی سیدھا راستہ مل جاتا ہے؟

صرف تجھے، اے ملکہ، یہ فخر حاصل ہے۔

کہ تاریکی میں روشنی پیدا کرے،

بدنظمی میں نظام قائم کرے،

اس نظام کو استحکام عطا کرے،

اور انسان کے حیوانی جذبات کو

اس کی مسرت کا سامان بنائے۔

اس نظم کا لوگوں پر بہت مختلف اثر ہوا۔ جنہیں دربار سے کوئی واسطہ نہیں تھا انہوں نے اس کی بہت تعریف کی، جن درباریوں کو اندیشہ ہوا کہ ان کی پردہ دری کی گئی ہے بہت خفا ہوئے اور انہوں نے جرزاون پر یہ الزام لگایا کہ اس نے ایک انسان کو خدائی کا مرتبہ دے کر خدا کے حق میں بے ادبی کی ہے۔ مگر ملکہ کیتھرین کو یہ نظم بہت پسند آئی، جرزاون کا دربار میں رسوخ ہو گیا اور وہ ملکہ کے خاص دوستوں میں شمار ہونے لگا۔

جرزاون کی نظمیں عموماً معاصر شخصیتوں اور کارناموں کے متعلق ہیں۔ اکثر شاعر جن کا دربار یا امیروں کی صحبتوں میں رسوخ ہوتا ہے مدح سرائی کو اپنا پیشہ بنا لیتے ہیں اور سچ اور جھوٹ میں مطلق تمیز نہیں کرتے۔ جرزاون میں یہ کمزوری نہیں تھی۔ ملکہ کیتھرین کے سوا اس نے کسی کی ذات کی بجا یا مبالغہ آمیز مدح نہیں کی اور ملکہ کی تعریف کو بھی اس نے درباریوں کی ہجو کے لیے ایک آڑ بنایا، جیسا کہ اس کی نظم ”فے لیٹ سا“ سے ظاہر ہوتا ہے۔ اور ملکہ یا کسی اور شخصیت کی اس نے اگر تعریف بھی کی تو کسی ذاتی غرض سے نہیں بلکہ اس امید میں کہ اس سے روس میں قومیت کا احساس بڑھے گا اور قوم کے خادموں کے حوصلے بلند ہوں گے۔ سو ورون ایک نہایت قابل اور کامیاب روسی جنرل تھا جس نے پنولین کے کئی افسروں کو شکست دی اور پولستان کے دارالسلطنت وارسا کو فرانسیسیوں کے قبضے سے چھینا۔ اس کی تعریف میں جرزاون لکھتا ہے:

”رات کے بھونچال کی طرح جواں مرد چلا جاتا ہے!

اس کا سایہ تاریکی پھیلاتا ہے، اس کی لٹکار سے آسمان پر تمبر چھا جاتا ہے۔
اس کی نظر بجلی کی طرح سامنے چمک چمک کر اس کا راستہ روشن کرتی ہے،
اس کے پیچھے اونچے ستارہ یلوط کے درخت زمین بوس ہوتے ہیں۔

وہ جہاز میں بیٹھا تو سمندر ابل پڑتا ہے،
پہاڑوں پر چڑھا تو وہ کانپ جاتے ہیں،
شہر پنا ہیں اس کے چھونے سے گر پڑتی ہیں،
قلعوں کو وہ اڑا کر بادلوں میں غائب کر دیتا ہے،
دنیا اس کی عظمت سے لرزتی ہے،

کمزور اور بے بس مخلوق کا اس سے بہتر کوئی محافظ نہیں۔
سو دور و ف کی مدح میں جبر تراون نے مبالغہ تو بہت کیا ہے، لیکن اس
کا اصل مقصد اپنے ملک کا جاہ و جلال دکھانا، روسی دلوں میں اولوالعزمی پیدا
کرنا ہے۔ سو دور و ف کی تعریف اس وجہ سے کی گئی کہ وہ وارسا کا فاتح تھا، نظم
کا عنوان بھی ”وارسا کی فتح“ ہے۔ اس کے مقابلے میں جبر تراون کی نظم ”بادشاہ“
کے چند شعر ملاحظہ ہوں، اس کی نیت پر اس کے بعد کوئی شک باقی نہ رہتا
چاہیے۔

”ایک بت، تمام بُرائیوں سے لپا ہوا،
عوام کے حقیر تصوروں پر جادو کر دیتا ہے۔
لیکن اگر کوئی صاحبِ نظر اس کی طرف آنکھ اٹھائے،
تو اس کی ساری خوبیاں غائب ہو جاتی ہیں۔“

یہ نظر کو دھوکا دینے والی صورتیں ہیں،
 مٹی کی مورتیں جن پر سونا پھرا ہے!
 اے روح کے فیض سے نا آشنا بادشاہو،
 کیا تم ان مورتوں میں اپنی شکلیں نہیں پہچانتے ہو؟
 گدھا ہمیشہ گدھا رہتا ہے،
 چاہے اس کی مٹھی پر ستارے جڑ دیے جائیں،
 جہاں اسے اپنی عقل سے کام لینا چاہیے،
 وہ صرف اپنے کان ہلاتا ہی...
 ہاں، قدرت کا ہاتھ مقداروں کا حق دینے میں
 ہمیشہ کوتاہی کرتا آیا ہے؛

جرثاؤن کی شاعری کے متعلق روسی نقادوں میں بہت اختلاف رہا
 ہے، بعض اے لومونوسوف سے کم، بعضے اٹھارھویں صدی کا سب سے ممتاز
 شاعر مانتے ہیں لیکن کی رائے ہے کہ وہ شاعر ہی نہیں تھا۔ جرثاؤن کا انتہائی
 شوق اور بلند حوصلہ دیکھتے ہوئے لیکن کے اس خیال میں کچھ نا انصافی ضرور
 محسوس ہوتی ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہ نازک احساسات جو ہر شاعر میں ہونا
 چاہئیں اور خصوصاً اس میں جو قوم کی رہنمائی کرنا چاہتا ہو، جرثاؤن کو نہیں
 عطا ہوئے تھے۔ اس کی حیثیت اس استاد کی سی ہے جو اپنے شاگردوں میں صحیح
 مذاق پیدا کرنے کے لیے طبع آزمائی کرتا ہے اور ان کی اخلاقی تربیت کی غرض سے
 بزرگوں کے کارناموں کو ایک دلچسپ داستان کے پیرائے میں پیش کرتا ہے، لیکن

رہبری کے لیے ناموزوں اور اس نظر سے محروم ہے جو دوسروں کی آنکھوں میں بھی روشنی پیدا کر دیتی ہے۔

روسی مذاق کی رہنمائی اور نوآموز شاعروں کو ان کے فن میں تربیت دینے کی اہم خدمت دیتی تھی آن درے یوچ ژوکوف سکی (۱۷۸۳-۱۸۵۲) نے انجام دی۔ اس کا اپنا کلام بہت کم ہے، لیکن اس نے ترجمے بہت کیے اور یہی حقیقت میں اس کے کارنامے ہیں۔ ان کے ذریعے سے اس نے روس کے اہل ذوق کو جرمن، انگریزی اور فرانسیسی شاعری کے بہترین کلام سے آشنا کر دیا اور ان کے سامنے نمونے پیش کر دیے جو ایک صحیح ادبی معیار کا کام دے سکتے تھے۔ اس نے یونانی شاعر ہومر کی اوڈیسی، سنکرت کی داستان مل دھنتی اور فردوسی کے شاہ نامے سے سہراب اور رستم کے قصے کے جو ترجمے کیے وہ اصل زبان سے نہیں تھے بلکہ جرمن شاعر روکرٹ کے ترجمے سے اور یہ ان کا بہت بڑا نقص ہے؛ یورپی زبانیں وہ بہت اچھی طرح جانتا تھا اور یورپی شاعری کے کل ترجمے اس نے اصل سے کیے۔ روسیوں کا دعوے ہے کہ دنیا کی کوئی زبان ترجموں کے لیے اس قدر موزوں نہیں جتنی کہ روسی زبان اور ژوکوف سکی کے ترجمے دیکھ کر اس دعوے میں شک کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ژوکوف سکی نے صرف خیالات صحت اور بے تکلفی سے نہیں ادا کیے ہیں، اس نے اپنے ترجموں میں وہی بھری رکھی ہیں جو اصل میں تھیں اور اکثر اگر لفظ بلفظ دیکھا جائے تو ترجمے اور اصل کے الفاظ موزوں پائے جائیں گے۔ فن کے اعتبار سے اس کے ترجمے روسی شاعری میں سد مانے جاتے ہیں،

اور یہ ایک شان ہے جو بہت کم ترجموں کو نصیب ہوئی ہوگی۔ نزدیکوں سکی
 مترجم ہونے کی وجہ سے روس کے بڑے پائے کے شاعروں میں شامل نہیں
 کیا جاسکتا، لیکن اس نے فن شاعری کو اس درجہ کمال تک پہنچا دیا کہ اس
 کے ترجموں کو ہم اصل روسی شاعری کے پہلے دور کا آغاز قرار دے سکتے ہیں۔

روسی شاعری

پہلا باب

نُشکِن

ادبی دنیا میں روس کا پہلا نمائندہ الکساندر سرگے یوچ نُشکِن ۱۷۹۹ء میں پیدا ہوا۔ اُس کا خاندان بہت پُرانا تھا اور روسی تاریخ میں اکثر اس کا ذکر آتا ہے۔ نُشکِن کی ماں پتیرا عظیم کے ایک حبشی غلام کی پوتی تھی اور اسی وجہ سے نُشکِن کے جلیے میں کسی قدر حبشی اثر نظر آتا ہے۔ شاعر کا بچپن فرانسیسی استادوں کی نگرانی میں گزرا جنہوں نے اسے آخر عمر تک اس غلط فہمی مبتلا رکھا کہ وہ فرانسیسی اپنی مادری زبان سے بہتر جانتا ہے۔ اعلیٰ تعلیم نُشکِن نے پتیر برگ کے ایک مشہور کالج میں حاصل کی، لیکن وہ بہت نکمّا طالب علم تھا اور اس کے استادوں میں سے اکثر کی یہ رائے تھی کہ وہ کبھی کسی مصرف کا نہ ہوگا۔ استادوں کی اس رائے اور نُشکِن کے ”نکمے پن“ کا سبب اس کا ادبی ذوق اور ادبی مشاغل تھے۔ اس نے پندرہ برس کی عمر سے رسالوں میں مختلف کلاسیکی شعرا کے ترجمے بھیجا شروع کر دیے، کالج میں ایک ادبی ادارہ قائم کیا اور ادارے کی طرف سے ایک رسالہ بھی جاری کیا جس میں زیادہ تر طالب علموں کے مضامین چھپتے تھے۔ یوں کالج سے نکلتے ہی

نیشنل روس کی ادبی دنیا کے طوفانی سمندر میں کود پڑا اور اپنے کلام اور طبیعت کی شوخی سے بہت جلد شہرت حاصل کر لی۔ ۱۸۱۸ میں اس نے اپنی پہلی لمبی نظم ”روسلان اور لودملا“ لکھی، لیکن نظم شایع ہونے سے قبل ہی وہ ایک فحش قصیدہ لکھنے کی سزا میں روس کے جنوبی صوبوں میں جلا وطن کر دیا گیا۔ سزایابی نے اس کی شہرت اور بڑھادی۔ اس کا قصیدہ ایسا لغو تھا کہ صرف اخلاقی ہی نہیں بلکہ ادبی نقطہ نظر سے بھی وہ سزا کا مستحق تھا، لیکن سب جانتے تھے کہ ریاست نے قصیدے کو محض ایک بہانہ بنایا ہے اور نیشنل کی جلا وطنی کی اصل وجہ چند نظمیں تھیں جو اس نے آزادی کی مدح میں اور آزادی کا دلولہ پیدا کرنے کے لیے لکھی تھیں۔ جلا وطنی کے چار سالوں میں نیشنل نے جنوبی صوبوں کی سیر کی اور اگر وہ اپنی ہمت اور قابلیت کی فضول نمائش میں وقت ضائع نہ کرتا تو ممکن ہے اس کی اس زمانے کی نظمیں بہت بہتر ہوتیں۔ مگر افسوس ہے وہ متانت اور ضبط نفس کی خوبیوں سے نا آشنا تھا، اس کے حسن پرستی کے شوق اور من چلے پن کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ اس کا وقت زیادہ تر زبان اور قلم سے حسین عورتوں کی تعریف کرنے میں گزرتا تھا اور اس سے جو ذرا فرصت ملتی وہ رقیبوں سے لڑنے جھگڑنے میں صرف ہوتی۔ سنجیدہ مشاغل کے بے بہت کم وقت بچتا تھا اور اس تھوڑی سی مہلت میں بھی، جیسا کہ اس کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے، اس کو اکثر نازیبا جذبات کا شمار پریشان رکھتا تھا۔ جلا وطنی کی مدت ختم نہیں ہوئی تھی کہ نیشنل اپنے باپ کے ایک گانو میں نظر بند کر دیا گیا۔ اس کی حرکتوں نے جنوبی صوبوں کی پولیس کو حیران کر دیا تھا اور پولیس والے اس فکر میں تھے کہ کسی طرح اس سے پیچھا چھڑائیں۔ محض شرارتوں کی شکایت

کرنا بے فائدہ تھا، مگر حجبِ پوشش پر انگریزی شاعر شیلیؒ کی ایک نظم پڑھنے سے اتحاد کا غلبہ ہوا اور اس کا ایک خط پکڑا گیا، جس میں اس نے کسی دوست کو اپنی روحانی کیفیت کی اطلاع دی تھی تو اس کے خلاف کارروائی کرنے کا بہت اچھا حیلہ مل گیا۔ پوشش اپنے آبائی گائومیخانوں سکویے بھیج دیا گیا اور اسے جو ذرا کھونے پھرنے کی آزادی تھی وہ بھی چھین لی گئی۔ وہ یہیں تھا جب ۱۸۲۵ میں زار نکولائی اول کی تخت نشینی کے موقع پر دیکار بست بے بغاوت ہوئی۔ باغیوں میں سے اکثر شاعر کے گہرے دوست تھے، لیکن اتفاق سے اسے وقت پر خبر ہو گئی اور جب پولیس اس کے مکان اور کاغذات کی تلاشی تھے آئی تو پوشش وہ کاغذات جن سے اس کا باغیوں سے تعلق ظاہر ہوتا تھا جل چکا تھا، ورنہ اس کی باقی عمر سائٹی بیریا کے کسی قید خانے میں گزرتی۔ ایک مرتبہ بزمِ نکلنے کے باوجود بھی پوشش کو معصوب ہونے کا خوف رہا اور زار کی بدگمانی رفع کرنے کی غرض سے اس نے کئی نظموں میں زار کی مدح سرائی کی اور اپنی وفا شعاری کا فخریہ اعلان کیا۔ ایک سال کے اندر زار کو اس کی خیر خواہی اور وفا شعاری پر اتنا اعتماد ہو گیا کہ وہ پتیر برگ بلالیا گیا اور اسے مزید عذر خواہی اور قدم بوسی کے لیے خلوت میں باریابی عطا ہوئی۔ مگر زار کی یہ مہربانیاں کیا تھیں گو یا شاعر کو اور زیادہ قابو میں رکھنے کی ترکیبیں تھیں۔ نکولائی اول نے اپنے آپ کو پوشش کا محتب قرار دیا اور اسے اپنے قریب رکھنے کی غرض سے دربار میں ایک عہدے پر مامور کر دیا جو شاعر کی

لے شیلی (۱۷۹۲-۱۸۲۲) آزاد خیالی کا بہت جو شلا مبلغ تھا۔

لے اس تحریک کا ذکر "سیاسی تحریکوں اور تصانیف" کی تحت میں آئے گا۔

عمر اور اس کا مذاق دیکھتے ہوئے بہت نامناسب تھا۔ بادشاہ کے احتساب اور درباریوں کی نفرت اور عداوت نے لشکن کو اس قدر عاجز اور بیزار کر دیا کہ وہ اپنی عقل کی سلامتی کے لیے دعائیں مانگنے لگا۔ ۱۸۳۱ میں لشکن نے ایک نوجوان لڑکی سے شادی کر لی جو حسین تو تھی مگر ساتھ ہی فضول خرچ، سرد مہر اور کسی قدر آوارہ بھی تھی اور بیچارے شاعر کے سر بیوی کی خاطر داری کی اور مصیبت آن پڑی۔ ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ لشکن پتیر برگ آکر بجائے ادبی دلچسپیوں میں مچھونے کے رسیانہ زندگی کے لغو مشاغل میں گرفتار ہو گیا، مینا ٹون سکویے کی نظر بندی کے مقابلے میں پتیر برگ کے قیام کے دس گیارہ برس بہت کم بار آور ثابت ہوئے۔ آخری سالوں میں لشکن نے شاعری ترک کر کے شاعری اختیار کر لی، کچھ اس وجہ سے کہ بیوی کے اخراجات برداشت کرنے کے لیے اس نے سرکاری مورخ کا عہدہ حاصل کر لیا تھا اور اس سلسلے میں اس نے جو تھوڑا بہت مطالعہ کیا اس سے تاریخی مضامین لکھنے کا شوق پیدا ہو گیا، کچھ اس وجہ سے کہ اس کی پابندیاں ایسی ہو گئی تھیں کہ شاعری کا حوصلہ کرنا ہی بے کار سا ہو گیا تھا ۱۸۳۷ میں اسے اپنی بیوی کی آبرو بچانے کے لیے ایک ڈیوٹیل لٹننٹ لڑنا پڑا۔ اور اسی میں وہ ایسا زخمی ہوا کہ چند روز بعد دنیا سے رخصت ہو گیا۔

لشکن نے شروع شروع میں جو ترجمے کیے اور نظمیں لکھیں وہ بھی اپنے

لے یورپ میں پچھلی صدی تک شرفا کی یہ رسم تھی کہ جس معاملے کا وہ قانوناً تصفیہ کرانا چاہتا ہے اسے ایک دوسرے سے لڑکر طو کر لیں۔ ان لڑائیوں میں سے اکثر کا انجام ایک فریق کی موت ہوا کرتی تھی۔

زمانے کے معیار کے مطابق بہت اعلیٰ تھیں، لیکن اس کی پہلی تصنیف جو اس وقت بھی قابلِ قدر سمجھی جاسکتی ہے اس کی داستان "روسلان اور لودملا" ہے۔ کرلیوف کی کہانیوں کے بعد یہ پہلی نظم تھی جس میں مروجہ طرز کے برخلاف انتہائی سادگی اختیار کی گئی تھی اور ہر قسم کے تصنع اور رسمی اصطلاحوں اور استعاروں سے قطعی پرہیز کیا گیا تھا۔ قدیم طرز کے پیروا سے پڑھ کر بہت برہم ہوئے، لیکن مخالفت اور اعتراضوں کے باوجود "روسلان اور لودملا" نہایت مقبول ہوئی۔ اس کی اشاعت کے ساتھ روسی شاعری میں ایک نیا طرز جاری ہو گیا اور پرانے کلاسیکی شاعروں کی نقل کرنے کا قاعدہ بالکل ترک کر دیا گیا۔ اس تاریخی اہمیت کے علاوہ "روسلان اور لودملا" کی تعریف میں کچھ اور نہیں کہا جاسکتا۔ ۱۸۲۸ء میں لٹیکن نے اصل نظم میں ایک تہید کا اضافہ کر دیا جس کا مقصد داستان کی طلسمی فضا کی ایک جھلک دکھانا ہے اور اس وقت جو خاص خوبی نظم میں نظر آتی ہے وہ اسی مختصر سی تہید کی وجہ سے ہے۔ جلاوطنی کے زمانے میں لٹیکن انگریزی شاعر ہارن کا گرویدہ رہا اور اسی کے انداز میں ایک لمبی نظم "قفقاز کا قیدی" لکھی، جس میں ایک روسی قیدی کی سردہری اور ایک لڑکی کے اس پر عاشق ہو جانے اور اسے آزاد کر کے خودکشی کر لینے کا قصہ ہے۔ "قفقاز کے قیدی" کے علاوہ لٹیکن نے بہت سی مختصر نظموں میں بھی ہارن کی نقل کی، لیکن دونوں شاعروں کی

لے جورج گورڈن نوبل، لارڈ ہارن (۱۷۸۸-۱۸۲۴) بے باک من چلے پن کا شاخو
 اور آزادی کا شیدائی۔ اسی صدی کے شروع میں صرف انگلستان میں نہیں بلکہ یورپ
 کے اکثر ملکوں میں اس کا بہت اثر تھا۔

سیرت اور ذہنی رجحان میں اتنا اختلاف تھا کہ نپکن پر بائرن کا رنگ زیادہ عرصے تک قائم نہ رہ سکا یہ اس کی نظم "نٹ" میں صاف ظاہر ہوتا ہے، جہاں اس نے روسی نفسیات پر پہلی مرتبہ بحث کی۔

"نٹ" کا ہیرو الے کو بائرن کے مشہور کیرکٹر چائلڈ ہیرو لڈ سے کچھ سطحی مشابہت رکھتا ہے، لیکن دراصل وہ روسی زندگی کا ایک منظر ہے جسے بائرن کی شاعری اور تخیل سے کوئی واسطہ نہیں۔ مشہور ناول نوئس دستہ ٹف سکی کا خیال ہے کہ الے کو اس سیرت اور مزاج کے لوگوں کا ایک مثالی نمونہ ہے جنہیں اس زمانے کی سوسائٹی کی ذہنی اور روحانی بیماری کی علامت سمجھنا چاہیے۔ تعلیم یافتہ روسیوں نے اس کے نزدیک یورپی طرز معاشرت اور فلسفہ حیات اختیار کرنے سے اپنے آپ کو قوم کے باقی طبقوں سے اور اپنی سرزمین سے بالکل بے تعلق اور بے گانہ کر لیا تھا۔ قانونِ فطرت کی اس خلاف ورزی نے ایک قسم کی

لے ایک نیم وحشی خانہ بدوش قوم جسے انگریزی میں *وومینچو* کہتے ہیں۔ ابھی تک اس کا قطعی طور پر فیصلہ نہیں ہو سکا ہے کہ یہ کس نسل کے لوگ ہیں اور ان کا اصل وطن کہاں تھا۔

لے دستہ ٹف سکی نے ۱۸۸۰ میں نپکن پر ایک تقریر کی جو نپکن کے خیالات کی بہترین تشریح ہے اور جس نے قوم کی نظروں میں شاعر کی عظمت بہت بڑھا دی۔ دستہ ٹف سکی "سلاف دوست" تھا اور یورپ کی تقلید کا سخت مخالف، لیکن اس کی تشریح میں کوئی مبالغہ نہیں معلوم ہوتا اور اس کی رائے ان نقادوں سے یقیناً زیادہ مستند ہے جو نپکن کو بائرن کا نقال قرار دیتے ہیں۔

طبیعت رکھنے والے آدمی پیدا کیے جنہیں کسی طرح چین نصیب نہیں ہوتا، جو کسی چیز سے مطمئن نہیں ہو سکتے، جنہیں اپنے وطن اور اس کی قوتوں پر مطلق اعتبار نہیں... جو اپنے ہم وطنوں سے محبت اور ہمدردی نہیں کرنا چاہتے۔ زندگی کے بنیادی اصولوں سے انکار اور ہم جنسوں سے بے تعلقی ایسی ہستیوں کو ہمیشہ مصیبت میں مبتلا رکھتی ہے۔ پشکن کی سب سے لمبی نظم اور اس کا ادبی کارنامہ، "یف گے نئی اون یے گن" اسی سیرت کو دوسری شکل اور دوسرے ماحول میں دکھاتا ہے اور ان دونوں سیرتوں کی عمومیت کی سب سے قوی دلیل یہ ہے کہ پشکن کے بعد جس کسی انشا پرداز نے تعلیم یافتہ روسیوں کا مثالی نمونہ پیش کرنا چاہا اس نے الے کو اور یف گے نئی اون یے گن کی بہت سی خصوصیات اپنے ہیرو کی سیرت میں شامل کیں۔

"نٹ" کا قصہ یہ ہے کہ ایک روسی الے کو اپنے دیس اور دیسی زندگی سے بیزار ہو کر نٹوں کے ایک قبیلے کے ساتھ ہو لیتا ہے اور ایک نٹنی زیمفیرا سے اس کے عاشقانہ تعلقات ہو جاتے ہیں۔ دو ڈھائی سال بعد زیمفیرا کی طبیعت اس کی صحبت اور محبت سے سیر ہو جاتی ہے اور نٹوں کی آزاد رسم کے مطابق وہ کسی اور شخص سے آشنائی کر لیتی ہے۔ روسی اس کی سرد مہری محسوس کرتا ہے اور ایک مرتبہ رات کو زیمفیرا اور اس کے آشنا کو ایک جا پا کر دونوں کو مار ڈالتا ہے۔ اس جرم کی سزا میں نٹ اسے اپنے قبیلے سے نکال دیتے ہیں۔ نظم کی خوبی داستان میں نہیں، بلکہ من موعی روسی اور سادہ لوح نٹوں کی سیرت اور ذہنی خصوصیات کے موازنے میں ہے۔ روسی نے شہر اور شہری طرز معاشرت

سے بیزار ہو کر نوٹوں کی سادہ زندگی میں پناہ لی ہے۔ اپنی معشوقہ کے سوال پر وہ شہری زندگی کی یوں شکایت کرتا ہے:-

”وہاں لوگ ذرا سی جگہ میں بھج بھج کر رہتے ہیں۔

صبح کی ٹھنڈی ہوا ان کے آنکھوں تک نہیں پہنچتی،

نہ بہار کے موسم میں سبزہ زار کی خوشبوئیں،

وہ محبت سے شرماتے ہیں، دل کی اُمنگیوں کو ابھرنے نہیں دیتے۔

اپنی آزادی دوسروں کے ہاتھ بچتے ہیں،

مورتوں کے سامنے سجدہ کرتے ہیں۔

اور روپے کے لالچ میں غلامی کی زنجیریں پہنتے ہیں۔

شہر چھوڑ کر میں نے کیا کھویا؟ دغا بازی کی تکلیفیں،

تعصب کے فیصلے، عوام کی اینارسانی،

اور بھڑکیلے عیب!

اب وہ روسی نوٹوں کی صحبت میں رہنے لگا، جہاں بظاہر اسے ہر طرح

کا سکون تھا،

وہ سویرے اٹھ کر اپنا دن

خدا کی مرضی پر چھوڑ دیتا،

اور زندگی کے ہنگامے

اس کی آسودگی میں خلل انداز نہیں ہوتے تھے،

صرف کبھی کبھی شہرت کا افسوں گریستارہ

اسے دور سے بھاتا تھا...
 مگر خدا کی پناہ! نفسانی جذبات
 اس کے بے بس دل کے ساتھ کس طرح کھیلتے تھے،
 اور اس کے مصیبت زدہ سینے میں
 کس زور شور سے ابل اٹھتے تھے!

اس حالت میں زلفیرا کی محبت اس کے لیے ایک بہت بڑا سہارا تھی
 لیکن جب اسے معلوم ہوا کہ اس عورت کی طبیعت اس سے ہٹ گئی ہے اور وہ
 دوسرے آشنا کی تلاش میں ہے تو بجائے اور نمٹوں کی طرح مسکرا کر سر جھکاینے
 کے وہ اپنے رقیب کو جان سے مارنے پر تکل گیا۔ زلفیرا کے بوڑھے باپ کی
 دلیلیں کہ:

جوان دل پرندوں سے بھی زیادہ خود سر ہوتے ہیں،
 ان کو قابو میں رکھنا کسی کے بس کی بات نہیں،
 مسرت باری باری سے ہر ایک کو ملتی ہے،
 مگر جو کچھ ہو چکا وہ پھر سے ہونے والا نہیں۔
 روسی کی سمجھ میں نہیں آتی ہیں۔ وہ جواب دیتا ہے:-
 نہیں، میں ایسا نہیں ہوں، میں بغیر لڑے ہوئے
 اپنے حق کو ہرگز نہ چھوڑوں گا،
 یا کم از کم بدلے کر اپنے جی کو خوش کر لوں گا۔
 نہیں، اگر میں سمندر کے کنارے، کسی اونچی چٹان پر

اپنے دشمن کو سوتا پاؤں ،

تو قسم کھاتا ہوں ... بغیر کسی افسوس یا تامل کے اس ظالم کو

لات مار کر سمندر کی موجوں میں پھینک دوں ۔

اس کی اچانک بیداری اور خوف کے لرزے کا

ایک خونخوارانہ قہقہے سے جواب دوں ،

اور بہت دنوں تک اس کے گرنے کی آواز

یاد کر کے ہنسوں اور خوش ہوں ۔

ایسی طبیعت ظاہر ہو کسی ماحول سے ہم آہنگ نہیں ہو سکتی ۔ شہروں سے

وہ خود بھاگتی ہے ، سادہ لوح انسان اسے اپنی صحبت کے لیے موزوں نہیں

پاتے ۔ ز مفر کا بوڑھا باپ آخر کار اے کو سے کہنے پر مجبور ہوتا ہے کہ :

ہمارا ساتھ چھوڑ دے ، اے مغرور آدمی !

ہم وحشی ہیں ، ہمارے لیے کوئی قانون نہیں ،

ہم نہ جرم کرتے ہیں نہ سزا دیتے ہیں ،

ہم کو خون اور آہ و زاری کی حاجت نہیں ،

مگر ہم قاتل کے ساتھ رہنا نہیں پسند کرتے ،

تو آنا و زندگی کے لیے نہیں پیدا ہوا ،

تو صرف اپنی مرضی پر چلنا چاہتا ہے ...

ہمارے دل مضبوط نہیں ، مگر ہم دل کے اچھے ہیں ،

تو بد طبیعت اور بے باک ہے ۔

ہمارا ساتھ چھوڑ دے۔

وحشیوں کی سماج سے روسی اس شان سے نکالا گیا۔ ہند ب شہری زندگی میں اس کی بے چین اور وحشت زدہ طبیعت جو رنگ لاتی ہر اسے پشکن نے اپنے ناول "یف گے نئی اون یے گن" میں دکھایا ہے۔

یف گے نئی اون یے گن، داستان کا میر و پتیر برگ میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ ایک اعلیٰ عہدے پر نوکرتھا اور صاحب جائیداد بھی تھا، مگر ایسا فنول خرچ کہ اس کی بسر اوقات قرضے پر ہوتی تھی اور آخر کار دعوتیں دیتے دیتے اس کا دیوالہ نکل گیا۔ لیکن تقدیر اون یے گن پر مہربان تھی۔ پہلے اس کے یے ایک فرانسیسی کھلائی رکھی گئی اور اس کے بعد ایک فرانسیسی استاد، جو

اس خیال سے کہ بچہ پریشان نہ ہو

ہر چیز اسے کھیل کھیل میں پڑھاتا تھا،

سخت اخلاقی تعلیم سے اسے آزر دہ نہ کرتا،

شرارت کی سزا میں ذرا چھڑک دیتا

اور بڑے پارک میں ٹھلانے لے جاتا۔

اون یے گن جب سولہ سترہ برس کا ہوا تو فرانسیسی استاد نکال باہر کیا

گیا، اور

لیجے میرا دن یے گن آزاد ہو گیا۔

جدید ترین طرز پر بال کٹائے ہوئے،

لندن کے چھیلوں کی طرح بنا ٹھنا

وہ دنیا دیکھنے نکلا۔

اس کی تعلیم معمولی ہوئی تھی، علمی استعداد کم تھی، لیکن

وہ بے تکلفی سے فرانسیسی

بولتا اور رکھتا تھا،

مروڑ کا بڑی نزاکت سے ناچتا،

اور خوش اخلاقی سے ملتا جلتا۔

اس سے زیادہ چاہیے کیا؟ سوسائٹی نے طو کیا

کہ وہ بڑا قابل ہی اور بہت ہی پیارا۔

سوسائٹی کی عام رائے کے باوجود لپٹکن بتا دیتا ہے کہ اس کا ہیرو نظم کی
بحروں میں فرق نہیں کر سکتا تھا اور روسی مصنفوں کو گالیاں دیتا تھا۔ معاشیات
کا عالم سمجھے جانے کے سوا اسے اور کوئی علمی حوصلہ نہ تھا اور یہ بھی محض اس وجہ سے
کہ ان دنوں روس میں ایڈم سمٹھ کا بہت چرچا تھا۔ اون یے گن کی اس بے
پردائی کا اصل سبب یہ تھا کہ اس نے ایک فن میں کمال حاصل کیا تھا جس کے
مقابلے میں اور سب کچھ ریح ہی۔

ہم کو جنسی جذبات شروع ہی سے پریشان کرتے ہیں۔

اور جیسا کہ شتوبریاں نے لکھا ہے،

۱۵ ایک خاص قسم کا اجتماعی ناپح جو اس زمانے میں بہت مرغوب تھا۔

۱۶ انگریز ماہر معاشیات (۱۷۲۳ - ۱۷۹۰)

۱۷ فرانسیسی انشا پرداز (۱۷۶۸ - ۱۸۲۸)

ہم کو عشق کا پہلا سبق فطرت نہیں پڑھاتی،
بلکہ پہلا گنڈا ناول -

ہم زندگی کی اصلیت معلوم کرنے کے لیے بیتاب ہوتے ہیں
اور ناول ہمیں سب کچھ بنا دیتے ہیں -

یوں عمر گزرتی جاتی ہی اور ہم
اس سے کوئی لطف نہیں اٹھانے پاتے -

ایک دلفریب تجربے کو قبل از وقت حاصل کر کے
ہم اپنی زندگی بے مزہ کر دیتے ہیں،

سرت ہماری نظروں سے چھپ جاتی ہے اور اسی کے ہمراہ
جوانی کا جوش بھی غائب ہو جاتا ہے -

اون بے گن پر بھی یہی گزرا، لیکن اس کے عوض میں
اس نے نسوانی فطرت کو بھی کیا خوب سمجھ لیا!

اس نے مکر اور حسد اور دھوکا بازی، روٹھنا، بگڑنا، افسردہ اور بیمار بننا
سیکھا، دلبری کی راہ و رسم میں انتہائی مہارت حاصل کی اور اپنا شکار پھانسنے
میں مشاق ہو گیا، او باشی نے اس کی ہر دلغیزی میں کوئی فرق نہیں ڈالا،
اس کے پاس ہر طرف سے دعوت نامے آتے تھے اور دوپہر سے جب وہ سو کر
اٹھتا، تین چار بجے صبح تک، جب وہ ناچ سے تھک کر اپنے گھر واپس جاتا،
اس کا سارا وقت کپڑے بدلنے اور ایک میزبان کے یہاں سے دوسرے کے
یہاں جانے میں صرف ہوتا۔ درمیان میں، رات کے آٹھ نو بجے کے قریب، وہ

کبھی کبھی تھیسٹر چلا جاتا، لیکن شاعر افسوس کے ساتھ اعتراف کرتا ہے کہ فنونِ لطیفہ سے محفوظ ہونے کی اس میں مطلق صلاحیت نہ تھی۔

ایسی زندگی کی ظاہری چمک دمک سے اون یے گن کی طبیعت بہت جلد اکتا گئی، حسن پرستی اور عیاشی اور معصوم دلوں کا اور غلاما بھی ایک بے لذت شغل ہو گیا۔ اون یے گن کمرے میں بند ہو کر بیٹھنے لگا، کچھ دن کتابوں کے مطالعے میں گزارے اور پھر وہ بھی چھوڑ دیا۔ زندہ مردوں اور عورتوں سے بیزاری اور جدید اور قدیم خیالات سے بے تعلقی نے اس کی طبیعت افسردہ اور اس کی زبان زہریلی کر دی اور یہی دو کیفیتیں اس کے احساسات کا کل سرمایہ رہ گئیں اور لوگوں کی حالت بھی کبھی کبھی ایسی ہی ہو جاتی ہے، مگر تمام عمر کی مایوسی کے بعد یا کسی سخت صدمے سے۔ اون یے گن کی عمر بھی صرف بیس سال تھی اور قسمت نے اسے ہر صدمے سے محفوظ رکھا تھا۔ یہ کیفیتیں اس کی فطرت کا ایک پہلو تھیں اور اس کی تربیت اور طرزِ معاشرت کا ایک لازمی نتیجہ۔

اس دوران میں اس کے باپ کا انتقال ہو گیا اور قرضداروں کا اس کے گرد ہجوم ہونے لگا۔ اُن سے پچھا چھڑانے کو اون یے گن نے اپنی آبائی جائداد ان کے نذر کر دی۔ خوش قسمتی سے انھیں دنوں اسے یہ خبر ملی کہ اس کا چچا بتر مرگ پر ہے اور بھتیجے سے ملنے کا بہت مشتاق، کیونکہ اس نے بھتیجے کو اپنا وارث بنایا ہے۔ اون یے گن شہری زندگی سے ویسے بھی اکتا گیا تھا اور اس امید میں کہ شاید وہاں زیادہ دلچسپ ثابت ہو فوراً اپنے چچا کے گانو کو روانہ ہو گیا۔ وہاں پہنچا تو چچا کا دم نکل چکا تھا اور لوگ اسے دفن کرنے کا انتظام کر رہے

تھے تجھیز و تکفین میں جو لوگ شریک ہونے آئے تھے انھوں نے حسب قاعدہ
ہمدردی ظاہر کی، خوب پیٹ بھر کر کھانا کھایا اور اون یے گن کو اس کی ملکیت
پر دکر کے چل دیے۔

دو تین دن اسے ہر چیز نئی معلوم ہوئی،
سنان کھیت، اندھیرے کنجوں کی خنکی،
چننے کے بہنے کی آواز:

تیسرے دن کنج اور پہاڑی اور میدان سے
اسے کوئی دلچسپی نہیں رہی۔

پھر اس نے دن رات اونگھا شروع کیا،
اور اس پر صاف صاف ظاہر ہو گیا۔

کہ شہر کی طرح گاؤں میں بھی جی گھبراتا ہے،
اگرچہ وہاں نہ سڑکیں ہیں نہ عالی شان عمارتیں،
نہ ناچ، نہ تاش، نہ شعر و شاعری۔

افسردگی نے اسے آگھیرا،

ہر جگہ اس کے پیچھے پیچھے پھرنے لگی،

جیسے پرچھائیں یا کوئی ونا دار بیوی،

پہلے پہل ہمائے اس سے ملنے آیا کرتے تھے، لیکن چونکہ ان کے

چھکڑوں کی کھڑکھڑاہٹ سنتے ہی اون یے گن پھوڑے سے گھوڑے پر ٹبھی کر

غائب ہو جاتا تھا، سب اس سے خفا ہو گئے اور آمد و رفت بند کر دی،

ہمارا ہمایہ جاہل ہے، خمبلی ہے،
 وہ فراموش ہے، ایک، گھونٹ میں
 لال شراب کا پورا گلاس پی جاتا ہے۔
 وہ عورتوں کا لحاظ نہیں کرتا،

ہمیشہ ”ہاں“ کہتا ہے اور ”نہیں“ نہ ”جی ہاں“
 نہ ”جی نہیں“۔ یہ عام رائے تھی۔

انہیں ہمایوں میں ایک نوجوان لہن سکی بھی تھا۔ طبیعت اور مزاج میں
 وہ اون بے گن سے اسی قدر مختلف تھا جیسے پانی سے آگ مگر چونکہ دونوں باقی
 تمام ہمایوں سے بہت گھبراتے تھے اور ایک دوسرے کے سوا کسی اور سے علمی
 اور ادبی مسائل پر گفتگو نہیں کر سکتے تھے، اس لیے دونوں میں خاصی دوستی
 ہو گئی۔ لہن سکی شاعرانہ مزاج کا لڑکا تھا، جسے دنیا میں ابھی تک کوئی تلخ تجربہ
 نہیں ہوا تھا۔ اسے محبت اور عشق کے خواب نظر آتے تھے، زندگی کے مقصد کو
 ایک دلفریب معما سمجھ کر وہ اسے حل کرنے کی کوشش میں مصروف رہتا تھا،
 حالانکہ اس کے دوست اون بے گن نے بہت پہلے سے قطعی طور پر معلوم کر لیا
 تھا کہ زندگی میں کوفت اور بد مزگی کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔ لیکن اون بے گن
 کو اپنے نئے دوست کو قائل کرنے کی کبھی خواہش نہیں ہوئی اور نہ اس کے سامنے
 زہرا گلنے کی، اس وجہ سے کچھ عرصے تک دونوں میں خوب نبھی۔

لال شراب چونکہ سیٹھی اور قیمتی ہوتی ہے اس لیے اس کو لوگ عموماً مزہ لے لے کر اور

آہستہ آہستہ پیتے ہیں۔

لین سکی نے اون یے گن کا لارن نامی ایک خاندان سے تعارف کرایا اس
خاندان میں ماں اور دو بیٹیاں تھیں، جن میں سے چھوٹی لڑکی اولگا کی لن سکی سے
منگنی ہو چکی تھی۔ اولگا میں صورت اور سیرت کی تمام خوبیاں تھیں۔ "لیکن"
شاعر کہتا ہے:

"کوئی ناول اٹھا کر دیکھ لیجیے،

اس میں آپ کو اولگا کی تصویر مل جائے گی۔

وہ بہت پیاری ہے، مجھے بھی کسی زمانے میں وہ پسند آتی تھی،

مگر اب میں اس سے بہت گھبرا گیا ہوں۔

اولگا کی بڑی بہن تیتیانامین نے اس کا جیسا حسن تھا نہ اس کی نسی سنگفتگی،

نہ اور کوئی نمایاں اوصاف جو لوگوں کو متوجہ کر سکیں، وحشت زدہ، مغموم، خاموش

وہ اپنے گھر میں بیگانہ معلوم ہوتی تھی، نہ ماں باپ سے محبت کا اظہار کرتی، نہ

بچوں کے کھیل کو دیکھ کر شریک ہوتی۔ اپنے تصورات میں محو رہتا اس کا سب

سے عزیز شغل تھا اور اکثر وہ پورے دن کھڑکی کے پاس بیٹھے بیٹھے گزار دیتی تھی۔

ناولوں کا اسے بہت شوق تھا، اور اس نے بچپن ہی میں ماں کے تمام ناول

چراچرا کر پڑھ ڈالے تھے۔ دیہاتی زندگی اور فضا نے اس کی طبیعت میں ایک عجیب

بے چینی پیدا کر دی تھی، اسے ہر وقت ایک لطیفہ رغیبی کا انتظار رہتا تھا۔ اون یے گن

سے ملاقات ہوئی تو تیتیانامین کو یقین ہو گیا کہ اس کے سارے خوابوں کی تعبیر اس

کے تمام حوصلوں کی بار آوری، اسی شخص کا آنا ہے، کیونکہ اون یے گن اسے ان

تمام خوبیوں کا مجسمہ معلوم ہوا جن سے اس نے اپنے خیالی دوست کی ہستی کو

آراستہ کیا تھا۔ تتیانہ کے جذبات پاک اور معصوم تھے اور اسی سبب سے زیادہ
قوی، محبت کے جوش نے اسے بالکل بے بس کر دیا، دو چار روز میں اس کا
رنگ پیلا پڑ گیا، نہ رات کو نیند آتی نہ دن کو چین ملتا۔

اس کا محبت کرنا کوئی مذاق نہ تھا،

اس نے ایک نا تجربہ کار بچے کی طرح

اپنے آپ کو بالکل جذبات کے حوالے کر دیا۔

اس نے یہ نہ سوچا کہ ابھی ضبط سے کام لوں۔

اس سے محبت کی قیمت بڑھ جائے گی،

اور شکار کا پھنسا یقینی ہو جائے گا۔

پہلے امید دلا کر نہال کر دوں،

پھر خفا ہو کر دکھ پہنچاؤں،

اور اس کے سینے میں رشک اور حسد کی آگ بھڑکاؤں۔

ورنہ مطلب حاصل کر کے اس کا جی بھر جائے گا،

اور چالاک قیدی ہر وقت زنجیریں ترڑا کر

بھاگنے کو تیار بیٹھا رہے گا۔“

آخر کار تتیانہ سے صبر نہ ہو سکا اور اس نے آون لے گن کو خط لکھ کر

اپنی محبت کی داستان سنائی۔ آون لے گن نے اس خط کا کوئی جواب نہیں دیا۔

چند روز بعد جب تتیانہ چھپ کر اس سے ملنے جا رہی تھی اور اتفاق سے باغ

میں دونوں کی ٹڈ بھیر ہو گئی تو آون لے گن نے اسے ایک لمبا چوڑا لکچر سنایا،

اپنی محبوبی ظاہر کی اور تیتیاناکو اس کی حماقت سے آگاہ کیا۔ آخر میں اس نے تیتیاناکو یقین دلایا کہ "اگر گھریو زندگی میری قسمت میں لکھی ہوتی تو آپ کے سوا کسی سے شادی نہ کرتا۔"

مگر میں ان مسرتوں کے لیے نہیں پیدا کیا گیا ہوں،

ان سے میری روح بیگانہ ہے،

آپ کا میرے ساتھ رہنا گویا اپنے حسن و جمال کو ضائع کرنا ہے،

کیوں کہ میں اس کی قدر نہیں کر سکتا۔

یقین جانئے (میرا ضمیر گواہ ہے)

ازدواجی زندگی ہمارے لیے عذابِ جان ہو جائے گی۔

مجھے آپ سے چاہے جتنی محبت ہو

آپ کی صحبت کا عادی ہوا تو یہ محبت جاتی رہے گی۔

آپ روئیں گی اور آپ کے آنسو

میرے دل پر کوئی اثر نہ کر سکیں گے۔

بلکہ اس کی وحشت کو اور بڑھا دیں گے۔

آپ خود فیصلہ کیجیے۔ شادی کر کے ہم کیسی مصیبت میں پڑ جائیں گے،

اور ممکن ہے برسوں اس سے بچھانہ چھٹے؟

اون یے گن نے اس ملاقات کے بعد تیتیاناکو یہاں آمد و رفت بند کر دی

اور گرمی اور جاڑا گھر بیٹھے بیٹھے کاٹ دیا۔ لیکن تیتیاناکو سالگرہ کے دن لہن سکی لے

پھر تیتیاناکو کے گھر پڑے گیا اور اتفاق سے کھانے کے وقت دونوں آمنے سامنے

بٹھا دیے گئے۔ تیتیانہ کی بے چینی اور اس کا مصیبت زدہ چہرہ دیکھ کر اُون نے گن کو دعوت میں شریک ہونے کا سخت افسوس ہوا۔ اسے تیتیانہ کے گھر لے جانے کا ذمہ دار لین سکی تھا اور اس نے لین سکی سے بدلہ لینے کا پتکا ارادہ کر لیا۔ چنانچہ کھانے کے بعد وہ ہر مرتبہ لین سکی کی منگیتر اولگا کے ساتھ ناچتا رہا اور لین سکی کو اس کے پاس بھی نہ بھٹکنے دیا۔ لین سکی نے یہ شرارت دیکھ کر اپنے دل میں یہ طو کیا کہ پستول کے سوا ان دونوں میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا اور ڈیوئل لڑنے کا تہیہ کر کے اپنے گھر چلا گیا۔ دوسرے دن اس نے اُون نے گن کے پاس ڈیوئل لڑنے کا چیلنج بھیج دیا۔ اُون نے گن رات کی سرگزشت بھول گیا تھا، اور لین سکی سے اب اسے کوئی شکایت بھی نہیں تھی، لیکن اس نے چیلنج منظور کر لیا اور مفاہمت کی ذرا بھی خواہش ظاہر نہیں کی۔ ڈیوئل جس دن کے لیے مقرر ہوا تھا وہ معصوموں کی نیند سو کر بستر سے اُٹھتے ہی عینہ مقام پر بھاگا ہوا گیا، جہاں لین سکی کچھ دیر سے اس کا انتظار کر رہا تھا۔ ڈیوئل میں لین سکی کے سینے پر گولی لگی اور وہ وہیں پر گر کر مر گیا۔ اسے مار کر اُون نے گن نہایت درجہ سکون قلب کے ساتھ مکان واپس آیا اور کچھ روز بعد یورپ کی سیر کے لیے روانہ ہو گیا۔

لین سکی کے قتل کی خبر سن کر تیتیانہ کے گھر میں ماتم برپا ہو گیا۔ لیکن یہ غم صرف چند روزہ تھا، اولگا سے ایک فوجی افسر نے شادی کر لی اور اسے اپنے ساتھ لے کر چلا گیا۔ اگر یہ حادثہ کسی پرگراں گزرا تو تیتیانہ پر، جو اپنے رنج میں گھٹتی رہی۔ اس کے جذبات کے خلوص اور شدت نے اس کی اجازت نہ دی کہ وہ اولگا کی طرح کسی اور سے شادی کرے اور جو کچھ ہوا تھا اسے بھول جائے۔ وہ شادی کرنے سے قطعی انکار کرتی رہی، یہاں تک کہ اس کی ماں بہت پریشان ہو گئی۔ کسی نے مشورہ دیا کہ اگر

تتیا ناما سکو جائے تو شاید اسے اپنی پسند کا شوہر مل جائے اور تتیانام کی ماں اس کو اسی غرض سے ماسکو لے گئی۔ ماسکو جا کر تتیانام نے اپنی رائے نہیں بدلی، نہ اُون نے گن کی محبت کو اپنے دل سے نکالا۔ مگر ماں اور تمام عزیزوں کے اصرار پر اس نے ایک ایک امیر حیرل سے نکاح کر لیا۔ اس کی شادی کے دو سال بعد اُون نے گن یورپ سے واپس آیا اور پیٹر برگ کی کسی محفل میں تتیانام کو اس نئے رنگ میں دیکھا۔ صورت سے زیادہ اسے تتیانام کی سیرت کے تغیر پر حیرت ہوئی۔ وہی لڑکی جو جذبات کی شدت سے بے بس ہو جایا کرتی تھی اب ایک مغز خاتون تھی جسے اپنی طبیعت اور زبان اور چہرے پر پورا قابو تھا، جس کا چھوٹے بڑے سب کاظا کرتے تھے اور جسے اپنے وقار کو قائم رکھنے کا راز معلوم تھا۔ تتیانام سے جب اُون نے گن کا تعارف کرایا گیا تو اس نے اپنی محبت کو، جو ابھی تک اس کے دل میں تازہ تھی، کسی طرح ظاہر نہیں ہونے دیا، اور اُون نے گن سے یوں مخاطب ہوئی گو یا دونوں کی پہلی مرتبہ ملاقات ہو رہی ہے۔ اُون نے گن اس کی شان و شوکت سے بہت مرعوب ہوا اور اسے اس شہرت پر بہت رشک آیا جو دراصل تتیانام کی سادگی اور خلوص کا ایک ادنیٰ معاوضہ تھی۔ اس نے تتیانام سے پُرانے تعلقات دوبارہ قائم کرنا چاہے، کئی خط لکھے جن کا کوئی جواب نہیں ملا، ملاقات کی، مگر مطلب کی باتیں نہیں کر سکا۔ اسی اثناء میں وہ بیمار ہو گیا اور آخر کار ایک روز وہ بسترِ علالت سے اٹھ کر سویرے تتیانام کے محل پر اپنی قسمت کا قطعی فیصلہ کرانے کے ارادہ سے گیا۔ خادموں نے اسے سیدھا تتیانام کے کمرے میں پہنچا دیا اور اس نے دیکھا کہ تتیانام بیٹھی رو رہی ہے۔ اُون نے گن اس کے پیروں پر گر پڑا، لیکن تتیانام نے اسے صاف صاف سمجھا دیا کہ اسے یہ نیا انداز ناگوار

معلوم ہوتا ہے اور اپنی بے رخی کی وجہ بھی بتا دی۔
 کیا یہ غلط ہے کہ اُن دنوں اس ویرانے میں،
 جہاں ہماری محبت کا چرچا کرنے والے نہ تھے،
 میں تمہیں نہیں پسند آئی؟ ... اب کیا ہوا
 جو تم میرا پیچھا کیے ہو؟ ... اس کا سبب بس یہ ہے
 کہ میں رئیسانہ مجلسوں میں شریک ہوتی ہوں،
 میں امیر اور مشہور ہوں، ... اب میری بدنامی کی خبر
 ہر شخص کے کانوں تک پہنچ جائے گی،
 اور ممکن ہے سوسائٹی میں تمہارے مذاق کے لوگ
 اس کارنامے کی وجہ سے تم پر رشک کرنے لگیں ...
 لیکن میں اسی وقت بڑی خوشی سے
 اس مہمل زندگی کی نمائش، شور و غل اور دھوئیں کو
 کتابوں کی ایک الماری، ایک خود رو باغ،
 اپنے اجڑے آبائی مکان
 یا اس مقام کے بدلے چھوڑنے پر تیار ہوں
 جہاں اُون لے گن، تم سے پہلی ملاقات ہوئی تھی،
 اس حقیر قبرستان کے بدلے
 جہاں میری بوڑھی کھلائی کی قبر ہے
 ایک صلیب گڑھی ہے اور درختوں کا سایہ ہے ...

اب میری قسمت کا فیصلہ ہو چکا۔۔۔
 میں نے شادی کر لی ہے۔ تم کو چاہیے۔
 کہ... مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔
 میں باتیں نہیں بناتی۔ مجھے تم سے محبت ہے
 لیکن میں دوسرے کی بیوی ہوں،
 اور ہمیشہ وفادار رہوں گی۔

تتیا نایہ کہہ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی، اور اُون یے گن کے ابھی تک
 حواس درست نہیں ہوئے تھے کہ اسے پانوں کی آہٹ سنائی دی اور تتیا ناکا
 شوہر کمرے میں داخل ہوا۔ لٹیکن نے اپنی داستان اسی نازک موقع پر ختم کر دی ہے
 خوش قسمت ہے وہ جو دنیا کے دسترخوان سے
 جلد اٹھ گیا؛ جس نے زندگی کے شراب سے لیریز پیالے کو
 بالکل خالی نہیں کر دیا؛
 جس نے زندگی کا فائدہ آخر تک نہیں سنا،
 بلکہ دفعتاً اٹھا اور خست ہو گیا۔
 جیسے میں اپنے اُون یے گن سے۔“

لٹیکن کا ظرافت آمیز طرز بیان پڑھنے والے کو محسوس نہیں ہونے دیتا کہ
 ”یہ گے نئی اُون یے گن“ کی داستان کس قدر دردناک ہے اور اس کا انجام کتنا
 عبرت انگیز۔ اس کی بھی شاعر خاص طور سے کوشش کرتا ہے کہ اس کا رنج یا غصہ یا
 تعصب کوئی مصنوعی فضا نہ پیدا کر دے جس میں نظم کے اشخاص اصل سے ذرا بھی

مختلف نظر آئیں اور وہ اپنے ذاتی احساسات کو اس طرح چھپاتا ہے کہ نکتہ بیخ قدر کا ہی سمجھ سکتے ہیں کہ اسے اپنے ہیرو کی گمراہی پر کتنا افسوس ہو اور اپنی ہیروئن کی سرگزشت پر وہ کیسے گرم آنسو بہاتا ہے۔ لیکن اس ضبط کے باوجود بھی "یف گے نی اون یے گن" کی داستان روسی قوم کا نوحہ کہلاتی ہے اور بصیرت افزوہ حقیقت نگاری کا روسی ادب میں پہلا نمونہ اون یے گن اور تیتیاناکا قصہ کوئی اتفاتی منظر نہیں۔ یہ دونوں تعلیم یافتہ روسیوں کے مثالی نمونے ہیں اور ان پر جو کچھ گزرا وہ نوجوان روسیوں کے عام تجربے کی ایک شکل ہے۔ اون یے گن نے جو تربیت پائی، اُس نے جو کمالات حاصل کیے اور اس کی سیرت نے جو رنگ اختیار کیا وہ کوئی ذاتی خصوصیت نہیں تھی بلکہ ایک وبا کا اثر جس سے کوئی روسی نوجوان بالکل محفوظ نہ رہا ہو گا۔ اون یے گن کی نسبت پتیر برگ کے شرفا کی عام رائے کہ "وہ بڑا قابل ہے اور بہت ہی پیارا" مروجہ فلسفہ حیات پر مبنی تھی اور کوئی جانب دارانہ فیصلہ نہیں کہی جاسکتی، لیکن نے محسوس کیا کہ ماحول کے اثرات سے ایک خاص ذہنیت اور مزاج کے لوگ پیدا ہو رہے ہیں اور ایک ایسے شخص کی تصویر بنا کر جس میں یہ نیارنگ بہت نمایاں تھا اس نے قوم کو اس منظر کی خطرناک صلیت سے آگاہ کر دیا۔ اون یے گن کے مقابلے میں تیتیاناکا کی سیرت دکھا کر اس نے اپنا مطلب اور بھی واضح اور عبرت آموز کر دیا۔ تیتیانانے ناول تو پڑھے ہیں اور ان کے پڑھنے سے کسی قدر جذبات پسند بھی ہو گئی ہے، لیکن اسے اپنے قومی آئیں اور طرز معاشرت سے بہت لگاؤ ہے، اپنی خود داری کا بہت پاس ہے اور جیسا کہ نظم کے انجام سے ظاہر ہوتا ہے وہ اپنے اصولوں پر ذاتی مسرت اور آرزو میں

نثار کرنے کی ہمت رکھتی ہے۔ اون یے گن کی سیرت میں بہت سی خرابیاں، اس کی نیک نامی پر بہت سے داغ ہیں، لیکن تیتیاناجیبی لڑکی کے جوہر نہ پہچان سکتا ایسی کم ظرفی اور بد شوقی کی دلیل ہے جو نہ شاعر معاف کر سکتا ہے نہ داستان کے ناظرین اور لٹیکن کا گلہ بھی ہے کہ روس میں اون یے گن جیسے ہزار ہا نوجوان ہیں اور تیتیاناجیبی ہزار ہا لڑکیاں جو اپنے اپنے طور پر نسوانی سیرت کی اعلیٰ مثالیں ہیں، مگر بے قدری ان کے حسن پر پردہ ڈالے ہوئے ہے۔

اون یے گن اور تیتیاناکا قصہ داستان کا مرکز ہے، لیکن قصہ سنانے کی پابندی سے لٹیکن کا موضوع یا اس کی نظر محدود نہیں ہو جاتی۔ دارالسلطنت کی زندگی، اعلیٰ سوسائٹی کی شخصیتیں اور صورت مزاج اور مذاق کے وہ عجوبے جو اس طبقے میں کثرت سے پائے جاتے ہیں نہایت دلچسپ طریقے سے پیش کیے گئے ہیں۔ مگر لٹیکن کی مصوری کا کمال روس کی دیہاتی فضا اور مختلف موسموں کے مناظر اور کیفیتوں کے بیان میں نظر آتا ہے۔ روسی بچے اب تک لٹیکن ہی کے اشعار پڑھ کر دیہاتی زندگی کو شاعرانہ نظروں سے دیکھنا اور اس سے پورا لطف اٹھانا سیکھتے ہیں اور یہی ان کے واسطے وطن پرستی کا پہلا سبق ہوتا ہے۔ اون یے گن اور تیتیاناکا داستان کا دیہاتی پس منظر اس کی تاثیر کو اور بھی بڑھا دیتا ہے اور پڑھنے والے کے ذہن میں روسی معاشرے اور سر زمین کا ایک خاص تصور قائم کر دیتا ہے۔ لٹیکن کے زمانے تک ایسا کوئی تصور نہیں تھا اور لٹیکن نے اسے جس شکل میں اور جس انداز سے پیش کیا وہ آئندہ نسلوں کے لیے صرف بصیرت افزا نہیں بلکہ ہمت افزا اور تسلی بخش بھی ثابت ہوا۔

”یہ کے نئی اون لے گن“ کی تصنیف میں نو سال صرف ہوئے۔ اس عرصے میں لٹکن نے اور لمبی نظیں اور ڈراما کے طرز پر داستانیں بھی لکھیں۔

”بیخی سرائے کا فوارہ“ ایک تاتار سردار کے حرم کا قصہ ہے جہاں ایک بیوی دوسری کو مار ڈالتی ہے اور جرم کی سزا پاتی ہے ”پولتاوا“ میں سپتر اعظم اور سوئیڈن کے بادشاہ چارلز دوازدہم کی مشہور جنگ کی داستان بیان کی گئی ہے اور اسی کی آرٹ میں آزادی اور قوم پرستی کی مدح سرائی بھی کی گئی ہے، کیوں کہ چارلز دوازدہم کے ساتھیوں میں چند ایسے سردار بھی تھے جو اپنے وطن کو سپتر اعظم کے قبضے سے چھڑانے کے لیے لڑ رہے تھے۔ ”کنجوس امیر“۔ ”موٹسارٹ اور سالییری“ اور ”پتھر کی مورت“ طرز کے اعتبار سے تو ڈرامے ہیں، لیکن ان کی اصل خوبی مثنوی کی ہے اور لٹکن کا مقصد بھی شاعری تھی، اس لیے انھیں نظیں ہی سمجھنا چاہیے۔ ”موٹسارٹ اور سالییری“ کا موضوع حسد ہے اور اس ڈراما میں سالییری، موسیقی کا ایک استاد جو ”زور بازو“ سے اپنے فن میں مہارت حاصل کرنا چاہتا ہے اور کامیاب نہیں ہوتا موٹسارٹ کو زہر دیدیتا ہے، کیونکہ موٹسارٹ کو اپنی حیرت انگیز خلقی استعداد کی وجہ سے مہارت اور شہرت دونوں بن مانگے مل گئی ہیں۔ ”پتھر کی مورت“ میں ہسپانیہ کے ایک نامی نسوانی دلوں کے رہنر دون جوآن کی سرگزشت کا ایک واقعہ بیان کیا گیا ہے اور روسی نقادوں کا دعویٰ ہے کہ دون جوآن کی سیرت اسے دولت گانگ انا دے کس موٹسارٹ (۱۷۵۶-۱۷۹۱) یورپ کے سب سے ممتاز موسیقی کے ماہروں میں سے تھا۔ اس کی موت طبعی تھی لیکن اسے خیال تھا کہ کسی نے اسے زہر دیدیا ہے۔

اس سے بہتر کہیں نہیں پیش کی گئی ہے۔ لیکن شاعرانہ خوبیوں کے لحاظ سے "یف گے
 نئی اون یے گن" کے بعد ان کہانیوں کا درجہ آتا ہے جو لشکن نے نظر بندی کے رٹنے
 میں اپنی بوڑھی کھلائی کی زبانی سنیں اور عوام کے طرز پر نظم کہیں۔ لشکن کا گانہ "گانو"
 چرچا ہوا تو اس کی اعلیٰ ادبی تصانیف سے کہیں زیادہ ان کہانیوں کی وجہ سے
 اور اس وقت تک "زارسلتان" "دولھا" "پادری اور اس کا نوکر بلدا"۔
 "پھلی اور ماہی گیر" اور "سہرا مرغا" اسی قدر مقبول ہیں جتنی وہ لشکن کے زمانے
 میں تھیں۔

"یف گے نئی اون یے گن" کی تصنیف کے بعد بھی لشکن نظم میں داستانیں
 لکھتا رہا۔ ان میں سے بہترین "تانبے کا سواڑ" پیتر برگ کے ایک باشندے کا
 قصہ ہے جس کی معشوقہ کا مکان دریائے نے وا کے ایک سیلاب میں بہ گیا اور وہ
 خود ڈوب کر مر گئی۔ اس شخص کا صدمے سے دماغ پھر گیا اور اس کے مجنونانہ تخیل
 پر پیر اعظم کی مورت کے رعب اور پیتر برگ کی فضا کا جو اثر ہوتا ہے وہ لشکن نے
 اس طرح سے بیان کیا ہے کہ پیر اعظم ایک جادوگر معلوم ہونے لگتا ہے اور پیتر برگ
 ایک طلسمی شہر۔ پیر اعظم کا بنایا ہوا شہر روس کے اور شہروں سے اتنا ہی مختلف اور
 ملک کے لحاظ سے اتنا ہی ناموزوں تھا جتنے کہ وہ روسی اپنی قوم سے جدا اور
 بیگانہ ہو گئے تھے جنہوں نے پیر اعظم کی پیروی میں اور اس کے حکم کے مطابق اپنی
 لے دون جوآن کی شخصیت مختلف شکلوں میں یورپ کے ہر ملک کے ادب میں ملتی
 ہے۔ انگریزی شاعر بارن نے بھی "دون جوآن" کے عنوان سے اس کے
 متعلق ایک نظم لکھی ہے۔

پُرانی وضع چھوڑی تھی۔ لٹکن کی طرح بہت سے اتسا پردازوں نے پیتربرگ کی خاص فضا اور وہ کیفیتیں جو وہ انسان میں خود بخود پیدا کرتی ہیں بیان کی ہیں اور اس میں شک نہیں کہ اس فضا کا پیتربرگ کے باشندوں کی سیرت پر بہت بڑا اثر ہوا ہے۔ یہ بھی لٹکن کے وجدان اور ادراک کی خوبی تھی کہ اس نے وہ اثر محسوس کر لیا جس کی بعد کو "سلاف دوست" مصنفوں نے شکایت کی اور اسے بیان بھی اس طرح کیا کہ ترمیم کی بہت کم گنجائش رہی۔

"تابنے کے سوار" اور متعدد مختصر نظموں کے علاوہ لٹکن نے ۱۸۳۳ میں ایک ڈراما "بورس گو دونوف" بھی لکھا جس کا موضوع اوان چہارم کی موت کے بعد کی طوائف الملوک کی ہے اور دیتری نامی ایک شخص کی بغاوت جس نے زار کے بڑے بیٹے ہونے کا دعویٰ کیا تھا۔ لٹکن ڈراما نویس نہیں تھا، اور یہ مشق اسے فن میں ماہر بنانے کو بہت ناکافی تھی۔ روسی نقاد شکایت کرتے ہیں کہ لٹکن نے اس ڈراما میں نہ کوئی کیرکٹر اچھی طرح دکھایا ہے نہ کسی قسم کی جدت کی ہے، لیکن پھر بھی نظم کے لحاظ سے ڈراما میں دو تین سین اچھے ہیں، خصوصاً وہ جہاں ایک بڑھا راہب رات کو چراغ کے سامنے بیٹھا دکھایا گیا ہے۔ راہب مورخ ہے اور چونکہ وہ بہت بوڑھا ہو گیا ہے اس کی تاریخ، جس میں اس نے اپنے زمانے کے تمام واقعات درج کیے ہیں، ختم ہونے والی ہے۔

بس ایک آخری داستان اور ہے
 اور پھر یہ تاریخ ختم ہو جائے گی۔
 وہ فرص جو خدا کی طرف سے مجھ گنہگار کے لیے مقرر ہوا تھا
 ادا ہو گیا۔ خدا نے مجھے اس طویل دور کا

عینی گواہ بلاوجہ نہیں بنایا،
 نہ مجھے لکھنے پڑھنے کا سلیقہ بیکار عطا کیا۔
 کبھی نہ کبھی کسی محنت کش راہب کو
 میری گنام مگر شوق اور ایمانذاری سے لکھی ہوئی داستان ملے گی۔
 میری طرح وہ بھی اپنا چراغ جلانے گا۔
 اور اس کے صفحوں سے صدیوں کی گرد جھاڑ کر
 اس کے سچے واقعات کو نقل کرے گا...
 میں بڑھاپے میں دوبارہ زندہ ہو رہا ہوں
 جو کچھ دیکھ چکا ہوں وہ پھر آنکھوں کے سامنے آ رہا ہے۔
 کیا بہت عرصہ ہوا کہ زندگی کا طوفانی سمندر
 موجیں مارتا ہوا گزرا تھا؟
 اب وہ خاموش اور پرسکون ہے؛
 مجھے بہت کم صورتیں یاد ہیں،
 بہت کم باتیں،
 اور جو کچھ بھولا ہوں وہ ہمیشہ کے لیے ر
 لیکن چراغ بجھ رہا ہے، دن قریب ہوگا۔
 بس ایک آخری داستان اور ہے۔

پشکن کی مختصر نظموں زیادہ تر عشقیہ ہیں، لیکن اس کے میدان کی وسعت

لہ یعنی نوشتہ داستانیں پڑھ کر۔

اور مذاق کی ہمہ گیری ثابت کرنے کو "پیغمبر" شاعر اور کتب فروش "زندگی کی
 رتھ" "بھوت" "نوحہ" "ہم مشربوں سے خطاب" بہت کافی ہیں۔ ان کے
 علاوہ ننگن نے مغربی سلاف نسلوں کے بہت سے گیتوں اور داستانوں کا ترجمہ
 کیا اور فارسی، عربی، قدیم یونانی اور روسی، اطالوی، ہسپانی، فرانسیسی، جرمن
 پوستانی اور انگریزی شاعروں کے مخصوص قومی طرز میں بھی طبع آزمائی کی۔ اس
 کے کلام کے مجموعہ میں قرآن شریف کی چند آیتوں کا ترجمہ بھی موجود ہے۔ مگر ننگن کا
 علم اس کے مذاق کی طرح ہمہ گیر نہیں تھا، انگریزی اور فرانسیسی شاعروں کے
 سوا اس نے کوئی ترجمہ براہ راست اصل سے نہیں کیا، اور دوسروں کے طرز
 کی کامیاب نقل کرنے کے لیے اس کی معلومات کافی نہیں تھیں۔ اسے ایک خامی
 نہ سمجھنا چاہیے، بلکہ اس کے برعکس اس شوق کی تعریف کرنا چاہیے جو کسی کارنامے
 سے مطمئن نہ ہو سکا اور ہمیشہ وسعت اور بلندی کا آرزو مند رہا۔

ننگن کی ایک عشقیہ نظم ملاحظہ ہو:

مجھے زندگی کا وہ حیرت انگیز لمحہ یاد ہے،

جب تو میرے سامنے نمودار ہوئی

ایک دیدار کی طرح جو دم بھر کے لیے عطا ہوا،

ایک حسن کا مجسمہ جو اپنی جھلک دکھلا گیا،

بہت دنوں تک جب کوئی لادوا درو مجھے تڑپاتا

یا میں دنیا کے شور و غل اور لغویات سے پریشان ہو جاتا

تو تیری نرم آواز میرے کانوں میں گونجنے لگتی

اور تیرا پیارا چہرہ مجھے خواب میں نظر آیا کرتا =
 زمانہ گزرتا گیا، جذبات کی باغیانہ شورشوں نے
 پڑانے خواب منتشر کر دیے۔

میں تیری نرم آواز بھول گیا
 اور تیرا پیارا چہرہ۔

جلا وطنی کے گوشے، جلائی کی تاریکی میں
 میری عمر اپنی سست رفتار سے گزرتی رہی۔
 نہ کوئی ایسا تھا جس کی ناز برداری کروں، یا جو میرے جسم
 میں جان پھونکے،
 نہ آنسو تھے، نہ زندگی، نہ محبت۔

میرے دن پھرے، میرا دل بیدار ہوا،
 تو پھر میرے سامنے نمودار ہوئی۔
 ایک دیدار کی طرح جو دم بھر کے لیے عطا ہوا،
 ایک حسن کا مجسمہ جو اپنی جھلک دکھلا گیا
 میرا دل خوشی سے دھڑک رہا ہے،
 اسے ناز برداری کا شرف حاصل ہوا ہے۔

اسے ایک ہستی ملی ہے جو اس میں دوبارہ جان پھونک سکتی ہے،
 اور اب اسے پھر جنینا نصیب ہوا ہے اور آنسو بہانا اور محبت کرنا۔
 روسیوں کی طبیعت عام طور سے حقیقت بینی اور حقیقت نگاری کی طرف

اس قدر مائل ہوتی ہے کہ فلسفیانہ تصورات اس کے لیے کوئی کشش نہیں رکھتے
 اسی وجہ سے روسی شاعری میں فلسفیانہ رنگ کی نظمیں شاذ و نادر ملتی ہیں۔ لیکن
 کی نظم "زندگی کی رتھ" تخیل، استعارے اور حقیقت نگاری کی اس خاص آئینہ
 کی بہت اچھی مثال ہے جو روس میں فلسفے کا کام دیتی ہے۔

رتھ پر اگرچہ بوجھ بہت ہے

مگر وہ آسانی سے چل رہی ہے۔

زمانہ، ایک سن رسیدہ مشاق رتھ بان کی طرح

بغیر ستائے ہم کو بھگانے لیے چلا جاتا ہے۔

ہم سویرے سے رتھ میں بیٹھتے ہیں،

جب ہمیں ہڈی لپلی ٹوٹنے کا اندیشہ نہیں ہوتا،

آرام اور آسودگی کی فکر نہیں ہوتی،

اور تب ہم چلاتے ہیں: چل، جلدی چل!

لیکن آدھا دن گزرنے تک یہ جولانی نہیں رہتی،

ہم بہت ہچکولے کھا چکے ہوتے ہیں،

ڈھلواں زمین اور خندقوں کا ہمیں خوف ہوتا ہے،

اور تب ہم چلاتے ہیں: سنبھل کر چل، بیوقوف!

رتھ پہلے کی طرح چلتا رہتا ہے،

شام تک ہم اس میں بیٹھنے کے عادی ہو جاتے ہیں۔

زمانہ رتھ کو تیزی سے چلاتا رہتا ہے۔

اور ہم اونگھتے ہوئے خواب گاہ تک پہنچ جاتے ہیں۔
 ”بھوت“ میں شاعر برف کے طوفان کو وہی دیہاتیوں کی نگاہوں سے دیکھتا
 ہے۔ ترجمے میں الفاظ کی تاثیر جاتی رہتی ہے، اور اس قسم کی نظموں میں اثر زیادہ تر
 الفاظ کے وزن اور تال کا ہوتا ہے۔ یہ نظم اپنی اصل صورت میں پڑھی جائے تو طوفان
 اور برف باری کی فضا اور وہ مہیب شکلیں جو خوف زدہ تصور ایسے موقعوں پر گویا
 اپنے آپ کو ڈرانے کے لیے بنایا کرتا ہے سب نظر کے سامنے آ جاتی ہیں اور شاعر کی
 طرح پڑھنے والے کا دل بھی دہل جاتا ہے۔

بادلوں کے بھونچال ہیں، بادلوں کا طوفان ہے،

کہیں سے چھپ کر چاند

اڑتی ہوئی برف کو چمکا رہا ہے؛

آسمان مٹیالا ہو، رات مٹیالی۔

میں سپاٹ میدان میں گاڑی پر چلا جا رہا ہوں، چلا جا رہا ہوں۔

گھوڑوں کی گھنٹی ٹن ٹن بول رہی ہے۔

انجان مقاموں سے گزرتے ہوئے۔

دل بے اختیار کانپ اٹھتا ہے۔

”ارے کوچوان، جلدی کر!“ ”حضور! مجھ میں سکت نہیں،

اور گھوڑوں کے پیر شکل سے اٹھتے ہیں۔

برف کا طوفان میری آنکھیں اندھی کیے دیتا ہے،

تمام رستے نظر سے چھپا دیے ہیں،

میں تو اب مارے بھی رستہ نہیں بتا سکتا۔
ہم بھٹک گئے ہیں، کریں تو کیا کریں؟
ہم کو بھوت میدان میں گھسیٹے لیے جاتا ہے،
اور ادھر ادھر چکر دے رہا ہے۔

دیکھیے وہاں کھیل رہا ہے، وہاں،
میرے منہ پر کچھ پھونکتا ہے اور تھوکتا ہے۔
وہ دیکھیے اب چمکنے والے گھوڑے کو
گڑھے میں ڈھکیل رہا ہے،

وہ لیجیے اب بھوٹ موٹ میل کا پتھر بن کر
میرے سامنے زمین میں گر گیا۔

اب دیکھیے وہ چنگاری کی طرح چمکا
اور اندھیرے میں غائب ہو گیا۔

بادلوں کے بھونچال ہیں، بادلوں کا طوفان ہے،
کہیں سے چھپ کر چاند

اڑتی ہوئی برف کو چمکا رہا ہے

آسمان مٹیالا ہے، رات مٹیالی۔

ہم میں اب چکر لگانے کی طاقت نہیں،

گھوڑوں کی گھسیٹ خاموش ہے

گھوڑے کھڑے ہو گئے ہیں... ”ارے وہ سامنے کیا ہے؟“

”میں کیا بتاؤں؟ کسی درخت کی جڑ ہوگی، یا بھیڑیا“

طوفان جھلاتا ہی، طوفان روتا ہی؛

بھڑکنے والے گھوڑے پھنکارتے ہیں؛

لو اب بھوت دور بھاگا جاتا ہی،

بس دونو آنکھیں اندھیرے میں انگاروں کی طرح دھک رہی ہیں۔

گھوڑے پھر چلنے لگتے ہیں،

گھنٹی ٹن ٹن بولتی ہی۔

یروں سے سفید میداؤں پر

مجھے بھوت جمع ہوتے دکھائی دیتے ہیں،

بے شمار، بد صورت اور ڈراؤنے،

چاند کی مٹیالی روشنی میں،

ہر طرح کے بھوت چکر لگا رہے ہیں،

جیسے پت جھڑ میں پتیاں۔

کتنے ہیں، کدھر بھاگے ہوئے جا رہے ہیں،

کیوں سب ایسی دردناک آواز میں گارہے ہیں؟

کیا کوئی بھوت دفن کیا جا رہا ہی،

یا کسی چڑیل کی شادی ہی؟

بادلوں کے بھونچال ہیں، بادلوں کا طوفان ہی،

کہیں سے چھپ کر چاند

اڑتی ہوئی برف کو چپکا رہا ہے؛
 آسمان مٹیالا ہے، رات مٹیالی۔
 گروہ درگروہ، بھوتوں کا بھونچال
 آسمان کی بلندی میں غائب ہو رہا ہے۔
 ان کی دردناک چہنیں اور آپس
 میرے دل کو زخمی کر رہی ہیں۔

”بھوت“ کے مقابلے میں دیہاتی روس کا ایک اور منظر ملاحظہ ہو جو صرف
 شاعرانہ کیفیت سے خالی ہی نہیں بلکہ ایسا دیرانہ ہے جس میں زندہ دلی کا چہنہ
 ہی سوکھ جاتے۔

میرے سرخ و سپید نقاد، میرے موٹے تازے ہنسی اڑانے والے،
 تو ہمیشہ میرے افسردہ افکار کو اپنے مضحکے کا تختہ مشق بناتا ہے؛
 ذرا ادھر آ، میرے پاس بیٹھ اور پھر ہم دونوں دیکھیں گے
 کہ میری بد بخت افسردگی کا کوئی علاج ہی یا نہیں۔
 دیکھ یہاں کا منظر کیسا نفیس ہے؛ ٹوٹے پھوٹے جھوپڑوں کی
 ایک قطار

اور اس کے پیچھے سیاہ زمین؛ میدان کی ہلکی ہلکی ڈھال
 اور سب کے اوپر دھلے ہوئے گنجان بادلوں کی پٹی۔
 لہلہاتے کھیت کہاں ہیں، گئے جنگل کہاں،
 اور دریا کدھر؟ صحن میں جنگلے کے پاس

آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچانے کو دو بیچارے درخت کھڑے ہیں :
 صرف دو درخت اور ان میں سے بھی ایک کو
 خزاں کی بارش نے بالکل ننگا کر دیا ہے ؛
 دوسرے کی پتیاں زرد ہیں، بھیکے بھیکے گل گئی ہیں
 اور اب ہوا کے کچھ تیز جھونکوں کی منتظر ہیں، کہ تالاب میں
 گر کر اسے پاٹ دیں ۔

بس اور کچھ نہیں۔ آس پاس کسی کتے کی آواز تک نہیں۔
 ہاں، وہ دیکھ ایک کسان ہے اور اس کے پیچھے دو عورتیں ؛
 کسان ننگے سر ہے، بغل میں بچے کا تابوت دبائے ہے،
 اور دور سے کاہل چھوٹے پادری کو پکار رہا ہے
 کہ وہ بڑے پادری کو بلا لے اور گر جاگھر کھول دے ؛
 بہت جلد، اب انتظار کی گنجائش نہیں،
 بچے کو بہت پہلے ہی دفن کر دینا چاہیے تھا۔

ایسے مناظر سے بہت زیادہ ہمت شکن دار السلطنت کی وہ رنگیلی زندگی
 تھی جس میں لشکن نظر بندی کے بعد مبتلا ہو گیا۔ زار کا احتساب ایک طرف اور
 دوسری جانب خود لشکن کی طبیعت کی کمزوریاں دونوں نے مل کر اس کی شامی
 کا کام تمام کر دیا۔ ایک نظم میں اس نے خد سے دعا مانگی ہے کہ اسے دیوانگی سے
 بچائے رکھے : یہ مدوحہ "بھی اسی رنگ میں ہے۔
 دیوانگی کے زمانے کا بھتا ہوا سرور

میرے دل پر گراں ہے جیسے شراب کا خمار،
 اور شراب ہی کی طرح گزرے ہوئے دنوں کا غم
 میرے دل میں جتنا پڑانا ہوتا جاتا ہے اتنا ہی تیز بھی۔
 میرا راستہ سنان ہے، میرے مستقبل کا موج زن سمندر
 مجھے رنج اور کلفت کے طوفانوں کا پیغام دے رہا ہے۔
 لیکن دوستو، مجھے ابھی مرنا منظور نہیں
 مجھے جینا ہے، کہ آرزوں کا بیج یوؤں اور مصیبت کا پھل چکھوں!
 اور مجھے معلوم ہے کہ رنج اور فکر اور پریشانیوں میں بھی
 میرے عیش و عشرت کا سامان ہوگا۔
 کبھی کبھی نفس اور روح کی ہم آہنگی میرے گیت کا موضوع ہوگی،
 میں بھراپنے خیال کی شوخی پر خوشی کے آنسو بہاؤں گا۔
 اور ممکن ہے کہ میری شام حرام
 عشق کے الوداعی تبسم سے روشن ہو جائے۔
 آخر میں ایک نظم درج کی جاتی ہے جس میں لپکن اپنے ہم مشربوں
 کو خطاب کرتا ہے۔

شاعر، تو عوام کی محبت پر اعتبار نہ کر!
 تعریف کے نعروں کا شور دم بھر میں مٹ جائے گا۔
 تجھے بیوقوف کی رائے سننی ہوگی اور سنگ دلوں کی ہنسی،
 مگر تو اپنا وقار اور سکون قائم رکھ اور غم سے ہم کنار رہ۔

تو بادشاہ ہی، تنہا رہ، اپنے سیدھے رستے پر چل،
 جہاں تجھے تیرا آزاد ذہن لے جائے وہاں جا،
 اپنے محبوب خیالات سے اپنی دنیا تعمیر کر
 اور اپنی بلند آسنگوں کا صلہ کسی سے نہ مانگ...

شاعر کے رتبے کی نسبت ایسے بلند خیالات رکھتے ہوئے یہ ناممکن تھا کہ
 لشکن زیادہ دن تک ان پابندیوں کو برداشت کرے جن سے وہ پتیر برگ
 میں جکڑ دیا گیا تھا اور عمر کے آخری چار پانچ سالوں میں اس نے اتنی کم نظمیں
 لکھیں کہ یہ سمجھ لینا چاہیے اس نے شعر کہنا بالکل ہی ترک کر دیا تھا۔ اس کی بجائے
 اس نے اخبار نویسی، ادبی تنقید اور افسانہ نویسی کا شغل اختیار کیا۔ اس کے
 سیاسی مضامین اس زمانے کے عام معیار سے بہتر نہیں، لیکن ادبی تنقید کے
 مسائل میں اس کی رائے مستند مانی جاتی ہے۔ اس کے رسالے کے ذریعہ سے
 کئی انشا پردازوں اور شاعروں کا جو کہ بعد کو بہت مشہور ہوئے ادب کے
 سرپرستوں سے پہلے پہل تعارف ہوا، اور معاصر مصنفوں میں سے لشکن نے
 جس کسی کی نسبت جو رائے قائم کی اس کی بعد کو عام رائے نے عموماً تصدیق کی۔
 ناول نویس گوگول کی عظمت کا لشکن نے سب سے پہلے اعتراف کیا اور ناظرین
 سے اس کا حق دلوانے میں لشکن ہی کی کوشش زیادہ کامیاب ہوئی۔ شاعر
 چیوچف کے کلام کو بھی لشکن نے گنہامی سے بچایا، اس کی پہلی نظمیں لشکن نے
 لہ گوگول کا ذکر روسی ناول نویسوں کے سلسلے میں آگے آئے گا۔

یہ چیوچف کا ذکر اسی سلسلے میں ہوگا۔

اپنے رسالے میں شایع کیں اور وہ اصرار نہ کرتا تو ممکن ہی چوچھن کی نظمیں اشاعت سے بالکل محروم رہتیں۔ ان ادبی خدمات سے بہت زیادہ قابل قدر لشکن کی اپنی نثر کی تصانیف ہیں۔ اس کا تاریخی مضمون ”پوگاچوف کی بغاوت“ تاریخ اور ادب دونوں میں خاص اہمیت رکھتا ہے، اس کا ناول ”کپتان کی بیٹی“ جس کا قصہ پوگاچوف کی بغاوت پر مبنی ہے اب تک شوق اور دلچسپی سے پڑھا جاتا ہے اور روسی تاریخی ناولوں میں اس کا درجہ بہت بلند ہے۔ لشکن کے افسانے موضوع کے اعتبار سے خاص طور پر قابل ذکر نہیں، اگرچہ ان میں سے ایک ”حکم کی بیگم“ کا ایک روسی ماہر موسیقی نے ”اوپے را“ بنا کر بہت چرچا کر دیا۔ لشکن کی نثر کی تصانیف کا جوہران کی زبان کی فصاحت اور لطافت ہے اور کارامزن اور توگرین کے سواروسی نثاروں میں کوئی بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

لشکن کے مذاق کی ہمہ گیری اور اس کی نظر کی وسعت کا ذکر آچکا ہے۔ یہ خصوصیت دستہ نعت سکی کی رائے میں ذاتی نہیں بلکہ قومی ہے۔ یورپ پرستوں کی تعلیم اور سیاسی مصلحتوں کے باوجود دستہ نعت سکی کے نزدیک روسی قوم میں انسانی ہمدردی کا وہ خاص جذبہ جو دوسری قوموں کی تہذیب اور تمدن سے دلچسپی، ان کی اعلیٰ اسنگوں اور آرزوؤں سے گہرا روحانی تعلق پیدا کر دیتا ہے کمزور نہیں پڑا ہے اور ابھی تک روسی قوم کی سب سے نمایاں اور سبق آموز صفت ہے۔ روسی قوم تہنا اور سرد مہر نہیں رہ سکتی اور ہر بچے روسی کے دل میں یہ حوصلہ ہوتا ہے کہ وہ دوسری قوموں کے طرز معاشرت اور فلسفہ حیات سے واقفیت حاصل لے ناگ اور گانے کے فنون کی آئینہ نش، جس میں ایک ٹیڑھ بونے کے بجائے ساز کے ساتھ گاتے ہیں

کرے اور اس کی حقیقت سمجھ لے، اپنے اور پرانے کے دکھ سکھ میں شریک ہو اور اس فساد کو جو جہالت، خود غرضی اور تنگ نظری کی وجہ سے قوموں کے درمیان قائم ہو اور انھیں ایک دوسرے سے جدا رکھتا ہے اسے اپنی ہمہ گیر محبت، رواداری، حقیقت بینی اور حق پرستی سے رفع کر دے۔ یہ قومی وصف دستہ لف سکی کے خیال میں لشکن کی شخصیت اور اس کے کلام کا خاص جوہر ہے اور اسی کی بنا پر لشکن کو صحیح معنوں میں قومی شاعر کہا جاسکتا ہے۔ لیکن لشکن میں صرف دوسروں کا مذاق اور خیالات سمجھنے کی صلاحیت نہیں تھی۔ اے کو، ادن لے گن اور تبتیان کی سیرتین، روس کے دیہاتی مناظر اور گاؤں کی بود و باش کی دلکش تصویریں، اس کے ساتھ ہی عوام کے خیالات اور ان کی تہذیب سے گہرا لگاؤ اور وطن کی سچی محبت، یہ سب دلیلیں ہیں اس بیدار دلی اور مخلصانہ قوم پرستی کی جو لشکن کو روسی شاعروں اور انشا پردازوں کا سر تاج بنا دیتی ہے۔ دستہ لف سکی کا خیال صحیح ہو یا غلط، لشکن کی روس میں جو عظمت ہے اور اس کی ذات کا جو احترام کیا جاتا ہے اسے سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس قسم کے دعوے جیسے کہ دستہ لف سکی نے لشکن کے حق میں کیے ہیں نظر انداز نہ کیے جائیں۔ لشکن فلسفی یا کسی بصیرت افروز فلسفے کے مبلغ کی حیثیت سے بہت زیادہ ممتاز نہیں، نظم کی خوبیاں بھی اس سے زیادہ اور بہت سے شاعروں کے کلام میں مل جائیں گی، مگر قومی ذہنیت پر جو اثر لشکن کا ہوا، قومی سیرت کا عکس جیسا اس کی نظموں میں ملتا ہے اور قوم کے عام مذاق سے جو مناسبت اس کے کلام کو ہے، اس کی مثال جرمن شاعر گوٹے کی شخصیت اور کلام کے سوا اور کہیں نہیں ملتی۔

یہی وجہ ہے کہ گولشکن بہت اور جوشِ ایثار سے محروم اور اخلاقی رہبری کے
 لیے ناموزوں تھا، اس کی نظموں نے قوم کو بیدار اور اپنی اصلیت سے آگاہ
 کرنے میں بہت مدد دی اور آئندہ نسلوں کی نگاہوں میں اسے روسِ کامر
 پہلا نہیں بلکہ سب سے بڑا شاعر اور مدبر بنا دیا۔

دوسرا باب

لیرنٹوٹ (۱۸۱۱-۱۸۴۱)

جب پتربرگ میں یہ خبر مشہور ہوئی کہ پشکن کے ایک ڈیوٹل میں کاری زخم لگا ہے اور اس کے بچنے کی کوئی امید نہیں تو ایک ماتمی نظم بھی شہر کے گلی کوچے میں سنائی جانے لگی جو ایک نوجوان شاعر لیرنٹوٹ نے اس موقع پر لکھی تھی۔ نوجوان شاعر اس واقع سے بہت پہلے سے طبع آزمائی کر رہا تھا، مگر اس نظم کی بدولت ایک بارگی شخص کی نظر اس پر پڑنے لگی اور عام رائے نے اسے فوراً پشکن کا جانشین تسلیم کر لیا۔

میخائل یرے وچ لیرنٹوٹ ۱۸۱۱ء میں صوبہ قولامین پیدا ہوا۔ مورخوں کا بیان ہے کہ اس کا جدِ امجد سترھویں صدی میں اسکاستان سے ہجرت کر کے روس میں آسا تھا۔ یہ واقعہ صحیح ہو یا نہ ہو، لیرنٹوٹ مزاج، طبیعت اور خیالات کے لحاظ سے سچا روسی تھا، گو اس کی تعلیم اور تربیت میں کوئی ایسی خصوصیت نہیں تھی جو خود شناسی یا قومیت کے احساس کو بیدار کرتی۔ اس کے بے پہلے ایک جرمن کھلائی رکھی گئی اور پھر ایک فرانسیسی استاد، جس نے اسے نپولین اور

فرانسیسی ادب کی پرستش کرنا سکھایا۔ بعد کو لیر منتوف ہمیشہ افسوس کرتا رہا کہ اسے
 بشکن کی طرح ایسی کھلائی نہیں ملی جو اسے روسی عوام کے قصے کہانیاں سناتی
 ”جن میں تمام فرانسیسی ادب سے زیادہ شاعرانہ خوبیاں ہیں“ گھر پر تعلیم ختم
 کر کے لیر منتوف ماسکو یونیورسٹی میں داخل ہوا، مگر سند لینے سے پہلے ہی یونیورسٹی
 چھوڑ کر پتیر برگ کے فوجی اسکول میں چلا گیا۔ اسکول میں اس کی زندگی معمولی
 کیڈٹوں کی سی تھی، سوا اس کے کہ وہ ”شراب میں شاعری بھی ملا کر پیتا تھا۔“
 یہاں اس کی تعلیم مکمل ہوئی تھی کہ بشکن کے قتل کی خبر مشہور ہوئی اور لیر منتوف
 نے وہ ماتمی نظم لکھی جس کا اوپر ذکر آچکا ہے۔ نظم نے پتیر برگ میں ہتھکے مچا دیا۔ زار
 نکولائی اول نے اسے پڑھا اور بہت پسند کیا، مگر ساتھ ہی شاعر کو شورش انگیزی
 کی قانونی سزا دینے کا حکم بھی جاری کر دیا۔ دوستوں اور سرپرستوں کی کوششوں نے
 لیر منتوف کو بچا لیا اور اسے صرف پتیر برگ چھوڑ کر قفقاز کی فوج میں ملازمت
 اختیار کرنا پڑی۔ قفقاز میں وہ ایک سال بھی نہیں رہا تھا کہ اس کی خطا معاف
 ہو گئی اور پتیر برگ واپس آنے کی اجازت مل گئی۔ لیر منتوف واپس آیا اور ایک
 اعلیٰ درجے کے ادیب کی شان سے آیا۔ شہر کی تمام محفلوں اور معزز خاندانوں
 میں اس کی بہت آؤ بھگت اور عزت کی گئی، لیکن تھوڑے ہی دنوں میں اس
 کی طبیعت شہری زندگی سے اکتا گئی۔ وہ قفقاز کی فوج میں منتقل کیے جانے
 کی درخواست دینے والا تھا کہ فرانسیسی سفیر کے لڑکے سے ڈیوئل لڑنے کی بنا پر
 حکومت نے خود ہی اسے دوبارہ قفقاز روانہ کر دیا۔ اس مرتبہ وہ کئی لڑائیوں میں
 لے فوجی اسکولوں کے طالب علم جنھیں تنخواہیں دی جاتی ہیں۔

شریک ہوا اور ایسی بے باکی اور جواں مردی دکھائی کہ فوج میں بھی اس کا سکھ بیٹھ گیا۔ لیکن وہ دنیا میں اب صرف چند روز کا مہمان تھا۔ پیتربرگ سے رخصت ہوتے وقت اس نے اپنے تمام دوستوں سے کہہ دیا تھا کہ وہ زندہ واپس آنے والا نہیں اور یہی وہ قفقاز کے رستے میں سب جان پہچان والوں سے کہتا ہوا گیا۔ قفقاز میں اسے تین سال نہیں گزرے تھے کہ ایک ڈیوئل میں مارا گیا (۱۸۴۱ جولائی ۱۸۴۱) لیرمنتوف نے عجیب و غریب طبیعت پائی تھی۔ اس کی ماں ایک شاعرہ مزاج کی عورت تھی جس نے بد قسمتی سے ایسا شوہر منتخب کیا اور ایسی زندگی بسر کی جس سے اس کی ساری امیدیں اور جوصلے خاک میں مل گئے اور وہ بچاری مایوسی اور حزن میں ایسی مبتلا ہوئی کہ آخر کار تپ دق کا شکار ہو گئی۔ لیرمنتوف کی ماں کے بعد خاندان میں غم اور افسردگی کی فضا اس کی نانی کی ذات سے قائم رہی اور لیرمنتوف، جس کے دل پر ماں کے حزن کا گہرا نقش موجود تھا، نگین جذبات میں اور زیادہ ڈوب گیا۔ پیتربرگ کے فوجی اسکول میں داخل ہونے پر اسے ان جذبات کی قید سے رہائی ملی، لیکن یہ دو امراض سے بھی بدتر ثابت ہوئی۔ لیرمنتوف نہ صرف ”شراب کے ساتھ شاعری ملا کر پیتا تھا“ بلکہ عیاشی اور اوباشی بھی۔ یہ علاج نہیں تھا، صرف ایک قسم کی مدہوشی تھی جس نے اسے اپنے جوہر سے بے خبر کر دیا، ایک نشہ جس سے نجات پانے کی وہ خود دعائیں مانگا کرتا تھا۔ یہ عرصہ جو اس نے فوجی اسکول میں گزارا ہر لحاظ سے اس کی عمر کا بدترین حصہ تھا۔ انھیں عادتوں کی وجہ سے جو اس نے یہاں سیکھیں اسے بعد کو ”زہریلے کیرٹے“ کا ناقابل رشک خطاب ملا اور بہت سے شریف آدمیوں کو یقین ہو گیا کہ گو

اس کا کلام دوسروں کے لیے تریاق کا اثر ضرور رکھتا ہے، لیکن اس کی شخصیت
ہنایت زہریلی ہے۔

بچپن کا ماحول اور فوجی اسکول کی زندگی کا طریقہ بیان کر دینے سے وصل
لیر منتوف کی سیرت کا معرہ حل نہیں ہوتا۔ اس کی شخصیت ایک منظر تھی جسے نفیاً
میں "دہری شخصیت" کہتے ہیں۔ اس منظر کی خاص پہچان یہ ہے کہ ایک ہی شخصی کی
سیرت کے دو متضاد پہلو ہوتے ہیں جن کے متضاد ہونے کا اسے مطلق احساس
نہیں ہوتا، اس کی دونوں "شخصیتوں" میں سے ہر ایک کی الگ اور مخصوص
طبیعت، مزاج، عادتیں اور رجحانات ہوتے ہیں اور جب وہ ایک "شخصیت"
سے دوسری میں منتقل ہوتا ہے تو پہلی کی ذہنی اور مزاجی خصوصیات صرف ترک
نہیں کر دیتا بلکہ ان سے بالکل بیگانہ ہو جاتا ہے اور انھیں اس طرح بھول جاتا
ہے گویا وہ اس کی طبیعت میں کبھی پائی ہی نہیں جاتی تھیں لیر منتوف کی ظاہری
زندگی پر نظر ڈالی جائے تو یقین نہیں آتا کہ اس کا کلام پاکیزہ ہو سکتا ہے اور اس
کا کلام بڑھ کر سخت حیرت ہوتی ہے کہ اس نے اپنی عمر کی قلیل مدت زیادہ تر
کینی اور ظالمانہ حرکتوں میں کیونکر ضایع کی۔ لیکن ہم نہ اس کے کلام کی پاکیزگی
سے انکار کر سکتے ہیں اور نہ اس کا دامن ان الزاموں سے پاک کر سکتے ہیں جو
معاصرین اس پر لگاتے تھے۔ لیر منتوف کچھ دنوں بد معاشوں کی زندگی بسر
کر کے دفعتاً ایک معصوم شاعر بن جاتا تھا اور پھر اسی طرح دفعتاً ایک پختہ کار
بد معاش: اسی سے خیال ہوتا ہے کہ اس کی شخصیت دہری تھی، ایک تو بد معاش
کی اور دوسری شاعر کی اور دونوں ایک دوسرے سے بالکل جدا اور بیگانہ تھیں

یہ منتوں نے اپنی ”بد معاش“ شخصیت کا خاکہ ایک ناول میں کھینچا ہے، جس کا عنوان ”ہمارے زمانے کا ایک جواں مرد“ ہے۔ ناول کا ہیرو پچورن سیرٹ کے لحاظ سے لشکن کے اون یے گن سے بہت ملتا جلتا ہے۔ اس کا دل بھی محبت اور وفاداری کی لذتوں سے نا آشنا ہے اور اس کی سرگزشت کا جو حصہ ہمارے سامنے پیش کیا جاتا ہے اس میں اول سے آخر تک عورتوں کے دل بھانے اور دکھانے کے قصے ہیں، گویا پچورن کو عورتوں سے کوئی عداوت ہے اور انھیں ستانے کا خاص شوق۔ ایک مرتبہ اسے ایک نواب کی لڑکی سے اسی قسم کی عداوت ہو جاتی ہے۔ ہر جگہ، خواہ محفل ہو یا شہر کا باغ، پچورن جہاں اس لڑکی کو دیکھ لیتا ہے اسے طرح طرح سے گردیدہ کرنے کی کوشش کرتا ہے اور جب اس بیچاری کے دل میں محبت کی آگ بھڑک اٹھتی ہے تو پچورن اُسے ایک لمبی چوڑی تقریر میں سمجھاتا ہے کہ وہ عورتوں کو اپنا گردیدہ کرنے پر فطرتاً مجبور ہے، مگر محبت کی راہ و رسم بہتے کا حوصلہ نہیں کر سکتا، کیونکہ اسے آزادی ہر نعمت سے زیادہ عزیز ہے اور اسے وہ محبت کے مول بھی دینے پر کبھی راضی نہیں ہو سکتا۔ اس کے دل میں وفاداری اور ایثار کا مادہ نہیں، لیکن اس کی فطرت کا تقاضا ہے کہ سب مرد اس سے مرعوب رہیں اور سب عورتیں اس پر فدا ہوں۔

یہ منتوں نے خود بھی کئی شریف عورتوں کے ساتھ پچورن کا سا سلوک کیا اور مردوں عورتوں کے تعلقات اس کے نزدیک اور کچھ ہو بھی نہیں سکتے تھے۔ مگر پچورن اور یہ منتوں کی مشابہت بس یہیں پر ختم ہو جاتی ہے، یہ منتوں کی طبیعت میں بہت سے جوہر تھے جن کا اسے اُس وقت مطلق احساس نہیں

ہوتا تھا جب اس کی عیاش اور بد معاش شخصیت حاوی ہوتی اور پچورن
 کی صورت میں اپنا عکس اتارتے ہوئے اس نے انہیں کا خیال نہیں رکھا۔
 اس کے اخلاق تو آخر عمر تک ایک تیرہ دل عیاش کے سے رہے، لیکن اس
 میں بھی کوئی شک نہیں کہ اگر لیر منتوف کو موت نے نہ آگھیرا ہوتا تو اس کی
 شاعر شخصیت اپنے حریف پر رفتہ رفتہ غالب آجاتی۔ اب صرف چند بلند پایہ
 نظمیں ہیں جن سے ہم اس روحانی عظمت کا اندازہ لگا سکتے ہیں جو لیر منتوف کو
 حاصل ہوتی اگر اسے کچھ دن اور جینا نصیب ہوتا۔ قبل از وقت موت نے
 صرف اسے اس عظمت سے محروم نہیں رکھا بلکہ ان گناہوں کی تلافی کا بھی
 موقع نہیں دیا جو اس کی عیاش اور بد معاش "شخصیت" سے سرزد ہوئے
 اور جنہیں بہت سے قوم پرست روسی اس کا کلام پڑھ کر بھی معاف نہ کر سکے۔
 لیر منتوف نے جب لکھنے کو قلم اٹھایا تو وہ اپنی خاندانی زندگی کی مایوسی
 بھری فضا سے گھرا ہوا تھا اور اس کی شروع جوانی کی نظمیں اسی رنگ میں ڈلی
 ہیں۔ مایوسی نے تو آخر عمر تک اس کا دامن نہیں چھوڑا، مگر اس میں نئے جذبات
 کی آمیزش ہوتی رہی۔ سب سے پہلے لیر منتوف پر اس وحشت اور طوفانوں
 کی آرزو کا غلبہ ہوا جو بائرن کے کلام نے یورپ میں ایک وبا کی طرح پھیلائی
 تھی۔ لیر منتوف کی ابتدائی نظموں میں اس کا اثر بہت نمایاں ہے اور اس میں
 شک نہیں کہ وہ زیادہ تر بائرن کی نقل میں لکھی گئی تھیں۔ لیکن رفتہ رفتہ
 لیر منتوف کی طبیعت نے بائرن اور رومانی تحریک کے اثرات جذب کر کے
 اس طرح اپنا لیے کہ ان میں اُپرچ اور جدت کی نشان پیدا ہو گئی۔ وحشت اور

”طوفان کی آرزو“ جس انداز سے ”باد بانی کشتی“ میں دکھائی گئی ہے بائرن کی نقل نہیں، لیر منتوف کے اپنے دل کی کیفیت ہے:

ایک تنہا باد بانی کشتی، کھڑے میں لپٹی ہوئی
لاجوردی سمندر کی سطح پر چمک رہی ہے۔

وہ دور دراز ملکوں میں کیا تلاش کرنے نکلی ہے؟
اپنے وطن میں کیا چھوڑ چلی ہے؟

موجیں کھیلتی ہیں، ہوا کے جھونکے چل رہے ہیں،
مستول جھکتا ہے، چڑاتا ہے...

افسوس، اسے نہ خوشی کی تلاش ہے
اور نہ وہ خوشی سے بھاگتی ہے۔

نیچے موجیں بہ رہی ہیں۔

اوپر سنہری کرنیں بکھری ہیں

لیکن اس دیوانی کو آرزو ہے طوفانوں کی،

گویا سکون طوفانوں ہی میں ملتا ہے۔

لیر منتوف اور بائرن کی مشابہت دراصل محض سطحی ہے۔ وحشت، بے چینی

غور اور اہل دنیا سے بیزاری نے لیر منتوف کی روزمرہ زندگی میں چاہے جتنی

ناگوار شکل اختیار کی ہو، شعر بننے بنتے ان خصوصیتوں میں مایوسی، درد اور کبھی

کبھی ایک لطیف ندرہ بیت کی ایسی آمیزش ہو جاتی ہے جو ان کی تاثیر بالکل بدل

دیتی ہے۔ وہ زندگی سے بیزاری ظاہر کرتا ہے۔

طبیعت اکتا گئی، دل نکلین ہی اور ایسا کوئی بھی نہیں
 جس کا روحانی پریشانیوں میں سہارا ہوں...
 خواہشیں کروں؟... کیا فائدہ خواہشیں کرتے سے جب وہ کبھی پوری نہ ہوں،
 اور زمانہ گزرتا جائے، عمر کا بہترین زمانہ؟
 محبت کروں؟... مگر کس سے؟... چند روز کے لیے؟ بیکار کی درد سہی؟
 اور ہمیشہ کے لیے کسی سے محبت کرنا ممکن نہیں۔

اپنے دل پر نظر ڈالوں؟ وہاں گزشتہ زندگی کا نام و نشان بھی نہیں،
 گزری ہوئی خوشیاں اور رنج سبھی مٹ گئے ہیں۔
 جذبات کی ہستی کیا ہے؟ کبھی نہ کبھی عقل کے سمجھانے سے
 ان کا خوشگوار بخار جاتا رہتا ہے...

زندگی، اگر کوئی ٹھنڈے دل سے غور کرے
 محض ایک بے معنی اور سہوہ دل لگی ہے۔

خدا کا طنزاً شکر یہ ادا کرتا ہے:

میں ہر چیز، ہر نعمت کے لیے تیرا شکر یہ ادا کرتا ہوں،
 جذبات کی پہناں اذیتوں کا،

آنسوؤں کی سوزش، بوسے کے زہر کا،

دشمنوں کے کینے، دوستوں کی غیبت کا،

اپنی روح کی بے تابی کا، جو ایک دیرانے میں مُرجھا رہی ہے،

ان سب امیدوں کا جو مجھے دھوکا دے گئی ہیں۔

بس اب ایسا کر کہ مجھے تیرا شکر یہ
بہت دنوں تک نہ ادا کرنا ہو،

اور ان دونوں حالتوں میں اس کا خلوص ایسا نمایاں، اس کا جذبہ اتنا شدید
ہو کہ بائرن کا سارا جوش اس کے مقابلے میں سرد اور بناوٹی معلوم ہوتا ہے۔ لیکن
شکوہ سنجی، غرور، بنی نوع انسان کی تحقیر اور زندگی سے بیزاری کے موضوع پر
یہ منتوف نے جو نظمیں لکھیں وہ اسے اس کی اصلی صورت میں نہیں دکھاتی ہیں
ذیل کی نظم اس کی روحانی کیفیات کا اصل رنگ بہت بہتر ظاہر کرتی ہے اور اس
کی شخصیت کی گہرائیوں کا صحیح پتہ دیتی ہے:

آدھی رات کو آسمان پر ایک فرشتہ اڑتا ہوا
دھیمی اور مٹھی آواز سے ایک گیت گارہا تھا،

اور چاند اور بادلوں اور ستاروں کا ہجوم
اس کا پاک گیت سننے کو ہمہ تن گوش تھا۔

اس کا گیت معصوم روحوں کی شادمانی پر تھا

جب وہ جنت کے باغوں میں آرام کرتی ہوں گی،

اور خدا کی بزرگی پر اور اس کی حمد میں کوئی ریاکاری نہ تھی۔

فرشتہ ایک ننھی روح اپنی گود میں

دنیا کے غم اور آنسوؤں کے لیے لارہا تھا۔

ننھی روح میں اس کے گیت کی صدا

زندہ رہی، اگرچہ گیت اسے یاد نہ رہا۔

دنیا میں بہت دنوں تک وہ بے چین

اور ایک عجیب آرزو میں ڈوبی رہی،

کیونکہ دنیا کے میٹھے گیت اس کے دل میں

جنت کے نعموں کی کیفیت پیدا نہیں کر سکتے تھے۔

ایک روسی نقاد، مرثر کوفسکی، کا خیال ہے کہ لیرنٹوف خود بھی ایک

ایسی ہی ننھی روح تھا جسے دنیا کی تمام نعمتیں نہایت درجہ حقیر معلوم ہوتی تھیں،

اس لیے کہ پیدائش سے قبل کی ”جنتی“ زندگی کی یاد اس کے دل میں تازہ تھی،

اور دونوں زندگیوں کا فرق محسوس کرنے سے اس کی طبیعت میں وہ دل گداز

غم اور وحشت اور دیوانگی پیدا ہو گئی جو اس کے کلام میں اتنی نمایاں ہے۔ لیکن

”جنتی“ زندگی کا دروازہ پھر اس پر رفتہ رفتہ کھل رہا تھا۔ اپنی کیلنی حرکتوں

کے باوجود وہ ایسی نظم بھی لکھ سکتا تھا:

دل پر جب کوئی لمحہ گراں گزرتا ہے

اور غمگیں جذبات ہجوم کرتے ہیں،

تو میں ایک اعجاز نما دعا

دل ہی دل میں پڑھ لیتا ہوں۔

زندہ الفاظ کی ہم آہنگی میں

ایک جاں فرزا تاثیر ہوتی ہے،

اور ایک پاک قوت، جو فہم و ادراک سے بالاتر ہے،

اس میں مضمحل ہوتی ہے۔

دل پر سے ایک بوجھ سا اتر جاتا ہی،
 شک کا نام و نشان باقی نہیں رہتا،
 تب میں ایمان لاتا ہوں، روتا ہوں،
 اور پھر آہستہ، آہستہ

اس میں شک نہیں کہ یہ منتوت کا دل کبھی کبھی اس قدر پاک ہو جاتا تھا
 کہ لطیف ترین مذہبیت کے جذبے کی جولان گاہ بن سکے، لیکن وہ خوب جانتا
 تھا کہ اس جنس کے خریدار بہت کم ہوتے ہیں۔ اپنی نظم ”پنجمیر“ میں اس نے
 اہل دنیا کی اس بے حسی، خود پسندی، اور سنگ دلی کی شکایت کی ہے جو انہیں
 حقیقت سے بے خبر رکھتی ہے:

جس وقت سے کہ منصف ازلی نے

مجھے پیمبری کا علم غیب عطا فرمایا،

میں لوگوں کی پیشانیوں پر بدی اور گناہوں کی

لمبی داستانیں پڑھنے لگا ہوں۔

میں محبت اور راست بازی کے پاک اصول

بے خطر بیان کرنے لگا،

مگر وہی جو عزیز اور قریب تھے

مجھ پر دیوانوں کی طرح پتھر پھینکنے لگے۔

میں نے سر پر راکھ ملی

اور آبادیوں کو چھوڑ کر خالی ہاتھ چل بسا،

اب ویرانوں میں رہتا ہوں اور خدا مجھے بھی
 رزق پہنچاتا ہے، جیسے چرند و پرند کو۔

میرے دل میں خدا کی دی ہوئی امانت ہے،
 ساری مخلوق میری تابعدار ہے،

ستارے اپنی شعاعوں سے کھلتے ہوئے
 مجھ سے ہم کلام ہوتے ہیں۔

لیکن جب کبھی میں پر شور شہر سے
 قدم بڑھاتا گزرتا ہوں

تو بوڑھے خود پسندی سے مسکرا کر
 بچوں سے کہتے ہیں :

”دیکھو“ یہ تمہارے لیے ایک مثال ہے۔

یہ مغرور تھا، اسے ہمارے ساتھ بسر کرنا گوارا نہ ہوا۔

بے وقوف، ہمیں یقین دلانا چاہتا تھا

کہ اس کی زبان سے حق کے پیغام نازل ہوتے ہیں۔

”بچو اسے غور سے دیکھو!“

یہ کیسا اُداس ہے، ڈبلا اور پیلا،

دیکھو یہ کیسا محتاج ہے اور تنگ،

دیکھو سب اس کی کیسی تحقیر کرتے ہیں!“

لیر منتوت کے دل میں نہرہسیت کا جذبہ کبھی کبھی شدید ضرور ہو جاتا تھا اور اس کی تیز آگ ماسوا کے خس و خاشاک کو جلا کر خاک کر دیتی تھی، مگر شاعر کا ذہن عقیدے کی پابندیوں سے بہت گھبراتا تھا، اس لیے وہ نہ دنیا کو سدھار سکا اور نہ اس نے اپنی نجات کی کوئی صورت نکالی۔ ایک نظم میں اس نے خدا سے التجا کی ہے کہ اگر اسے گناہوں سے بچانا مقصود ہے تو اس کی شاعرانہ طبیعت اور شعر کہنے کی استعداد اس سے واپس لے لی جائے، ورنہ اسے رند خراباقتی کی زندگی بسر کرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہ ہوگا۔ لیکن نہ خدا نے اپنی دین واپس لی، نہ لیر منتوت اپنی دامن کو دنیا کی آلائشوں سے پاک رکھ سکا۔ مایوسی نے آخر کار اسے دنیا اور ہستی سے ایسا بے تعلق کر دیا کہ اس کی صرف ایک تنہا رہ گئی اور وہ اس طرح سے فنا ہو جانا کہ ہستی کی مطلق خبر نہ رہے۔ اپنی ایک معشوقہ سے کہتا ہے:

تو دعا کی الفاظ دہراتی ہے

اور تیرا دل امیدوں سے لبریز ہے،

تو کہتی ہے اس کے بعد بھی ایک زندگی ہوگی

اور دلیرانہ اس پر ایمان لائی ہے..... مگر میں؟

جس شخص کے لیے اس عمر کی قلیل مدت ایک مصیبت ہے

وہ حیات جاوداں کی تنہا کیسے کرے؟

میں دائمی زندگی کا بار کیونکر سنبھال سکوں گا،

جب مجھے اس زندگی میں دم بھر فنا کا سکون نہ ملنے سے تکلیف ہوتی ہے،

فنا کی آرزو لیر منتوں کے دل میں اور بھی تیز اس وجہ سے ہو گئی کہ وہ اپنی ”شاعر“ شخصیت سے محبت کرنے لگا تھا، مگر اسے اپنی ”عیاش اور بد معاش“ شخصیت پر قابو پانے کی کوئی امید نہ تھی۔ اس احساس نے کہ وہ ان دونوں کی جنگ میں حصہ لینے سے محروم اور جنگ کا جو فیصلہ ہو اسے تسلیم کرنے پر مجبور ہی اس کے روحانی توازن کو قائم نہ رہنے دیا اور اس کے سکون کے لمحے بھی ”بد معاش“ شخصیت کی فتح کے خوف کے نذر ہونے لگے۔ جیسا کہ وہ اپنے ایک مرغوب استعارے میں کہتا ہے:

..... میرا یہ سکون

شیطانوں کے نندا سے گروہ کو خاموش رکھنے کے لیے

ایک اڑتے ہوئے فرشتے کی لوری ہے۔

فرشتہ اڑتا ہوا چلا جائے گا اور شیطان بیدار ہو کر پھر قیامت برپا کریں

گے۔ لیر منتوں کے دل میں یہ اندیشہ وحشت پیدا کرتا ہے، لیکن مایوسی اسے

یقین دلاتی ہے کہ اس آفت سے بچنے کو کوئی صورت نہیں۔ اسی کیفیت،

یعنی حق اور باطل کی اس جنگ کو جو اس کی روح پر قبضہ کرنے کے لیے ہو رہی

تھی لیر منتوں نے اپنی سب سے لمبی نظم ”شیطان“ میں بیان کیا ہے۔ یہ شیطان

ایک راندہ درگاہ فرشتہ ہی جو بہشت سے نکلنے کے بعد دنیا میں مارا مارا پھرتا رہا ہے

اس حقیر دنیا پر راج کرتے ہوئے

اس نے بغیر کسی خواہش یا خوشی کے برائی کے بیج بوئے۔

کہیں اسے اس فن کی مشق میں

کسی مخالفت سے سابقہ نہیں پڑا۔

اور بُرائی کرتے کرتے بھی اُس کی طبیعت اکتا گئی۔

یوں ہی آوارہ گردی میں وہ ایک بار قفقاز پہنچا اور گرجستان کی کسی وادی میں اسے ایک لڑکی جس کا نام تارا تھا، نظر آئی۔ شیطان کے افسردہ دل پر تارا کے حُسن نے بہت اثر کیا۔ وہ ایک رئیس کی بیٹی تھی، شیطان نے جب اسے دیکھا تو اس کی شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں اور شام ہی کو اس کا دولہا سے لینے کو آنے والا تھا۔ شیطان کی سازش سے کچھ ترک ڈاکوؤں نے اس قافلے پر جو دولہا اپنے ساتھ لا رہا تھا، حملہ کیا، قافلے والے سب بھاگ گئے اور ڈاکوؤں سے مقابلہ کرنے میں دولہا کے بہت کاری زخم لگے۔ اپنے وعدے کے مطابق وہ شام کو دلہن کے گھر تو پہنچ گیا، مگر پہنچنے سے پہلے اس کا دم نکل چکا تھا اور وہ اپنے گھوڑے کی ایال پکڑے لٹکا تھا۔ تارا کو جب اس کی خبر ہوئی تو وہ اپنی قسمت پر رونے لگی اور چاہتی تھی کہ روتے روتے اپنی جان دے دے کہ اس کے کان میں ایک سُریلی پُر در آواز آئی جس نے دم بھر میں اس کے دل سے سارا غم دور کر دیا۔ یہ آواز شیطان کی تھی، جو تارا کو تسلی دینے آیا تھا۔ تارا نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا، مگر اسے کوئی نظر نہ آیا۔ وہ اس کشمکش میں تھی کہ اس سُریلی آواز کو سنتی رہے جس نے اس پر جادو سا کر دیا تھا یا اپنے دولہا کا ماتم کرے کہ نیند نے اس کی آنکھیں بند کر دیں۔ اس کے بعد شیطان کی آواز، غمگین مگر تسلی بخش، اسے اکثر سنائی دیتی رہی اور اس اندیشے کے باوجود کہ وہ کسی باغی یا مجرم فرشتے کی آواز نہ ہو، تارا

اس پر ایسی فریفتہ ہو گئی کہ وہ باپ کے اصرار پر بھی شادی سے انکار کرتی رہی اور جب باپ کو بہت مصر پاپا تو عورتوں کی ایک خانقاہ میں چلی گئی۔ باپ کی خفگی سے بچنے کے علاوہ تمارا کی ایک غرض یہ بھی تھی کہ شیطان سے بچھا چھڑالے کیونکہ اسے یقین تھا کہ خانقاہ کے آس پاس بھی شیطان کا گزرنا ناممکن ہوگا۔ لیکن وہ یہ بھول گئی تھی کہ اس کے دل میں شیطان کی طرف جو رغبت پیدا ہو گئی تھی اس سے شیطان کو خانقاہ میں بھی داخل ہونے کا حق حاصل ہو گیا تھا اور وہاں پہنچتے ہی تمارا کو اس کی افسوں گر آواز پھر سنائی دی۔ شیطان اب زیادہ شوخ ہو گیا تھا۔ اس نے اپنا تعارف کرایا:

میں وہ ہوں جس کی صدا تو نے

رات کی خاموشی میں سنی تھی...

میں وہ ہوں جس سے کوئی محبت نہیں کرتا،

وہ جس کے سامنے ساری مخلوق سر جھکاتی ہے...

میں اہل دنیا کا دیوتا ہوں،

علم اور آزادی کا بادشاہ ہوں،

آسمان کا دشمن، فطرت کا باطل عنصر ہوں،

اور تو دکھتی ہے، میں تیرے قدموں پر ہوں...

تمارا کے سوال پر اس نے اپنا سارا ماجرا سنایا اور ایسے پرورد انداز

سے کہ بیچاری کا دل بھر آیا۔ اس نے شیطان سے محبت کرنے کا وعدہ کیا،

اس شرط پر کہ وہ توبہ کرے اور خدا کو سجدہ کرے۔ شیطان نے بہت سی قسمیں

کھائیں اور تمہارا کو یقین دلا یا کہ
 ”میں چاہتا ہوں آسمان والوں سے صلح کرنا،
 محبت کرنا، سرسجدہ ہونا،
 حق پر ایمان لانا،

اور اس بھروسے پر کہ شیطان راہ راست پر آجائے گا حسین تمہارا نے
 دل و جان سے اپنے آپ کو شیطان کے حوالے کر دیا۔ شیطان کے پیار کا قاتل
 نہ ہر بجلی کی طرح اس کے سینے میں سریت کر گیا، اس نے ایک چیخ ماری
 جس میں سب کچھ تھا: محبت، درد،
 مہمانہ شکایت اور التجا،
 جدائی کی جاں گداز مایوسی،
 بہار زندگی سے رخصت...

لیکن تمہارا کی جان لینے سے شیطان کی آرزو پوری نہ ہو سکی قبل اس
 کے کہ وہ تمہارا کی روح پر قبضہ کرے اس کا ایک اور دعوے دار پہنچ گیا، ایک
 فرشتہ جو بیچاری مگر ہمہ تن تمہارا کی روح کو نجات کی خوش خبری سنا کر اپنی گود میں
 جنت کی طرف لے چلا۔ شیطان نے رستہ روکنا چاہا، مگر فرشتے نے ایک تہر
 آلود نظر سے اسے سامنے سے ہٹا دیا اور تمہارا کی تعریف میں یہ کہتا ہوا چلا گیا:

صناع قدرت نے ایسی روحوں کو

لطیف ترین جوہر سے بنایا ہے۔

یہ دنیا کے بے نہیں پیدا کی گئی ہیں

نہ دنیا ان کے لیے۔

اس نے محبت کی ہی، مصیبتیں اٹھائی ہیں
اور محبت کرنے والوں پر حبت کا دروازہ کھلا ہے۔

شکوہ سنجی، اطاعت اور سرکشی، نجات اور عذاب کے مسائل نے
یہ منتوف کو بہت مصروف رکھا، پھر بھی اس کے کلام کا ایک خاص حصہ ایسا
ہی جس میں شاعری کے سوا اور کچھ مقصود نہیں۔ اس حصے میں رومانیت کا کچھ
ہلکا سا رنگ نظر آتا ہے، مگر یہ منتوف کی سادگی اور حقیقت نگاری نے اس میں
اور ہی کیفیت پیدا کر دی ہے، "وصیت" میں ایک سپاہی جو مرنے کے قریب
ہے اپنے ایک دوست سے کہتا ہے:

میرے دوست، میں تمہارے ساتھ

کچھ دیر تمہارا ہنا چاہتا ہوں:

کہتے ہیں اس دنیا میں

مجھے صرف چند دن رہنا نصیب ہوگا۔

تم وطن جانے والے ہو،

دیکھو... مگر اس سے فائدہ کیا،

سچ پوچھو تو وہاں کسی کو

میرے انجام کی فکر ہی نہیں۔

خیر، اگر کوئی پوچھے۔

یا جو کوئی بھی پوچھے۔

اس سے کہ دینا کہ ایک لڑائی میں

میرے سینے پر گولی لگی،

اور میں نے عزت سے اپنے بادشاہ کے لیے جان دی۔

کہ دینا کہ یہاں کے ڈاکٹر بالکل اناڑی ہیں،

اور میں نے اپنے وطن کو

سلام بھیجا ہے۔

میرے ماں باپ تمہیں

شاید ہی زندہ ملیں...

مجھے افسوس ہے تو اس بات کا

کہ ان کے دل پر چوٹ لگے گی۔

لیکن اگر دونوں میں سے کوئی زندہ ہو

تو کہ دینا میں خط لکھنے میں بہت سستی کرتا ہوں،

کہ دینا ہمارا دستہ لڑائی پر بھیجا گیا ہے

اور میری واپسی کا ابھی انتظار نہ کریں۔

انہیں کی ایک ہمسائی ہے...

تمہیں یاد ہوگا، ہم کو جدا ہونے

ایک مدت گزر گئی... وہ تم سے میری نسبت

کچھ نہ پوچھے گی... کوئی پروا نہیں،

تم سے سارا حال ٹھیک ٹھیک سنا دینا،
 اس کے درد سے نا آشنا دل پر رحم نہ کھانا۔
 اچھا ہی اگر وہ چند آنسو بہا ڈالے...
 اس کا کیا بگڑ جائے گا۔

اس قسم کی نظم میں یہ لکھنا کہ ”یہاں کے ڈاکٹر بالکل انٹری میں“ کہہ دینا
 کہ میں خط لکھنے میں بہت سستی کرتا ہوں“ اور ”وہ تم سے میری نسبت کچھ نہ پوچھے گی“
 رومانی اصولوں کے خلاف ہی، مگر غور کیا جائے تو یہی تین مصرعے اس نظم کی جان
 ہیں اور اسے واقعی ایک زندہ، درد بھرے دل کا آخری پیغام بنا دیتے ہیں جو اپنی
 عاجزی اور مسکینی سے اور بھی پُر تاثیر ہو جاتا ہے۔ یہی عجز، یہی تسلیم، یہی بیچارگی اور
 زندگی کے انجام سے واقف ہونے کا میٹھا میٹھا غم اُس کزاک ماں کے گریٹ
 میں بھی ہے جو اپنے ننھے بچے کو سلا رہی ہے:

بڑا ہو کر تو صورت سے سوراہا ہوگا،

اور دل میں سچا کزاک،

میں تجھے رخصت کرنے کو باہر نکلوں گی

اور تو دور سے ہاتھ ہٹائے گا۔

اس رات کو میں چھپ کر

کتے گرم آنسو بہاؤں گی۔

سو، میرے فرشتے، آرام سے نیند کا مزہ لے لے کر،

سو، میرے بچے، سو۔

جدائی میں میرا دل پریشان ہوگا،
تیرے انتظار میں تڑپتی رہوں گی،
سارے دن دعائیں مانگوں گی،
اور رات کو فال دیکھوں گی۔

میں سمجھنے لگوں گی کہ پردیس میں
تیرا دل گھبراتا ہے،
سو، جب تک تو ہر فکر سے آزاد ہے،
سو، میرے بچے، سو۔

میں تجھے سفر کے لیے
ایک مقدس شبیہ دوں گی،
تو اسے دعا مانگتے وقت

اپنے سامنے رکھنا،
خطرناک لڑائی کے لیے تیار ہوتے ہوئے
اپنی ماں کو یاد کرنا...

سو، میرے پیارے چاند کے ٹکڑے،
سو، میرے بچے سو۔

یاد وطن کے موضوع پر لیر منتون کی ایک نہایت عمدہ اور دل گزار

نظم ہے جس کا عنوان "مبتدی راہب" ہے۔ یہ راہب ایک نوجوان ہے،
جس کی بچپن سے ایک خانقاہ میں پرورش ہوئی ہے۔ اسے معلوم نہیں کہ اس کے

ماں باپ کون تھے اور کہاں ہیں۔ راہب اس پر بہت مہربان ہیں، لیکن
 یہ خیال کہ وہ اپنوں سے دور پرولیس میں پڑا ہے اور ممکن ہے اس کی ساری عمر
 غریب الوطنی ہی میں گزر جائے اسے ہر وقت ستا رہتا ہے۔ آخر میں اس کی
 بے چینی اس قدر شدید ہو جاتی ہے کہ وہ اسے برداشت نہیں کر سکتا اور ایک
 رات کو خانقاہ سے بھاگ نکلتا ہے۔ اسے رستے کی مطلق خبر نہیں، ساری رات
 وہ جنگل میں بھٹکتا ہے، اس کی ایک درندے سے لڑائی ہوتی ہے جس میں وہ بہت
 زخمی ہو جاتا ہے اور سویرے جب راہب بہت تلاش کرنے کے بعد اسے پاتے
 ہیں تو وہ قریب مرگ ہوتا ہے، مگر وطن کی یاد میں اسی طرح بے چین۔ اس نظم
 کا جوہر مناظرِ قدرت کی تصویریں ہیں جنہیں شاعر نے اس خوبی
 سے پس منظر کے طور پر استعمال کیا ہے کہ نوجوان راہب کی بے چینی اور تڑپ
 صرف بہت زیادہ شدید اور دل سوز ہی نہیں بلکہ پُر معنی بھی ہو جاتی ہے۔
 لیر منتون کا قلم فقط مناظرِ قدرت اور انسانی جذبات ہی کے بیان
 کرنے میں مشاق نہیں۔ اس نے جنگ بوردوی نو کی اسی عنوان کی ایک نظم
 میں تصویر کھینچی ہے اور لڑائی کی ساری کیفیت ایک سپاہی کی زبانی سنائی
 ہے جو اس میں شریک تھا۔ یہ نظم ثابت کر دیتی ہے کہ لیر منتون لڑائی کے کشت
 و خون اور لڑنے والوں کے دل کی حالت دکھانے میں تالٹائی سے کچھ کم نہ تھا
 اور تالٹائی اس فن میں استاد مانا گیا ہے۔ بوردوی نو سے زیادہ دلچسپ
 ایک اور جنگ کا بیان ہے جو اس کی نظم ”وائے ریکٹ“ میں ملتا ہے۔ لیر منتون

لے ایک دریا کا نام ہے۔

اپنی ذاتی زندگی میں من چلا، ظالم اور سنگ دل ہونے کے باوجود اس فلسفہ حیات کی طرف سے بے حس نہیں تھا جس کی تبلیغ نے تالستانی کو اتنا مشہور کر دیا۔ ”والے ریک“ کے آخر میں وہ کہتا ہے:

... حقیر انسان

آخر چاہتا کیا ہے؟ آسمان صاف ہے،

اور اس کے نیچے ہر ایک کے واسطے کافی زمین پڑی ہے،

مگر وہ لا حاصل جنگ و جدال سے ایک دم بھر باز نہیں رہ سکتا،

اور کیوں؟ ...

لیر منتوف اپنے سوال کا جواب نہیں دیتا اور اس سوال کا جواب کوئی دے بھی نہیں سکتا۔ لیکن جس انداز سے اور جس حالت اور فضا میں یہ سوال کیا گیا ہے وہ لیر منتوف کے درد اور انسانی ہمدردی کو خوب ظاہر کر دیتی ہے۔

انشاپردازی اور جدت اسلوب کے لحاظ سے لیر منتوف کا ادبی کارنامہ ایک نظم ”گیت“ ہے۔ اس نظم میں لیر منتوف نے وہ خاص بحر اور قصہ سنانے کا بھوللا طرز اختیار کیا ہے جو روسی عوام کے گیتوں اور رزمیہ شاعری میں اس قدر لطافت پیدا کر دیتا ہے۔ اور وہ نقل اتارنے میں ایسا کامیاب ہوا ہے کہ نظم پڑھتے ہوئے کبھی شبہ تک نہیں ہوتا کہ وہ ایک تڑپت یافتہ مذاق کی تصنیف ہے۔ نظم کا موضوع زار او ان چہارم کے عہد کا ایک دردناک واقعہ ہے، اور لیر منتوف اسے بالکل اسی طرح شروع کرتا ہے جیسے روس کے

پیشہ ور رزمیہ داستانوں کے گانے والے اپنے قصے کو،

ارے ہاں ہاں زارِ اوانِ وسیلِ یوچ!

ہم نے تجھ پر اپنا گیت بنایا ہی،

تجھ پر اور تیرے چہیتے بوڑھی گارڈ کے سپاہی پر،

اور بہادر تاجر، کلاش نی کوف پر۔

ہم نے اسے پُرانے طرز پر بنایا ہی

اور اس کے ساتھ سرود کا سر ملاتے ہیں،

اور ہم اسے سناتے ہیں اور سنا کر روتے ہیں۔

پراو سلاف نسل کو اس سے تسلی ہوتی ہے،

اور نواب ماتو سے ہی رودانوں تک،

ہمارے واسطے پھین دار شہد کا ایک پیالہ لائے

اور ان کی گورے کھڑے کی بیگم

چاندی کے طشت میں ہمارے لیے

کارٹھا ہوا ریشم کا تیار و مال لائیں۔

ہم کو تین دن تین رات مہمان رکھا، ہماری خاطر کی

سارا قصہ سنا اور سننے سے ان کی طبیعت سیر نہ ہوئی۔

اس تمہید کے بعد اصل قصہ شروع ہوتا:

لہ ہندوستان میں انھیں بھاٹ کہتے ہیں۔

کہ یعنی صبح اور سچے دین کو ماننے والی سلاف نسل۔

آسمان پر آفتاب نہیں چمک رہا ہے،
 نیلے بادل اس سے آنکھیں نہیں رڑا رہے ہیں
 بلکہ زاراوان اپنے دربار میں رونق افزہ ہو اور چاروں طرف اس کے
 درباری اور خاص مصاحب کھڑے ہیں۔ زاراوان اپنے بوڑھی گارڈ کے
 سپاہیوں کو خاص الفت کی نگاہوں سے دیکھتا ہے۔ ان میں سب خوش اور
 مطمئن معلوم ہوتے ہیں، سوا ایک کے یہ اس کا چہیتا کر بے یو پوج ہواوان
 اس سے افسردگی کی وجہ دریافت کرتا ہے، اس خیال سے کہ شاید کسی چیز کی
 ضرورت ہو، لیکن پو پھنے سے پتہ چلتا ہے کہ دراصل وہ ایک عورت پر عاشق
 ہو گیا ہے۔

اس کی چال سبک، جیسے مہنس کا تیرنا،
 اس کی آنکھ رسیلی، جیسے فاخہ کی،
 بات کرے، جانو بلبل گارہی ہے،
 اس کے گالوں پر صبح کی سی سُرخی ہے،
 اس کے بھورے بال، جن میں سونے کی چمک ہے،
 رنگین فیتوں سے چوٹیوں میں بندھے ہیں،
 وہ اس کے کندھوں پر رہن گیتی ہیں، دوڑتی پھرتی ہیں،
 گورے سینے کو بوسے دیتی ہیں،
 وہ ایک تاجر کے گھرانے میں پیدا ہوئی ہے،
 نام اس کا ایونا دمیترا ہے۔

بادشاہ سے ایک معمولی دل کا ماجرا سمجھ کر کرب بے یوچ کوزیور اور جواہرات
 دینے کا وعدہ کرتا ہے کہ وہ اپنی معشوقہ کو شادی کرنے پر راضی کرے۔ لیکن واقعہ
 کچھ اور ہی تھا:

ارے ہاں ہاں زار اور ان وسیل یوچ!

تیرے چالاک غلام نے تجھے دھوکا دیا،

تجھے سچی بات نہیں بتائی۔

تجھے یہ نہیں بتایا کہ حسینہ کا

خدا کے گرجا میں نکاح ہو چکا ہے،

اس کا ایک جوان تاجر سے نکاح ہو چکا ہے

ہمارے عیسائی مذہب کے مطابق^۱۔

ہاں جوانو گاؤ،

مگر سرود کے سڑالو،

ہاں جوانو، گاؤ،

مگر بات سمجھ لو،

ایک خلیق نواب کو خوش کرنا ہے

اور ان کی گوری سلیم کو۔

ایک دن جب ایونا دمیترونا گرجا سے شام کو گھر واپس آرہی تھی

۱۔ یہاں پر نظم کا پہلا حصہ ختم ہوتا ہے۔ اس کے بعد کے چھ مصرعوں سے گیتوں کے گیت

ختم کرنے کا طرز معلوم ہوتا ہے۔

تو کرب یے یوچ نے سیر راہ اس کو زبردستی پیار کیا اور مہایوں کی نظروں میں اسے ذلیل کیا۔ اس حادثے کی وجہ سے اسے گھر پہنچنے میں دیر ہو گئی اور اس کا شوہر کلاش نی کون جو انتظار کر رہا تھا، اس پر بہت خفا ہوا۔ اس بیچاری نے معافی مانگی اور کرب یے یوچ کی شرارت کا سارا قصہ سنایا۔ دوسرے دن بادشاہ کے سامنے گھونے بازمی کا عام مقابلہ ہونے والا تھا اور کلاش نی کون نے تہیہ کیا کہ اس بد معاشی کی سزا میں کرب یے یوچ سے مقابلہ کر کے اسے جان سے مار ڈالے گا۔ لڑائی میں اس کی آرزو پوری ہوئی۔ کرب یے یوچ، جس نے مقابلے کے لیے عام چیلنج دیا تھا، اس کا گھونسا کھا کر مر گیا، لیکن بادشاہ کو اپنے چہیتے کے مارے جانے پر سخت غصہ آیا اور اس نے کلاش نی کون سے پوچھا کہ اس نے کرب یے یوچ کو قصداً جان سے مارا ہے یا محض اتفاق سے۔ کلاش نی کون نے بے دھڑک جواب دیا کہ اس نے قصداً مارا ہے، جس کی وجہ وہ سوا اپنے خدا کے اور کسی کو بتانے پر تیار نہیں۔ بادشاہ کا ارشاد ہوا:

اچھا ہوا، میرے بیٹے،

دلیر جواں مرد، تاجر کے لڑکے،

جو تو نے مجھے سچا جواب دیا۔

تیری جواں بیوہ اور تیرے یتیموں کو

میں خزانے سے گزارا دوں گا،

تیرے بھائیوں کے لیے آج سے حکم جاری کرتا ہوں

کہ وہ تمام ملک روس میں
بے محصول دیے تجارت کر سکیں۔

لیکن تو میرے بیٹے، توجا،

اس اونچی قتل گاہ پر

اور جلاد کے سامنے اپنا شوریدہ سر جھکا دے۔

میں حکم دوں گا کہ تیر تیز کر لیا جائے،

جلاد سے کہوں گا کہ شاندار وردی پہن لے،

بڑے گھنٹے گھر کا گھنٹا بجاؤں گا،

جس سے سب کو معلوم ہو جائے

کہ تو بھی میری عنایتوں سے محروم نہیں رہا۔

چنانچہ کلاش نی کوف معمولی مجرموں کی طرح قتل کر کے دریائے موسکوا

کے اس پار ایک مقام پر دفن کر دیا گیا جہاں تین سڑکیں آکر ملتی تھیں۔

اس کی قبر کے پاس سے خلق خدا گزرتی ہے۔

کوئی بوڑھا ہوا، تو سینے پر صلیب کا نشان بناتا ہے،

کوئی بانکا ہوا تو اکر کر چلنے لگتا ہے،

کوئی لڑکی ہوئی تو اس کی آنکھیں نم ہو جاتی ہیں،

اور کوئی سرود بجانے والا، تو وہ گا اٹھتا ہے۔

ہاں، بہادر جوانو،

سرود بجانے والو،

پاٹ دار آواز والو،

شان سے شروع کیا تھا، شان سے ختم کرو،

خوش بخت نواب کی جڑ!

ان کی گوری سلیم کی جڑ!

عیسائی ملت کی جڑ!

تعریف سے ہر شخص خوش ہوتا ہی اور وہ شاعر جو ہر دل عزیز می کی منزل تک سب سے چھوٹے اور آسان رستے سے پہنچنا چاہتے ہیں عموماً اپنے وطن اور ہم وطنوں کی مدح سرائی سے یہ آرزو پوری کرتے ہیں۔ لیکن اس موضوع پر جہاں کہیں نظمیں لکھی گئی ہیں وہ اس خاص ملک کے کٹر اور تنگ نظر وطن پرستوں کے سوا کبھی کسی کو پسند نہیں آسکتی ہیں؛ کیونکہ یہ موضوع کبھی کسی سچے شاعر کے شایان شان ہو نہیں سکتا۔ روسی ادب میں ایسی نظمیں بہت کم ملتی ہیں، کچھ اس وجہ سے کہ روسی ذہنیت کبھی یورپ کی مردوجہ وطن پرستی کی تعلیم پورے طور پر قبول نہیں کر سکی، کچھ اس لیے کہ ریاست کے جبر نے وطن میں زندگی بسر کرنا ہی دو بھر کر دیا تھا۔ روس میں ضرورت دراصل ایسے شاعر کی تھی جو لوگوں کی پست ہمتوں کو بلند کرے، انھیں ریاست کے جبر اور تشدد کی مخالفت پر آمادہ کرے، اور ان میں آزادی کا حوصلہ بڑھا دے، مگر اس راہ پر پہلا قدم رکھنا گویا سامی بیاریا کے کسی قید خانے میں عمر کے چند سال گزارنے کا ارادہ کرنا تھا اور کوئی تعجب نہیں کہ اس ہیئت ناک سزا کے خوف نے روسی شاعروں کو اس نوعیت کے قومی کلام سے باز

رکھا۔ ریل یہ لیت، لشکن کے دوست اور دکابریست بغاوت کے رہبر نے
اس قسم کی شاعری شروع کی اور اس کی سزا بھگتی، لیکن اس کا نہ تو کوئی استاد
تھا نہ اسے کوئی شاگرد ملا۔ اس کے بعد اگر کسی شاعر نے ریاست کے جبروت
کا خاکہ اڑایا تو لیر منتوف نے۔ وہ اس قدر مغرور، بے باک اور من چلا تھا کہ
اسے سزا کی مطلق پروا نہ تھی، مگر انہیں صفتوں نے اسے ہم وطنوں سے ایسا
بیزار کر دیا کہ اسے ان میں آزادی کے دلوں سے پیدا کرنے کی خواہش ہی نہیں
ہوئی۔ لشکن کے ماتم میں اس نے جو نظم لکھی وہ روسی دربار اور سوسائٹی کے
اعلیٰ طبقے کی بہت سخت ہجو تھی، لیکن اس میں لیر منتوف نے اپنا غصہ اتارا
تھا، قوم میں شورش پھیلانے کی کوشش نہیں کی تھی، اسی وجہ سے اسے سزا
بھی معمولی ملی۔ اس نظم کے بعد لیر منتوف نے نہ لشکن کی طرح زار کی مدح لائی
کر کے اپنی صفائی کی، نہ مہمل قوم پرستی کے جذبے سے دل کے داغ مٹانایا
ضمیر کا بوجھ ہلکا کرنا چاہا۔ اس کی بے نیازی اور بے پروائی کا رنگ وہی رہا
جو پہلے تھا اور افسوس ہی قوم کے مستقبل سے وہی بے تعلقی رہی جو پہلے تھی۔
اس نے ایک دو نظموں میں سرزمین روس سے لگاؤ ظاہر کیا ہی، کہیں کہیں،
مثلاً ذیل کے اقتباس میں روسیوں پر اعتراض کیے ہیں جن کا کوئی سننے اور
اور تسلیم کرنے والا ہوتا تو بہت فائدہ حاصل کر سکتا تھا:

شاعرانہ خواب آرٹ کے کارنامے،

ہمارے ذہن کو کسی شیریں نشے سے مست نہیں کرتے

لے نظم کا عنوان "ایک خیال" ہے۔

جو ذرا سا حس ہم میں باقی ہے اُسے کنجوسی سے جمع کیے ہوئے بیکار
خزانے کی طرح۔

ہم بڑے پلح سے سینے میں محفوظ رکھتے ہیں۔
ہماری محبت اور نفرت دونوں اتفاقی ہوتی ہیں،
ہم نہ محبت کا کچھ صدقہ دیتے ہیں اور نہ نفرت کا
اور اس وقت جب خون اُبل اُٹھتا ہے،
ہماری روح عجیب سردی سے ٹھٹھری رہتی ہے۔
ہمارے آبا و اجداد نے دل بہلانے کے جو پُر تکلف طریقے سوچے تھے،
اور اُن کی سیدھی سادی بچوں کی سی شہوت پرستی ہمیں سیدھی لگتی ہے،
ہم بغیر کوئی یادگار چھوڑے، بغیر کوئی لطف حاصل کیے
اپنے آپ پر ہنستے ہوئے قبر کا رستہ لیتے ہیں۔

لیبر منتوف یقیناً اس کی قابلیت رکھتا تھا کہ روسی قومیت میں روح
بھونک دے اور روسی وطن پرستوں کے لیے خیالات اور جذبات کا وہ
سرمایہ فراہم کر دے جو ان کے عقاید کی تبلیغ کے واسطے بہت ضروری تھا،
اور جس کے نہ ہونے سے روس کی ہر قومی تحریک کو صدمہ پہنچا۔ تقدیر کو مگر
کچھ اور منظور تھا۔ آخری مرتبہ تفقاز جاتے ہوئے لیبر منتوف اپنے وطن سے
یوں رخصت ہوا:

الوداع، گندے روس،
غلاموں اور آقاؤں کے ملک!

الوداع، آسمانی وردیوں،

الوداع، وردیوں کی تابعدار قوم!

لہ روس کے فوجی افسروں کی وردیاں آسمانی ہوا کرتی تھیں۔

تیسرا باب

فیوڈر اور انورچ چیوچف

”اس بے مثل شاعر سے، جو دنیا کے ہر ادب کے لیے باعثِ فخر ہو سکتا تھا، ہمارے ملک میں صرف نظم کے چند شائقین واقف ہیں، ورنہ ”تعلیم یافتہ“ لوگوں کے بہت بڑے حصے نے صرف اس کا نام سنا ہی یا کہیں... دو تین نظمیں دیکھی ہیں جو اس کے کلام کا صحیح نمونہ نہیں کہی جاسکتی ہیں“ روسی نقاد ولادیمیر سولوفیووف نے ۱۸۹۵ء میں اپنی قوم سے یہ شکایت کی تھی اور چیوچف کے کلام کے شائقین آج بھی یہی شکایت کر سکتے ہیں۔ ناقدر دانی کی تلافی کسی قدر اس صورت سے ہوئی ہے کہ چیوچف کا کلام جسے پسند آیا وہ بالکل اس کا فدائی ہو گیا۔ دوس کے تقریباً تمام سربراہ اور وہ انشا پرداز اس زمرے میں شامل تھے اور ان میں سے کچھ ایسے بھی تھے جن کے لیے بغیر چیوچف کے دیوان کے زندگی بسر کرنا ناممکن تھا۔

لہٰذا لٹرائی نے اپنے ایک خط میں کسی دوست سے چیوچف کا دیوان مانگا ہے اور اسے جلد بھیجنے کی تاکید کی ہے اس لیے کہ وہ اس دیوان کے نہ ہونے سے بہت بے چین تھا۔

تعلیم یافتہ لوگوں میں چیوچف کا چرچا اُس کی اپنی زندگی میں اس وجہ سے نہیں ہوا کہ اُس نے اپنے آپ کو بہت سختی سے قوم اور قومی دلچسپیوں سے الگ اور بے تعلق رکھا اور اپنے کلام کی اشاعت سے بھی حتی الامکان پرہیز کیا۔ اُسے گنہگار سے بچانے کی جو کوششیں بعد کو کی گئیں وہ اس سبب سے ناکامیاب رہیں کہ اس کا مذاق اور اس کے کلام کا رنگ کچھ ایسا تھا کہ وہ ہر دلغزیرہ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ چیوچف نے انسانی زندگی سے منہ موڑ کر فطرت کی طرف رخ کیا اور اسے فطرت کی کیفیتوں میں وہ حسن نظر آیا جو عام طور سے لوگ معشوقوں کے حال و خط و ناز و انداز میں تلاش کرتے ہیں۔ اُس نے اُن جذبات کی نیرنگیوں کو جو شاعر کا میدان سمجھی جاتی ہیں اور جن میں شاعر اپنا کمال دکھاتے ہیں یا تو ایسی فلسفیانہ پوشاک پہنا دی کہ وہ عوام کی نگاہوں میں چھ نہ سکیں، یا اپنے تصور کی شوخی سے ایسا بے حجاب کر دیا کہ اُن کا حسن اہل نظر کے سوا کسی پر ظاہر نہ ہو سکے۔ بد مذاقوں سے ہر شاعر کو شکایت رہی ہے، چیوچف کو محض بد مذاقوں نہیں بلکہ عام لوگوں سے بھی گہری نفرت تھی، جیسا کہ اُن نظموں سے ظاہر ہوتا ہے جو اس نے اپنی معشوقہ کے ماتم میں لکھی ہیں۔ ایسے شخص کے کلام سے ہر دلغزیرہ کی توقع کرنا فصول ہے۔

چیوچف کی زندگی کے حالات بہت کم معلوم ہیں۔ وہ ۱۸۰۳ء میں پیدا ہوا اور جب وہ اُنیس سال کا ہوا تو سفارت خارجہ میں کسی معمولی عہدے پر مقرر ہو کر روس کے باہر چلا گیا اور بیس سال یورپ میں بسلسلہ ملازمت رہا۔ وہاں سے واپسی پر ڈوہ محکمہ احتساب خارجہ کا ناظم بنا دیا گیا۔ ۱۸۲۱ء تک اس نے

رومن شاعر ہورس کے کلام کے ترجمے اور گاہے ماہے رسالوں میں نظمیں شایع
کیں، اس سال اسے ایک دوست نے اپنے کلام کا مجموعہ شایع کرنے پر مجبور کیا
اور کچھ دنوں کے لیے عام تعلیم یافتہ طبقوں میں چھوٹا مشہور ہو گیا۔ لیکن لوگ
اسے بہت جلد بھول گئے اور اس نے اپنی یاد تازہ کرانے کی مطلق فکر نہ کی۔
اس نے تمام عمر انہیں اصولوں پر عمل کیا جو اس کے نزدیک ہر سمجھ دار آدمی کو
اختیار کرنے چاہئیں اور جو اس نے ذیل کی نظم میں بیان کیے ہیں:-

عیب جوئی نہ کر، سوچ بچار نہ کر...
جستجو دیوانگی ہو، عیب نکالنا حماقت،

آج کے زخموں کا نیند سے علاج کر

اور کل جو ہو سو ہونے دے۔

زندگی میں ہر حالت برداشت کر لے جا۔

غم اور راحت اور پریشانیوں،

کاہے کی ہوس کرنا، کاہے کا افسوس؛

دن بیت گیا، اور شکر ہو خدا کا۔

چیوچف کا موضوع زیادہ تر قدرت کے مناظر ہیں اور کائنات میں انسانی
ہستی کی تصویریں چند نظمیں ایک عشق کی داستان سناتی ہیں جس کا شاعر کے
دل پر بہت گہرا اثر ہوا تھا۔ قوم کی لبر اوقات سے اسے مطلق سروکار نہ تھا،
لیکن جو تین چار نظمیں اس نے قوم کو اپنے دل کی بات سنانے کے لیے لکھی ہیں
وہ بے مثل ہیں اور اس کی نظر نے حقیقت کو اس صفائی سے دکھایا ہے کہ دوست

اور دشمن دونوں اس کی نکتہ بینی کی داد دیتے ہیں۔

مناظرِ قدرت سے مشرقی شاعری تقریباً بیگانہ ہے، مغربی شاعری میں مناظر بہت دکھائے گئے ہیں، لیکن صرف چند شاعروں نے، جن میں گوٹے، ورڈس ورٹھ اور چیوچف سب سے زیادہ کامیاب رہے ہیں، اس کا حوصلہ کیا ہے کہ ان مناظر کی مختلف کیفیتوں کو انسانی احساسات کا پس منظر بنائیں اور انسان اور فطرت کی ہم آہنگی سے ایک فلسفہ اخذ کریں۔ چیوچف کی فلسفیانہ نظر ان مناظر کو بھی جو بظاہر کوئی خصوصیت نہیں رکھتے ایک معنی پہنچا دیتی ہے جس کی وجہ سے انسان کو ان سے محبت ہو جاتی ہے، اسے بجلی کی چمک میں معشوق کا غصہ، بید محبتوں کی سرنگونی میں عاشق کی نیاز مندی نظر آتی ہے، وہ رات کے طوفانوں سے التجا کرتا ہے کہ فساد کا منظر دکھا کر کائنات کی بنیادیں نہ اکھاڑ دیں، اس کی آرزو ہے کہ فطرت میں فنا ہو کر ہستی کی قید سے آزاد ہو جائے اور وہ لطف حاصل کرے جو قطرے کو دریا میں گم ہو جانے سے نصیب ہوتا ہے۔

پہلے مناظرِ قدرت کی مثالیں دی جاتی ہیں۔ چیوچف کے طرز بیان سے یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ اس کے تصور میں کس قدر مشرقی رنگ تھا۔

گرمی میں کمی نہیں ہوئی،

جولائی کی رات روشن تھی۔

پست اور بے حس زمین پر

سارا آسمان، طوفان کا بوجھ سنبھالے ہوئے،

بجلیوں سے لرز رہا تھا۔

کسی کی آنکھ کے بھاری پوٹے۔

کبھی کبھی اٹھ جاتے تھے،

اور تیز رو بھلیاں کیا تھیں،

کسی کے غضب ناک دیدے

زمین پر چمک جاتے تھے۔

یہ منظر خفگی کا تھا۔ ایک اور کیفیت ملاحظہ ہو؛

غم میں ڈوبے ہوئے نیم برہنہ جنگل پر

ایک پُر معنی غنودگی چھائی ہے۔

بہار کی پتیوں میں سے جا بجا ایک دو

خزاں کے سنہرے رنگ میں چمکتی ہوئی

اب تک ننھی شاخوں پر لٹک رہی ہیں۔

میری آنکھیں ایک دل گداز ہمدردی سے بھر آتی ہیں

جب بادلوں سے گزرتی ہوئی

سوسج کی کرن، بھلی کی طرح چمک کر،

رنگ برنگی درختوں پر بکھر جاتی ہے۔

پڑمردگی بھی ہم کو کیسی بھلی لگتی ہے!

وہ منظر کیسا دلفریب ہوتا ہے

جب ایک چیز جو کبھی بھلی بھولی تھی

بے بس اور بیمار ہو کر

آخری بار مسکراتی ہے۔

مناظر قدرت میں شاعر کو انسانی جذبات، انسانی نیاز اور بے نیازی کی
جھلک بھی دکھائی دیتی ہے:

اے بید مجنوں، تو پانی کے اوپر

اپنا سر کیوں جھکائے ہے،

اور کانپتی ہوئی پتیوں،

گویا لالچی لبوں، سے

بہتے ہوئے چٹنے کو کیوں پکڑنا چاہتا ہے؟

چٹنے کے دھارے پر تیری ہر پتی

چاہے غم میں گھلے، چاہے تڑپے ...

چشمہ یوں ہی ہے گا، شور کرے گا،

دھوپ کا مزہ لے کر چمکے گا

اور تجھ پر ہنسا رہے گا۔

پتیوں کا فلسفہ سنیے :-

چاہے نمشاد اور صنوبر

جاڑوں بھر کھڑے رہیں،

اور پرت اور پرت کے طوفانوں میں

اوڑھ لپیٹ کر سو جائیں،

ان کی بے رس سبزی

چاہے کبھی سلی نہ پڑے ،
 لیکن کبھی تازی بھی نہیں ہوتی ۔

ہم ، رندان سبک سر ،
 جو پتیاں کہلاتے ہیں ،
 رنگ پر آتے ہیں ، چمکتے ہیں ،
 اور تھوڑے دنوں تک
 شاخوں کے مہمان ہوتے ہیں ۔

بہار کے حسن میں

ہم بھی حسین تھے ،

کرنوں سے کھیلتے

شبنم میں نہاتے تھے ۔

اب چڑیاں سب گاکچکیں

پھول مڑھیا چکے ،

سبزہ زار زرو ہیں ،

خوش گوار ہوائیں بدل گئیں ۔

اب ہم کیوں بیکار

ٹکے ٹکے مڑھائیں ؟

انہیں سب ساتھیوں کے پیچھے

ہم بھی کیوں نہ اڑ جائیں ؟

آؤتند و تیز ہواؤ،

جلدی چلو، جلدی!

ہم شاخوں سے اکتا گئے

ہم کو جلد چھڑالے جاؤ!

جلدی کرو، ہم کو چھڑاؤ

ہم اور نہ ٹھیریں گے!

اڑو، اڑو!

ہم بھی تمہارے ساتھ اڑیں گے!

کائنات میں انسانی ہستی کی حقیقت بتانا پیغمبر اور شاعر کا خاص کام ہے، مذہب اس حقیقت کے بیان پر اپنی تعلیم منحصر کرتا ہے، شاعری کو عموماً عقیدے اور اخلاق کے مسائل سے کوئی سروکار نہیں ہوتا، لیکن سچے شاعر اپنی سبکدوشی کے باوجود انسان کو وہ تعلق جو اس کی ہستی اور کائنات میں ہے اس طرح سمجھا دیتے ہیں کہ ہر صاحب ادراک اپنے دل سے خوف اور وحشت دور کر سکتا ہے اور وہ روحانی تسلی حاصل کر سکتا ہے جس سے رسمی دینیات کی بے لوج منطق اسے اکثر محروم رکھتی ہے۔ چیوچھٹ کے کلام میں انسانی ہستی کے یہ مسائل بہت نمایاں ہیں، لیکن اس نے اپنے روحانی "تجربوں" کو تعلیم کی شکل نہیں دی ہے۔ وہ محض تجربے ہیں اور تجربے ہر قسم کے ہوا کرتے ہیں۔

شام کے وقت شاعر کی کیفیت دیکھیے۔

سُرمئی رنگ کے سائے ایک دوسرے سے مل گئے،

روشنی دھیمی پڑی، غائب ہو گئی، آوازیں سو گئیں،

حرکت اور زندگی گھٹتے بڑھتے اندھیرے

اور دور کے شور و غل میں گھل مل گئی ہیں۔

ایک تلی جو نظر نہیں آتی رات کی ہوا میں

اڑتی سنائی دیتی ہے۔۔۔

یہ اُن تناؤں کا وقت ہے جو زبان پر نہیں آتیں۔

ساری ہستی مجھ میں ہے، میں ساری ہستی میں ہوں۔۔۔۔

خاموش اندھیرے، خواب آور اندھیرے،

میری روح کی تہ تک سما جا،

خاموش، تاریک، عطر بنیر،

سارا میری روح میں سما جا،

احساسات کو خود فراموشی کی تاریکی سے

لبالب بھر دے۔۔۔

مجھے نیستی کا مزہ چکھا دے۔

نیند کے متوالے جہاں میں فنا کر دے!

رات کی آمد کا یہ تصور ہے:

آسمان پر معصوم رات چھا گئی،

اور اس نے فرحت بخش اور پیارے دن کو

لپیٹ کر الگ رکھ دیا، ایک سنہری چاور کی طرح،

ایک چادر جو رات کے اتھاہ غار پر تنی ہوئی تھی -
 ظاہری دنیا، ایک ہی تصویر کے مانند، نظر سے غائب ہو گئی ہے،
 اور انسان مثل ایک یتیم بچے کے جسے سر رکھنے کو ٹھکانا نہیں
 اب بے بس اور برہنہ
 اس اتھاہ غار کے کنارے کھڑا ہے۔

وہ اب بالکل تنہا ہے،

اس کا دماغ ساکت ہے، خیالات کا کوئی خیر گیر نہیں،
 وہ اپنی روح میں ڈوب رہا ہے، اس کی روح بھی ایک اتھاہ دریا ہے۔
 اسے کوئی سہارا نہیں ملتا اور دریا بے کراں ہے۔

اب وہ ایک پُرانا خواب سمجھ کر، حیرت سے،

ہر روشن اور زندہ چیز کو یاد کرتا ہے،

اور اسے آخر کار یقین ہو جاتا ہے کہ یہ بیگانہ وحش اور پُر اسرار رات
 اس کا آبائی وطن ہے۔

رات کی آندھی، تاریکی اور طوفان کی فضا بھی شاعر کے دل کو ٹرپا دیتی ہے:

اور رات کی آندھی، تو کیا چیخ رہی ہے؟

کس فکر میں یوں دیوانہ وار تیزی سے بھاگ رہی ہے؟

تیری یہ آواز کیا سنا چاہتی ہے،

جو کبھی نحیف دزار، کبھی تند و پُرشور ہو جاتی ہے؟

تو ایک لہجے میں جسے میرا دل سمجھتا ہے

ایک پرورد شکوہ سُناتی ہے جسے وہ نہیں سمجھ سکتا۔
 تو میرے دل کو دکھاتی ہے اور تیرے جواب میں
 وہ کبھی کبھی دیوانوں کی طرح چیخ اٹھتا ہے۔
 ارے، یہ وحشتناک گیت نہ گا،

اس عالم فساد کا گیت جو قدیم ہے، عزیز ہے!
 رات کی روح کے اس محبوب گیت کو
 سارا عالم کس ذوق و شوق سے سُن رہا ہے!
 سارا عالم اس تمنا میں بیتاب ہے
 کہ جسم فانی کی قید سے رہا ہو کر
 ابدیت کے بے پایاں سمندر میں بہ جائے...
 ارے، سوتے طوفانوں کو نہ جگا!
 اُن کے نیچے فساد کا دریا اُبلنے کو تیار ہے۔

استعارے اور حقیقت، مناظرِ قدرت اور عالمِ خیال کی ایک عجیب آمیزش ملاحظہ ہو
 جیسے سمندر زمین کے کُرے کو گھیرے ہے،
 دنیاوی زندگی خوابوں سے گھری ہے۔
 رات ہوئی اور سمندر کی موجیں
 ساحل سے ٹکراتی ہیں اور ٹکرانے سے ایک صدا نکلتی ہے۔
 یہ اس کی آواز ہے۔ یہ دل کو بھاتی ہے، اپنی طرف بلاتی ہے،
 کہتی ہے کہ کشتی بندرگاہ میں پہنچ گئی ہے...

سمندر کا بہاؤ بہت جلد ہمیں ساحل سے بہا لیجاتا ہے
اور تارک، بے پایاں موجوں کی گود میں ڈال دیتا ہے،
آسمان کا گنبد ستاروں کے نور سے چمکتا ہوا

اپنی گہرائی سے ہمیں پُر اسرارہ نظروں سے دیکھتا ہے۔
ہم تیرتے رہتے ہیں اور اٹھاہ سمندر کی ابلتی ہوتی موجیں
ہمیں ہر طرف سے گھیرے رہتی ہیں۔

شاعر کی نظر سے وہ اختلاف بھی مخفی نہیں رہا ہے جو اکثر انسان کے
فلسفہ زندگی کو فطرت کی تعلیم سے جدا رکھتا ہے۔ وہ حیرت سے پوچھتا ہے:-
سمندر کی موجوں کا اپنا ترانہ ہے،

عناصر کی ان بن میں ایک ہم آہنگی ہے،
اور بچکتے ہوئے بید کے درختوں کی لرزش سے
ایک خوشگوار رُسر ملیا راگ نکلتا ہے۔

ہر نشو اور حرکت میں تناسب ہے،
فطرت کی ہم آہنگی میں خلل نہیں،
صرف ہم، اپنی آزادی کے دہم باطل میں مبتلا ہو کر
فطرت سے ناسازی محسوس کرتے ہیں۔

یہ ناسازی کہاں سے آئی، کیسے پیدا ہوئی؟
ہماری روح اس سنگت میں کیوں شریک نہیں ہوتی،
کیوں وہی گیت نہیں گاتی جو سمندر گاتا ہے

اور فکر میں ڈوبا ہوا بید گنگناتا ہے؟

اس اختلاف کا ایک اور پہلو ہے۔ فطرت کو بھی انسانی زندگی کے کاروبار سے کوئی تعلق نہیں۔ ذیل کی نظم، جو روس کے ایک مشہور میدان جنگ سے گزرتے وقت لکھی گئی تھی، فطرت کی اس سرد مہری کو بیان کرتی ہے۔

اس زندگی کا، جس کا یہاں شور و غوغا تھا،

اس خون کا، جس کے یہاں دریا بہ گئے،

کتنا حصہ محفوظ رہا، ہم تک کتنا پہنچا،

آج ہمیں صرف دو تین ٹیلے نظر آتے ہیں،

ان پر دو تین شاہ بلوط کے درخت اُگے ہیں

جن کی شاخیں میا کی سے دور تک پھیلی ہیں،

درخت سر سبز ہوتے ہیں، خوشی کے گیت گاتے ہیں اور انھیں اس کی فکر نہیں

کہ ان کی جڑیں کس کی لاش، کس کی یادگار چھپائے ہیں۔

یعنی فطرت کو گزرے ہوئے زمانہ کا کوئی احساس نہیں،

وہ ہمارے ماہ و سال کے پیمانے سے نا آشنا ہے

اور اس کے روبرو ہمیں اپنی ہستی کی تصویر دھندلی سی نظر آتی ہے۔

ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ہم محض صورتیں ہیں جو اسے خواب میں دکھائی دیتی ہیں۔

باری باری سے فطرت اپنے تمام بچوں کو

جو اپنی سعی لا حاصل انتہا تک پہنچا چکے ہیں،

بلا تفریق اس اٹھارے غار میں بلا لیتی ہے،

جس میں ہر شے فنا ہوتی ہے، جس سے ہر شے پیدا ہوتی ہے۔

فطرت اور انسان کے تعلق کا یہ پہلو شاعر کو پسند نہیں اور اس نظم کے سوا اس کے کلام میں ہم کہیں فطرت کو موت اور حیات کے کارخانے کی شکل میں نہیں دیکھتے۔ لیکن فطرت کی طرح خود شاعر کو بھی انسانی کوشش اور کامیابی سے اتنی دلچسپی نہیں تھی کہ وہ فطرت کے آئین اور انسان کی آرزوؤں کو ہم آہنگ بنانے کی تدبیریں سوچے۔

عشق کا مضمون نظم میں بہت پُرانا ہے اور اس لحاظ سے کہ ہر شاعر اپنے تجربے اور احساسات نرے سمجھ کر انھیں ایک نئی شکل میں پیش کرتا ہے، عشق کا مضمون ہمیشہ نیا بھی ہوتا ہے۔ چوچیف کے لیے عشق کا جذبہ وہی کیفیت رکھتا تھا جو ہر شاعر اور ہر انسان محسوس کرتا ہے، لیکن اس کے عشق کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ مناظر قدرت کی خوبیوں کو زیادہ روشن اور پُر معنی، اس اثر کو جو یہ دل پر ڈالتے ہیں زیادہ گہرا اور پُر کیف کر دیتا ہے۔ عشق اسے انسان اور کائنات کے رازوں سے آشنا کرتا ہے اور چوچیف عشق کے تصور میں اسی طرح کم ہو جاتا ہے جیسے مناظر قدرت کے مشاہدے ہیں۔

دن ڈھل رہا ہے، رات قریب ہے،

پہاڑ کا سایہ لمبا ہوتا جاتا ہے،

آسمان پر بادلوں کی چمک ماند پڑ گئی...

اندھیرا چھا گیا، شام ہو گئی۔

مگر مجھے رات کے اندھیرے کا کوئی خوف نہیں۔

نہ گیے ہوئے دن کے گزرنے کا افسوس -
 صرف تو، میری مسحور کن خیالی مورت،
 صرف تو میرا ساتھ نہ چھوڑنا! ...
 مجھے اپنے پروں کے سائے میں لے لے،
 میرے دل کی بتیابی دودھ کر دے،
 تب میری مسحور روح کے لیے
 تاریکی بھی فرحت بخش ہو جائے گی۔
 تو کون ہے؟ کہاں سے آئی؟ کیسے جانوں
 کہ تو زمین کی ہے یا آسمان کی؟
 ممکن ہے تو آسمان کی رہنے والی ہو
 مگر تیری روح ایک آرزو بھری عورت کی ہے۔
 چیو چیف نے کہیں اپنی معشوقہ کا سراپا نہیں بیان کیا ہے، صرف ایک نظم میں
 اس کی آنکھوں کی تاثیر بتائی ہے۔
 مجھے آنکھیں یاد ہیں۔ آہ، وہ آنکھیں!
 مجھے ان سے جو محبت تھی وہ خدا ہی جانتا ہے!
 ان کی طلسمی آرزو بھری رات
 میری روح کا قید خانہ بن گئی تھی۔
 اُن آنکھوں میں، جن کی کیفیت میری عقل سمجھ نہ سکی،
 جن کی نظر ہستی کے تمام راز روشن کر دیتی تھی،

ان آنکھوں میں کیا غم موجیں مار رہا تھا،
 جذبات کی کیا گہرائی تھی!
 ان کی نظر، پلکوں کے سائے میں بسیرا لیے ہوئے
 کبھی رنج و الم کی آہیں بھرتی،
 کبھی لذت سے سیر ہو کر نڈھال ہو جاتی،
 کبھی بلائے آسمانی بن کر گرتی۔
 ان پر کیف لمحوں میں
 کبھی مجھ سے یہ نہ ہو سکا
 کہ ان آنکھوں کو دیکھوں اور دل بتیاب نہ ہو جائے،
 اداسی کا حق ادا کروں اور آنسو نہ بہیں،
 معشوقہ کے انتقال کے بعد وہ گزرے ہوئے دن یاد کر کے کہتا ہے:
 میں اس سے ان دنوں بھی آشنا تھا،
 اس زمانے میں جو اب ایک پرانی کہانی معلوم ہوتا ہے،
 وہ زمانہ جو یاد سے محو ہو گیا ہے،
 جیسے صبح کا ستارہ، سورج کی کرنوں میں چھپ کر
 آسمان میں غائب ہو جاتا ہے۔
 ان دنوں وہ
 شاداب حسن سے مالا مال تھی،
 اس میں وہ تازگی تھی جو سورج نکلنے سے پہلے فطرت میں ہوتی ہے

جب شبنم کی بوند پھول پر ٹپک جاتی ہے
اس طرح کہ کوئی نہ دیکھ سکتا ہے نہ سن سکتا ہے۔

اس وقت اس کی زندگی

ایسی مکمل تھی، ایسی پاک،

دنیا کی عام روش سے اتنی بیگانہ،

کہ معلوم ہوتا ہے وہ مری نہیں

بلکہ غروب ہو گئی، جیسے ستارہ غروب ہوتا ہے۔

اسی عشق کا ایک اور پہلو ہے۔ مشرق کے لوگوں کو وہ بہت اٹو کھا معلوم ہوگا۔

یہاں عاشق اپنے جذبے کی سنگدلی اور بے رحمی کی شکایت کرتا ہے، اس لیے

کہ وہ معشوق کے لیے مہلک ثابت ہوا۔

آہ، ہماری محبت بھی کیسی قاتل ہوتی ہے،

جب پڑ ہو س جذبات کے بے لگام جوش میں

ہم ادب اور اسی چیز کو تباہ کر دیتے ہیں

جو ہمارے دل کو سب سے زیادہ عزیز ہوتی ہے۔

کیا بہت دن ہوئے جب اپنی فتح پر فخر کرتے ہوئے

تو نے کہا تھا: وہ میری ہے...

ایک برس بھی نہیں بتیا، اب خود ہی دیکھ

اس کی کون سی خوبی باقی رہی؟

اس کے گالوں کی گلاب جیسی سُرخی کیا ہوئی،

لبوں کا تبسم، آنکھوں کی چمک اب کہاں ہے؟
 جلتے ہوئے آنسو ایسے ہے
 کہ سب کچھ جلا کر خاک کر گئے!
 تجھے یاد ہے ملاقات کے وقت،
 اس پہلی کبخت ملاقات کے وقت،
 وہ اس کی جادو بھری نظر اور گفتگو،
 وہ اس کی چو پچال مہنسی؟
 اب کیا رہا؟ یہ سب شوخیاں کدھر گئیں؟
 اور تیرا خواب کتنے دن رہا؟
 افسوس، شمالی ملکوں کی گرمیوں کی طرح
 وہ چند لمحوں کا مہمان تھا!
 تیری محبت اس کے لیے تقدیر کی
 ایک بیسیت ناک سزا تھی،
 ایک رسوائی تھی جس کی وہ سزا دار نہ تھی،
 جس نے اس کی ساری زندگی برباد کر دی!
 عمر بھر اس نے ہر نعمت سے پرہیز کیا،
 دل ہی دل میں صد ہا تکلیفیں اٹھائیں...
 عہدِ شباب کی یادگاریں باقی تھیں
 لیکن وہ بھی اسے دھوکا دے گئیں،

دنیا کی ہر بات سے اسے وحشت ہونے لگی ،
 فریب زندگی کا سرور جاتا رہا...
 اس کی روح پھل پھول رہی تھی
 سوا سے بھی لوگوں کے حملوں نے پامال کر دیا۔
 مصیبتوں کی آگ نے سب کچھ جلا کر رکھ کر دیا ،
 اور یہ رکھ جو محفوظ رہی کیا تھی ؟
 درد ، روحانی تلخی کا بے رحم درد ،
 درد ، جسے نہ دوا نصیب ہوئی نہ آنسو۔
 آہ ، ہماری محبت بھی کیسی قاتل ہوتی ہے ،
 جب پُر ہوس جذبات کے بے لگام جوش میں
 ہم ادب اور اسی چیز کو تباہ کر دیتے ہیں
 جو ہمارے دل کو سب سے زیادہ عزیز ہوتی ہے۔
 چیو چیف جب اپنی معشوقہ سے پہلی بار ملا تو اس کی عمر ۴۸ سال کی تھی۔ اپنے جذبے
 کی اس خصوصیت کو بھی وہ محسوس کرتا ہے۔
 آہ ، عمر کے ڈھلے وقت ہماری محبت میں
 کیا دلسوزی ہوتی ہے ، کیسی دہم پرستی...
 کچھ دیر اور چمک دکھلا ، کچھ دیر اور
 آخری عشق ، ڈوپتے ہوئے سورج ، کی روشنی !
 آدھے آسمان پر اندھیرا چھا گیا ہے ،

صرف ادھر مغرب میں کچھ رونق باقی ہے۔
 ذرا ٹھہر، ذرا اور ٹھہر، اسی روز روشن کی یادگار،
 اسی ذوقِ نظر، اپنے جادو کا اثر ذرا اور رہنے دے!
 رگوں میں خون ٹھنڈا پڑ گیا تو کیا ہوا،
 دل تو شوق سے گرم ہے...

اسی آخری عشق!

تو روحانی لذت بھی ہو اور نا اُمیدی کا پیغام بھی۔
 یہ عمر، یہ جذبہ اور یہ انجام۔ کیا تعجب اگر شاعر کے دل میں صرف یہ حوصلہ باقی
 رہ گیا۔

جیسے جلتی راکھ پر پڑا ہوا کاغذ
 دُھواں دیتا ہے اور سلگتا ہے
 اور چھپی ہوئی آگ چپکے چپکے
 اس کے الفاظ اور سطروں کو چاٹ جاتی ہے،
 یوں ہی میری زندگی برباد ہو رہی ہے،
 روز تھوڑی تھوڑی دُھواں بن کر اڑ جاتی ہے،
 اور میں، ایسی کیسانی سے جو برداشت نہیں ہوتی
 رفتہ رفتہ جل کر بھسم ہو رہا ہوں....
 اسی آسمان، کیسا ہوتا اگر یہ آگ،
 ایک بار دل کول کر بھڑک اٹھتی،

اور رنج اور سست قدم موت کی تکلیفوں سے رہا ہو کر
میں ایک بارگی جل اٹھا اور جل جاتا!

چیو چن کی نظمیں پڑھ کر ہم اس کا اندازہ لگا سکتے ہیں کہ قومی اور ملکی مسائل کو وہ
کن نگاہوں سے دیکھتا ہوگا۔ سوا ایک نظم کے جو اس نے ایک دوست کے
اصرار پر لکھی تھی اور جس میں روسیوں کو قسطنطنیہ کی فتح کا مزہ سنایا گیا ہے اس
نے کبھی کسی قسم کے سیاسی جوش کا اظہار نہیں کیا۔ اسے اپنے ملک سے محبت بہت
کم تھی، لیکن بالکل بیگانگی برتنا ناممکن تھا۔ دونظمیں جو روس میں خاص طور
پر مشہور ہوئیں درج کی جاتی ہیں:-

یہ مفلس بستیاں،

یہ اجڑی سر زمین، یہ بے لطف آب و ہوا۔

یہ تیری کائنات ہے، امر مظلومیت کے گھر،

ای روسی قوم کے وطن!

غیروں کی مغرور نظران احساسات کو

نہ دیکھ سکتی ہے، نہ سمجھ سکتی ہے،

جن کی روشنی تیری عاجزی اور بے کسی کے پردے سے گزر کر

تیری روح کو چمکاتی ہے۔

صلیب کے بوجھ سے زیر بار کر کے

تھے، ای میرے وطن،

آسمان کے بادشاہ نے غلامی کے خمیرے

بنایا اور بنا کر برکت دی۔

دوسری نظم اس سے کچھ کم ہمت شکن ہے اور اس کے آخری مصرع میں ایک بات کہی گئی ہے جو ان تمام خیالات کا جو روس کی نسبت ظاہر کیے گئے ہیں،

لُبّ لباب ہے:

روس کو عقل نہیں سمجھ سکتی،

عام پیمانہ نہیں ناپ سکتا،

اُس کا ایک اپنا الگ معیار ہے۔

روس سے صرف عقیدت ہو سکتی ہے۔

چوتھا باب

کوندرا تائی مئی فیوڈور وروچ ریل یے لیف (۱۷۹۵-۱۸۶۶)
وہ ذہنی بیداری جس کی کرلیوف، لٹیکن اور لیرمنتوف کی شاعری شہادت
دیتی ہے سیاسی دنیا میں بھی ظہور میں آئی اور آزادی کی شناختی کا جو دعویٰ لٹیکن
نے کیا تھا وہ دراصل چند معمولی ہم عصر شاعروں نے پورا کیا جن میں شاعری کی
قابلیت لٹیکن سے بہت کم تھی مگر حب وطن کا ولولہ بہت زیادہ تھا۔ ان
شاعروں میں ریل یے لیف کا درجہ سب سے بلند ہے۔ وہ ایک خوش حال
زمیندار اور ہونہار نوجواں تھا۔ اُس نے اُس آخری جنگ میں جو پولین سے
ہوئی شرکت کی اور اُس کے بعد پیتربرگ میں میجسٹریٹ مقرر ہوا۔ جنگ نے
اُس کے وطن پرستی کے جوش کو بہت اُبھار دیا، اور جب لڑائی ختم ہونے کے
بعد ریاست کے رویتے سے یہ ظاہر ہو گیا کہ وہ قوم کی دلی آرزوؤں سے صرف
بیگانہ نہیں بلکہ اُن کی دشمن ہے تو ریل یے لیف بھی ان محنتی سیاسی جماعتوں کا
رکن بن گیا جو روس کے مختلف شہروں میں آزادی حاصل کرنے کی غرض

سے ۱۸۱۵ء کے بعد قائم ہوئیں۔ چند سال میں ریل یے یف ان جماعتوں کی شمالی شاخوں کا سردار مقرر ہو گیا اور دسمبر ۱۸۲۵ء میں زار نکولائی (۱۸۲۵-۱۸۵۵) کی تخت نشینی پر ان جماعتوں نے زیادہ تر اس کے اُکسانے سے بغاوت کا جذبہ ابلند کیا۔ سرکنتی کی سر میں جون ۱۸۲۶ء میں ریل یے یف کو پھانسی ہو گئی۔

ریل یے یف کے کلام میں پہلے صرف وطن پرستی کا جذبہ موجزن رہا لیکن رفتہ رفتہ اس نے اس تنگ حلقے سے نکل کر آزادی اور سرفروشی کو اپنا موضوع بنایا۔ محکمہ احتساب نے اس کی نظموں کی باقاعدہ اشاعت نہیں ہونے دی مگر اس کا کلام قلبی لقلوں کی صورت میں ہاتھوں ہاتھ تمام روس کی گشت لگاتا تھا۔ اس کی سب سے مشہور نظم ”وومی نروف سکی“ جس میں اُس نے روس کو چاک کے ایک آزادی کے متوالے کا قصہ سنایا ہے جسے پیٹر اعظم نے قید کر کے سائی بیریا بھیج دیا تھا۔ سائی بیریا میں وومی نروف سکی کی لوجوان بیوی اُس کے پاس پہنچ گئی، لیکن بیچاری آب و ہوا کی سختیاں برداشت نہ کر سکی۔ وہ بہت جلد مر گئی اور وومی نروف سکی کو جس کی اُمیدیں پہلے ہی خاک میں مل چکی تھیں، بالکل تنہا اور بے بس کر دیا۔ قصہ بہت دردناک تھا، ریل یے یف نے اُس کے بیان کرنے میں معمول سے زیادہ شاعرانہ خوبیاں دکھا کر بیوی کی محبت اور آزادی کی پرستاری کا حق ادا کیا اور یہ نظم سالہا سال تک روسی وطن پرستوں کے دلوں میں ہمت لے دیکھے ”سیاسی تحریکیں“۔

اور درد اور آزادی کے فدائیوں سے محبت اور ہمدردی پیدا کرتی رہی۔
 ”وہی نردت سگی“ کے سواریلے یف نے کوئی لمبی نظم نہیں لکھی
 اور اس کے بقیہ کلام میں اس نظم کا جواب نہیں ملتا، لیکن پھر بھی اس کی منقہ
 نظمیں ایک شدید اور پاک جوش سے لیریز ہیں جو ان کی ادبی خامیوں پر
 پرہہ ڈال دیتا ہے۔ ایک نظم کا ترجمہ ملاحظہ ہو۔

ای پُر شکوہ آزادی کے جذبے!
 میری قوم کا دل تجھ سے نا آشنا ہے...
 ای انتقام آسمانی! میری قوم خاموش ہے،
 زار کے خلاف سر نہیں اٹھاتی۔
 خود مختار ظالم آقا کی غلامی میں
 وہ دائمی اطاعت سے انحراف نہیں کرتی
 اس کا دل اپنا دکھ محسوس نہیں کرتا،
 اس کا ذہن یہ نہیں مانتا کہ وہ دکھی ہے۔
 میں نے غلام روس کو خانہ خدا میں
 مقدس شبیہ کے سامنے دیکھا:
 اپنی زنجیریں کھڑکاتا ہوا، سر جھکائے،
 وہ زار کے لیے دعائیں مانگ رہا تھا۔

یعنی گے نی می ابراہیم پوچ بار ایتن سکی (۱۸۰۰-۱۸۴۴)

بار ایتن سکی زبان دانی اور سخن سنجی میں استاد مانا جاتا ہے شروع جوانی میں وہ فنستان میں جلا وطن کر دیا گیا تھا، وہاں کے پرف پویش مناظر قدرت نے اس کے دل پر بہت اثر کیا، اور اس کی شاعری میں ضبط اور پاکیزگی کا ایک عجیب انداز پیدا کر دیا۔ اپنے زمانے میں وہ اپنے گہرے خیالات اور فلسفیانہ مضامین کی بنا پر بھی مشہور تھا۔ لیکن اس کا کلام خاص طور سے پسند تھا اور اس معاملے میں تعلیم یافتہ روسی عموماً اس کے ہم خیال تھے۔

۱۸۵۰ء کے بعد کی سیاسی شورشوں میں اس کی یاد بالکل بھلا دی گئی اور اس دور میں آرٹ کی نسبت جو خیالات تھے ان کے مطابق بار ایتن سکی میں کوئی ایسی خوبیاں بھی نہیں تھیں کہ اس کی یاد زندہ رکھی جائے لیکن صدی کے آخر میں پھر اس کے کلام کی طرف توجہ کی جانے لگی اور مجلس شعرا میں اسے پھر وہ رتبہ مل گیا جس کا وہ مستحق تھا۔ ”ایڈا“ میں بار ایتن سکی نے فنستان کے ایک قصے کو نظم کیا ہے۔ ”گینڈ“ ایک نیم فلسفیانہ نظم اور ”جھٹ پٹا“ اس کے کلام کے بہترین نمونے مانے گئے ہیں۔ اس کا خاص طرز ذیل کی نظم سے بھی واضح ہو جائے گا جو اس نے جرمن شاعر گوٹے کی وقتاً پر لکھی تھی۔ افسوس ہے ترجمے میں زبان کی فصاحت اور الفاظ کا وہ ترنم نہیں پیدا کیا جاسکتا جو نظم کی جان ہے۔

وہ آن کھڑی ہوئی اور اس با عظمت بزرگ نے اپنی عقاب کی آئی نکھیں

سہ یعنی موت۔

آرام کرنے کے لیے بند کر لیں،
اس کے چین اور سکون میں کوئی چیز خلل انداز نہیں، کیوں کہ
وہ اس دنیا میں

اپنا کام سارا ختم کر کے گیا ہے!
اس معجز نگار کی قبر پر آہ و زاری نہ کر، افسوس نہ کر
کہ اس کا جسم کیڑوں کی نذر ہو گا،
اس کا سورج غروب ہو گیا، لیکن دنیا میں کوئی جان دار شہ نہیں
جس سے اس نے آشنائی کی رسم نہ پیدا کی ہو،
اس کا دل ایسا تھا جس نے ہر اس صدا کا جواب دیا
جو ہمارے دل سے جواب کی امیدوار ہوتی ہے،
اس کے بلند پرواز خیال نے کل کائنات کی سیر کی،
اور لامکان کی حد تک پہنچ گیا۔

اس کی روح کی پرورش تمام نعمتوں سے ہوئی تھی: حکیموں کے
محنت سے حاصل کیے ہوئے علم سے
فتوٰن لطیفہ کے الہامی کرموں سے
بزرگوں کی روایات، گزشتہ زمانے کی آرزوؤں،
انسانیت کے عہد شباب کی امیدوں سے۔
اس کا تصور ایک اشارے پر اُسے ہر جگہ پہنچا دیتا
چاہے غریب کی جھونپڑی ہو یا بادشاہ کا محل۔

وہ فطرت کا ہمدوم اور دمساز تھا،

نہنے چشموں کا تلا کر پولنا،

پتیوں کی بات حیت سمجھتا تھا۔

گھاس کا بڑھنا محسوس کرتا تھا،

ستاروں کے راز اس کے بے ایک کھلی کتاب تھے،

سمندر کی موج اس سے ہم کلام ہوتی تھی۔

انسان کی ہستی اس نے پرکھ لی تھی، انسان کا وہ استمان لے چکا تھا!

اگر جہانی زندگی پر

خدا نے ہماری ہستی کے صبار رفتار دور کو ختم کر دیا ہے

اور قبر کے خندق کے اس پار

مادی دنیا کے دوسرے کنارے پر، کوئی نئی زندگی ہماری منتظر نہیں

تو خدا اس کی قبر کو عزت بخشنے گا۔

اور اگر مرنے کے بعد پھر جینا ہے،

تو وہ، اس دنیا سے بالکل دست بردار ہو کر،

اور پھر، یہاں کی صداؤں کا ایک خوش آہنگ، پر معنی جواب دے کر

زمین کا پورا حق ادا کر دے گا۔

اس کی روح پرواز کر کے اپنے خالق کے پاس پہنچ جائے گی،

اور اس زندگی کی یاد اسے جنت میں نہ ستائے گی۔

نکولائی میخائیلوچ یزی کوف (۱۸۳۶-۱۸-۳) بار تین سکی کی طرح یزی کوف فصاحت بیان اور قادر الکلامی میں مشہور ہے۔ بد قسمتی سے اس کی ساری عمر بیماری میں گزری اور عین اس وقت جب اس کی طبیعت کے جوہر کھل رہے تھے اُسے موت نے آگھیرا لیکن گو اس کا ذہن پوری نشوونما نہ پاسکا اس کے کلام میں بہت سی خوبیاں ہیں، جن میں سب سے نمایاں اس کا متانہ ترغم ہے جو بقول روسی نقادوں کے ایک نہایت لطیف نثر پیدا کرتا ہے۔ ایک نظم کا ترجمہ ملاحظہ ہو:-

”بحری سیاح“

ہمارا سمندر مردم بیزار ہے،
 دن رات شورش میں رہتا ہے۔
 اس کی ہلاکت خیر وسعت میں
 بہت سے مصیبت زدہ دفن ہیں۔
 بھائیو! ہمت باندھے رہو! میرے بادبانوں میں ہوا بھری ہے،
 میں نے کشتی کا رخ ٹھیک کر لیا ہے
 اور موجوں کی چوٹیوں پر
 وہ ہوا کی طرح اڑ رہی ہے۔
 سمندر پر بادل منڈلا رہے ہیں
 ہوا تند ہو گئی، موجوں کا رنگ گہرا ہو گیا ہے۔
 طوفان آ رہا ہے! ہم اس کا مقابلہ کریں گے،

اس سے نبرد آزمائی کریں گے!
 بھائیو! مہمت باندھے رہو! بادل اُٹھ رہا ہے،
 سمندر ابل رہا ہے،
 موجیں اور اونچی اُچھل رہی ہیں۔
 سمندر کی کھتاہ اور نیچے چلی گئی ہے،
 وہاں طوفان کے اُس پار
 ایک دل آویز زہت کدہ ہے،
 وہاں آسمان کو کالے بادل نہیں ڈھک دیتے،
 خاموشی نہیں چھا جاتی۔

مگر وہاں موجیں اسی کو پہنچاتی ہیں
 جس کے سینے میں جواں مردوں کا دل ہو...
 بھائیو مہمت باندھے رہو، طوفان کے جھونکوں سے گھری ہوئی،
 میری کشتی سینہ سپر ہو رہی ہے۔

الکے نئی ستے پانودچ خوم یا کوف (۱۸۶۰-۱۸۰۴)

خوم یا کوف "سلاف دوست" جماعت کے بانیوں میں تھا اور اپنی عمر
 اس نے زیادہ تر اسی فرقے کے سیاسی اور مذہبی فلسفے کے پرچار میں صرف کی۔
 اس کی شاعری پر بھی اسی فلسفے کا رنگ غالب ہے، اور وطن پرستی کے سوا او
 مضمون اس میں بہت کم ہیں۔ لطف جذبات نہ ہونے سے اس کا کلام کچھ

ردکھا سا معلوم ہوتا ہے، مگر اپنے رنگ میں خوم یا کوفت اچھا شاعر مانا گیا ہے۔
 آخر عمر میں اُس نے جنگ کریمیا کے وقت جو نظمیں لکھیں وہ اس کے کلام کا بہترین
 حصہ ہیں۔ اور "سلاف دوستوں" کی طرح خوم یا کوفت کو بھی روس سے بہت امیدیں
 تھیں، اُسے یقین تھا کہ روسی قوم برگزیدہ قوم ہے، لیکن اس عقیدے نے اہلیت
 کو اس کی نظر سے نہیں چھپایا اور وہ کسی بجا مغالطے میں مبتلا نہیں ہوا۔ ذیل کی نظم
 وطن پرستی کے جذبے کے تمام پہلوؤں کو بخوبی ظاہر کرتی ہے،

روس

خدا نے تجھے حق کی حمایت کے لیے تلوار اٹھانے کا حکم دیا ہے،
 تجھ پر خدا کی نظر اتنا ہے،
 تجھے ایک جلالی قوت ملی ہے،
 تو ان اندھی، دیوانی، وحشی قوموں کو نیست و نابود کر دے گا
 جو دنیا میں بدی کے بیج بوتی ہیں۔
 اٹھ کھڑا ہو میرے عزیز وطن!
 بھائیوں کی حمایت کر! خدا تجھے
 ڈرنیوب کے اس پار بلا رہا ہے۔
 وہاں جہاں سمندر کی موجیں
 اپنے مکروں سے ساحل کو جگا دیتی ہیں۔

اے بلغاریہ اور سر دیا کے باشندے بھی سلاف نسل کے ہیں۔ انہیں ترکوں کی حکومت
 سے آزاد کرنا روسی مدبروں اور وطن پرستوں کی دلی آرزو رہی ہے۔

مگر یاد رکھ : نیابتِ الہی
 مخلوق کے لیے دستوار ہے؛
 اپنے خاص بندوں سے خدا سختی سے باز پرس کرتا ہے،
 اور افسوس تیرے کندھوں پر
 ہیبت ناک گناہوں کا یوجھ ہے...
 خدا کے سامنے اپنی روح کو سجدہ کرا۔
 اپنے سر کو خاک پر رکھ کر
 عاجزی اور پامالی کو اپنی عبادت بنا،
 اور اپنے گمراہ ضمیر کے زخموں کا
 آنسوؤں کے پاک مرہم سے علاج کر۔
 پھر اٹھ، اپنے پاک مقصد پر ایمان لا،
 میدان جنگ کی خون آلود خاک میں اپنا زور بازو دکھا
 اپنے بھائیوں کے لیے خون کے دریا بہا دے،
 حق کا جھنڈا مضبوطی سے پکڑ لے،
 پھر تلوار چلا۔ یہ تلوار خدا کی تلوار ہوگی۔

عوام سے بھائی چارا کرنے کی اُمنگ روس میں ۱۸۶۷ء کے بعد پیدا ہوئی،
 مگر عوام کے ادب اور تہذیب سے دلچسپی روس کی ذہنی بیداری کے ساتھ آئی۔
 صدی کے شروع میں ظاہر ہونے لگی۔ لیر منتوف کی مشہور نظم کا ترجمہ اوپر یا جا چکا۔

جو اس نے عوام کے طرز پر لکھی اور لٹیکن نے کئی عوام کی کہانیاں نظم کیں جو اس نے اپنی کھلائی کی زبانی سنی تھیں۔ گو ان نظموں کو ادبی اہمیت بہت ہے لیکن پھر بھی یہ محض طبع آزمائیاں ہیں۔ لٹیکن اور لیر منتوف کا ہم عصر کولٹ سوت ایک شاعر تھا جس نے عوام کا طرز بالکل اختیار کر لیا اور عوام کی زندگی اور جذبات کو اپنا خاص موضوع بنایا۔ کولٹ سوت کے گیتوں کی آواز ابھی گونج ہی رہی تھی کہ الگ سے می ٹالسٹائی اور فی کی تن نے اپنے ترانے پھیڑے اور عوام کے شاعرانہ مذاق کی لطافت اور اس کے حسن کو روس کیا ساری یورپ دنیا کے اہل ذوق پر روشن کر دیا۔

الگ سے می ویل یوچ کولٹ سوت (۱۸۰۹-۱۸۴۲)

کولٹ سوت صوبہ وورونیز کے ایک مولٹیوں کے تاجر کا لڑکا تھا۔ شروع میں اسے اسکول میں کچھ تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا مگر چونکہ اس کے باپ کا ارادہ اسے اپنے پیشے میں لگانے کا تھا، کولٹ سوت بہت جلد اسکول کے بجائے مولٹی چرانے کے لیے بھیجا جانے لگا۔ اتفاق سے اسکول کے ایک استاد اور شہر کے ایک تاجر کتب اس پر مہربان ہو گئے اور ان کے ذریعے سے کولٹ سوت نے صرف اپنی علمی استعداد نہیں بڑھائی بلکہ شعر لکھنے کی مشق بھی شروع کر دی۔ یہی زمانے میں وہ ایک لڑکی پر عاشق ہو گیا اور اس جذبے کے دردناک انجام نے اس کی طبیعت میں دل کی کیفیتیں ظاہر کرنے کی اور بھی شدید آرزو پیدا کر دی۔ اتفاق سے اس کے

کلام کے نمونے ماسکو کے ایک مشہور رئیس اور ادب کے پتے دوست تان
 کیے وچ کی نظر سے گزرے اور ستان کیے وچ نے صرف اس کی ہمت افزائی
 نہیں کی بلکہ اپنے ساتھ ماسکو لے گیا، اسے روس کے ادبی مشاہیر کی صحبت
 سے فائدہ اٹھانے کا موقع دیا اور ۱۸۳۵ء میں اس کی نظموں کا پہلا مجموعہ اپنے
 خرچ سے شایع کرایا۔ اس کے بعد کولٹ سوف کو سرپرستی کی حاجت نہیں تھی۔
 اس کی نظموں کا وہ شہرہ ہوا جو بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے مگر افسوس موت
 نے اس پھول کو کھلنے سے پہلے ہی توڑ لیا۔

کولٹ سوف کی پرورش گائوں میں ہوئی تھی، اس کے جذبات نے دیہاتی
 کی فضا میں تربیت پائی تھی، اس کا فلسفہ زندگی وہی تھا جو روسی کسانوں
 کا ہوا کرتا ہے۔ لیکن اور لیر منتوف کی طرح اس نے اپنے آپ کو تصور کے زو
 سے ایک دنیا سے دوسری دنیا میں نہیں پہنچایا، اس کی شاعری ایک
 پتے دیہاتی کی نغمہ سرائی ہے جو شہری مذاق کی لطافتوں سے بالکل نادقف،
 پرندوں کی طرح لہرا کر گاتا ہے۔ اس کے بے ساختہ پن ہی میں اس کے فن
 کا کمال ہے، اور جن چند نظموں میں اس نے وہ مضمون باندھے ہیں جو دیہاتی
 فلسفہ زندگی میں شامل نہیں وہ اس کے دوسرے کلام کے مقابلے میں
 بہت گری ہوئی ہیں۔ کولٹ سوف کی طبیعت اپنی رنگینی اسی وقت دکھائی
 ہو جب وہ دیہاتی موسم کی کیفیتیں اور جذبات پر اس کی فضا کا اثر بیان
 کرتا ہے، دیہاتی عشق اور درد کی داستانیں سناتا ہے، یا اس تقدیر کی شگفتگی
 کرتا ہے جس نے انسانوں کو بے بس کر دیا ہے اور اس پر بھی ایک سویلی ماں کی

طرح دکھ پہنچانے سے باز نہیں رہتی۔ کولٹ سوٹ کی نظم میں کھیتوں کا لہرانا، کھیتی کا کٹنا، دیہاتیوں کی معمولی سے معمولی خواہشیں اور ضروریات، ان کا رنج اور ان کی خوشیاں، ان کی آرزوئیں اور ناکامیاں سب ایک نہایت لطیف شاعرانہ انداز میں نظر آتی ہیں اور ہم کو کبھی خیال نہیں ہوتا کہ یہ روز مرہ کی باتیں ہیں، ہرگز لقمین نہیں آتا کہ یہ داستان افسانہ نہیں، زندگی کی سچی تصویر ہے۔

رولیف اور قافیہ ترقی یافتہ مذاق کی ایجادیں ہیں، ان کا جذبات سے کوئی تعلق نہیں اور وہ عموماً عوام کی شاعری میں نہیں پائے جاتے ہیں، اس لیے کہ عوام کی شاعری پڑھی نہیں جاتی، صرف گائی جاتی ہے اور دراصل جب تک وہ گائی نہ جائے اس کی صورت ایک اچھے مگر ناموزوں شعر کی سی ہوتی ہے۔ کولٹ سوٹ کی نظموں کو بھی اسی نقطہ نظر سے دیکھنا چاہیے۔ ان میں نفاست اور طرز بیان کی باریکیاں تلاش کرنا فضول ہے، پڑھنے میں ان کے مصرعے اکثر ناموزوں معلوم ہوتے ہیں۔ وہ اسی وقت مزہ دیتی ہیں جب کوئی خوش آواز روسی بالالائی کا ہاتھ میں لے اور انھیں روسیوں کے خاص بھاری پُردرد لہجے میں گا کر سنائے۔ لیکن پڑھنے میں بھی خیالات کی سادگی اور طرز بیان کا بھولا پن خاصا لطف پیدا کر دیتا ہے۔ مثال کے طور پر تین نظموں کا ترجمہ کیا جاتا ہے:-

لہ تین تاروں کے سرود کی قسم کا ساز چوروسیوں کا قومی باجا ہے۔

گیت

مت گابلبل

میری کھڑکی کے سامنے،

جا، میرے دل میں کے

جنگلوں میں اڑ کر جا!

جا، میری پیاری کی

کھڑکی پر فریاد کر!

اپنی سُر ملی گی میں

میرے اشتیاق کا حال سنا...

اُسے سُنا دے کہ اُس بن

میں کھٹلا رہا ہوں، مڑھجار ہا ہوں،

جیسے میدانوں کی گھاس

خزاں کے آنے پر۔

اُس بن چاندنی راتیں

مجھے اندھیری لگتی ہیں،

دن کی دھوپ میں

چمک نہیں، گرمی نہیں،

وہ تہہ ہو تو مجھ سے

دروازے پر کون پیار سے ملے؟

اپنے تھکے ماندے سر کو
 کس کے سینے پر سکھ نیند سلاؤں؟
 کس کی مٹھی مٹھی باتیں
 سن کر مسکراؤں؟
 کس کا گیت، کس کا پیار سے ملنا
 میرے دل کو بھائے؟
 تو کیا گارہی ہی
 میری کھڑکی کے سامنے، بلبل
 جا، جا، اُڑ کر جا
 میری پیاری کے پاس۔

شور نہ مچا

شور نہ مچا، اُمی گہوں کے کھیت
 اپنی پگی بالیوں کی زبان سے،
 ستپ لے کی یاد میں گیت نہ گا۔

لے "ستپ" ان وسیع ہموار میدانوں کو کہتے ہیں جو اردس کے جنوبی، جنوب مشرقی اور
 مشرقی حصے میں پائے جاتے ہیں۔ ان میں گھاس کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا اور ان کے
 باشندے مولیشی پال کر گزر کرتے ہیں۔ "ستپ" کی اپنی الگ فضا ہوتی ہے اس کے
 باشندے اپنی جولا نگاہ کی وسعت دیکھ کر آزادی اور خود مختاری کے شیدائی بن جاتے
 ہیں، اکائناات سے ان کا ایک خاص تعلق ہو جاتا ہے جس میں انھیں اپنی شخصیت اسی طرح
 بقیہ برصغیر آئندہ

ای کھیت کاٹنے والے،

اب کیا ہے جو میں

گھر گریستی کا سامان کروں۔

اب کیا ہے جو میں

دولت اکٹھا کروں!

جو ان نے روپیہ جوڑ جوڑ کر رکھا تھا،

دولت جمع کی تھی،

کچھ اپنے لیے نہیں

اپنی پیاری کے لیے۔

اس کی آنکھ سے آنکھ لڑتی

تو میرا دل کیسا خوش ہوتا،

اس کی آنکھیں بھری تھیں،

رس سے، محبت سے!

اب ان آنکھوں کا چراغ

گل ہو گیا ہے،

(بقیہ صفحہ گزشتہ) غیر محدود نظر آنے لگتی ہے جیسے خود ستیپ اور انھیں ایسی جگہ اور ایسے

ماحول میں رہنا بہت درد بھر ہوتا ہے جہاں ان کی نظر دور دور کی سیر نہ کر سکے، اور

ان کے رہنے پہنے میں کسی قسم کی پابندیاں ہوں۔ "ستیپ" کی یاد میں گیت گانا گویا

کھوئی ہوئی آنا دی کا ماتم کرنا ہے۔ لہٰذا داستان سنانے والے کی مراد اپنے آپ سے،

میری پیاری

مردوں کی نیند سوری ہی ہے۔

پھاڑ سے بھاری،

بیچ رات کے اندھیرے سے بھی کالا،

میرے دل پر بوجھ ہے

جُدائی کے دکھ کا۔

جُدائی

جب جوانی کا سورج نکل رہا تھا

مجھے دل و جان سے ایک پیاری لڑکی سے محبت تھی،

اس کی آنکھوں میں سورج کی چمک تھی،

اس کے چہرے پر محبت کی آگ جل رہی تھی،

اس کے سامنے تیری کیا ہستی تھی، بہار کی صبح،

یا تیری، ہرے پھرے شاہ بلوط کے درخت،

یا تیری، ستپ کی گھاس، سبز مٹھل کی چادر،

یا تیری، امی جھٹ پٹے، یا تیری، اسی جادو بھری رات !

تم پر تو نظر تب ہی پڑتی ہے جب وہ نہ ہو،

جب تم کو کوئی اپنے درد اور اشتیاق کا حال سنائے !

وہ سامنے ہو تو تم دکھائی بھی نہیں دیتے...

وہ ساتھ ہو تو جاڑا بہار ہو جاتا ہے، اندھیری رات اُجالا دن !

وہ گھڑی کیسے بھول جاؤں جب میں نے آخری بار
 اس سے کہا "خدا حافظ" میری پیاری!
 شاید خدا کی یہی مرضی ہو کہ ہم جدا ہو جائیں،
 مگر پھر کبھی ملیں گے..."
 اک دم اس کے چہرے پر آگ سی بھڑک اٹھی،
 پھر وہ برف کی طرح سفید پڑ گیا۔
 تڑپ کر دیدانوں کی طرح
 وہ میرے سینے سے لپٹ گئی۔
 "ابھی تہ جا، ذرا ٹھیک مہلت دے
 کہ دل کو سنبھال لوں، سو رما کے کندھے پر
 رو کر اپنے رنج کو بہا دوں..."
 وہ سسکیاں لینے لگی، بات زبان پر آ کر رہ گئی...

ادوان ساوچ نی کی تن (۱۸۲۲-۱۸۶۱)

نی کی تن کولٹ سوف کے وطن شہر وورونیز میں پیدا ہوا۔ فلسفی کے
 علاوہ ایک اور مصیبت یہ تھی کہ اس کا باپ شرابی تھا اور نی کی تن کا بچپن
 اور اس کی جوانی نہایت درجہ تنگ دستی اور افلاس میں گزری۔ مگر تمام دشواریوں
 کے باوجود نی کی تن نے اچھی خاصی تعلیم حاصل کر لی اور ۱۸۵۳ء میں جب کریمیا
 کی جنگ شروع ہوئی تو اس نے چند وطن پرستانہ نظمیں شایع کر کے ادبی

دنیا میں کچھ نام پیدا کر لیا۔ لیکن یہ اس کا اصلی رنگ نہیں تھا اور اسے مشہور
 اس کی لمبی نظم ”کولاک“ نے کیا، جو دیہاتی زندگی کی ایک سچی اور دل سوز تصویر
 تھی۔ کولاک سوت کی طرح فی کی تن کا موضوع بھی عوام کی زندگی اور دیہاتی
 فضا تھی، لیکن زبان اور اسلوب میں اس نے عوام کا طرز نہیں اختیار کیا۔
 اس کی نظم میں کوئی نرالی صفت نہیں ہے، پھر بھی دیہاتی فضا کی کیفیات
 بیان کرنے میں بہت کم شاعر اس کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ غربت کی تکلیفوں
 نے اس کے کلام میں ایک درد بھی پیدا کر دیا جو کبھی کبھی مایوسی اور حزن کی
 انتہا تک پہنچ جاتا ہے۔ موت کا ایک خیالی منظر دیکھیے:-

پھوڑے نے ایک گہری خندق کھود دی ہے۔

بے لطف زندگی، تنہائی کی زندگی،

بے آرام زندگی، بوجھل زندگی،

خزاں کی رات جیسی خاموش زندگی،

گزر گئی میری غریب زندگی، خونِ جگر پیتے پیتے،

بچھ گئی، جیسے لٹ و دوق میدان میں کوئی چھوٹی سی چنگاری۔

کیا ہوا؟ سو جا، میرے سنگدل نصیب!

لکڑی کے تختے میں مضبوطی سے کیلیں جڑی جا رہی ہیں،

اوپر سے گیلی مٹی پانی جا رہی ہے

لے ”کولاک“ دیہاتی ساہوکار کو کہتے ہیں۔

کے یورپ میں جنازے دفن ہونے سے پہلے لکڑی کے صندوق میں بند کر دیے جاتے ہیں۔

دنیا میں بس ایک آدمی کم ہوا ہے...
 اس کے اٹھ جانے کا کسی کو افسوس نہیں،
 اور کسی کو کیا غرض کہ اس کی یاد زندہ رکھے!
 قبرستان کی ایک مہان، ایک موسمی چڑیا
 بے فکری سے گارہی ہے،

آزادی سے صاف شفاف ہوا میں تیر رہی ہے،
 چاندی کے ریزوں کی طرح اس کے گیت کے سر بکھر رہے ہیں۔
 خاموش!... زلیست کا معمہ اب حل ہو گیا ہے۔
 اب نہ آنسو درکار ہیں نہ گیت

الک سے ٹی کونس تان تی نو وچ تالستائی (۱۸۱۴-۱۸۷۵)

یہ مشہور نواب (کاونٹ) تالستائی کا ایک عزیز دار، روس کے دولت مند
 زمینداروں میں سے تھا۔ زار الکساندر دوم سے اس کی گہری دوستی تھی اور
 اس کی ساری عمر دربار میں گزری، مگر اس نے کبھی کوئی عہدہ یا منصب قبول
 نہیں کیا۔

نچکن کی طرح الک سے ٹی تالستائی نے بھی ایسا ذہن پایا تھا جس کی
 وسعت اور ہمہ گیری حیرت انگیز تھی۔ ادب کے تقریباً ہر میدان میں اس
 کی تصانیف نے شہرت حاصل کی، خصوصاً تاریخی ڈراما اور شاعری میں۔ اس کا

لہ اس کے ڈراموں کا ذکر ”روسی ڈراما“ کے سلسلے میں آئے گا۔

نظموں میں بھی بہت رنگارنگی ہے، کچھ اس نے کولٹ سوف کی طرح عوام کے طرز پر لکھی ہیں، کچھ دیہاتی فضا پر، کچھ روس کے مناظر پر۔ اس کے اس کلام میں وہ درد نہیں جو کولٹ سوف کی خاص خوبی ہے اور عوام کے طرز کے ساتھ وہ ان کی ذہنیت نہیں اختیار کر سکا، اس کے جذبات وہ نہیں ہیں جو روسی کسان یا دیہاتی کے عموماً ہوا کرتے ہیں، لیکن دیہاتی فضا کی کیفیات اس نے بہت دل آویزی اور نفاست سے بیان کی ہیں، خصوصاً جہاں عشق کا مضمون آگیا ہے۔ اس کے علاوہ اس نے بہت سی چھوٹی بڑی طنزیہ نظمیں لکھی ہیں، جو اپنی طرز میں بے نظیر ہیں۔ اس کی ظرافت آمیز شاعری کا بھی روسی ادب میں جواب نہیں۔ ”یوحنا دمشقی“ اس کی ایک لمبی نظم، جس کے ایک حصے کا یہاں ترجمہ کیا گیا ہے، مذہبی جذبے کی ایک جلالی کیفیت دکھاتی ہے اور تالستانی کی ذہنیت کا ایک دوسرا اور گہرا پہلو مختلف قسم کی نظموں کے چند ترجمے دیے جاتے ہیں۔

تجھے یاد ہے، مریم؟

ایک پرانی وضع کا مکان،

امداونگھتے ہوئے تالاب کے گرد

لیمو کے سال خوردہ درخت؟

خاموش روشیں۔

- اجڑا ہوا باغ

اونچے برآمدے میں۔

تصویروں کی لمبی قطار؟

تجھے یاد ہے دمریم،

شام کو آسمان کی رونق،

کھیتوں کے فراخ میدان،

دور کے گانو کا غل؟

باغ کے پیچھے دریا کے صاف، ستمفرے کنارے،

اطمینان سے بہتی ہوئی ندی،

سنہرے کھیتوں میں،

سدپ کے نیلے پیلے پھول؟

وہ کنج جہاں پہلے پہل ہم دونو

ایکے پھر کرتے تھے؟

تجھے یاد ہیں، مریم،

وہ کھوئے ہوئے دن؟

”یوحنا دمشقی“ کی تھلک کلیسا کی مناجات ”*Dies irae*“ کے

طرز پر لکھی گئی ہے اور اس میں رہبانی فلسفہ زندگی بیان کیا گیا ہے۔ چذاقتباس

ملاحظہ ہوں :-

اس دنیاوی زندگی میں کون سی راحت

ریخ کی آمیزش سے بالکل پاک ہے؟

کونسی تمنا ہے جو بے سود نہیں؟

کون ہے وہ جسے مسرت کی دولت نصیب ہوئی ہے؟
 وہ سب کچھ بے بنیاد ہے، سب بے حقیقت ہے
 جو ہم نے محنت اور مشقت سے حاصل کیا ہے۔
 دنیا میں وہ شہرت کے ملی ہے،
 جو قائم رہے اور جھوٹی نہ ہو؟
 سب خاک ہے، سب دھوکا، ایک پرچھائیں سی، یا دھواں،
 بھونچال کی طرح ایک آن میں سب نظر سے غائب ہو جاتا ہے،
 اور موت آتی ہے تو ہم کو
 پرہنہ اور بے بس پاتی ہے۔
 زور آور کا ہاتھ کمزور ہو جاتا ہے،
 بادشاہوں کا بھی کوئی پوچھنے والا نہیں ہوتا۔
 ارضیا، اپنے بندے پر جو یہاں سے رخصت ہوا ہے
 جنت کے دروازے کھول دے!

گلتی ہوئی ہڈیوں کے ڈھیر میں
 کون بادشاہ ہے، کون غلام، منصف کون اور مجرم کون؟
 کون ہے مستحق فلاح کا، فردوس کا،
 کون ہے ملعون گناہگار؟
 ارے بھائیو! کہاں ہے چاندی اور سونا،

کہاں ہیں لونڈی غلاموں کے لشکر؟
گناہ قبروں میں
کون سی امیر کی ہے کون سی غریب کی؟
سب راکھ ہے، سب دھواں، سب خاک اور خاکستر،
سب دھوکا ہے یا پرچھائیں سی، یا نظر کا فریب۔
صرف تیرے یہاں، آسمان پر، اے خدا،
قرار بھی ہے اور نجات بھی!
جو گوشت ہے وہ سٹر گل جائے گا،
جو وہم ہے وہ دغا دے جائیں گے۔
اے خدا، اپنے بندے پر جو یہاں سے رخصت ہوا ہے،
جنت کے دروازے کھول دے!

.....

میں ایک بے جانے بوجھے راستے پر جا رہا ہوں،
امید اور خوف کے پیچ و تاب میں ہوں،
میری آنکھوں میں روشنی نہیں، سینے میں گرمی نہیں،
کان کچھ سنتے نہیں، حواس کا پتہ نہیں،
میں بے زبان ہوں، بے حرکت پڑا ہوں،
بھائیوں کے رونے کی آواز مجھ تک نہیں پہنچتی،
اور لوہان کے نیلے خوشبودار دھویں سے

مجھے کوئی فرحت نہیں ہوتی،
 لیکن بھائیو! گو میں نے ہمیشہ کے لیے آنکھیں بند کر لی ہیں،
 میری محبت جاگتی رہے گی،
 اور اسی کی خاطر، تم سے التجا کرتا ہوں، بھائیو،
 کہ سب کے سب خدا سے یہ دعا مانگو:
 اے خالق! اس روز جب صور اُسر افیل،
 کائنات کو فنا کا پیغام سنائے،
 تو اپنے بندے پر جو اس جہان سے رخصت ہوا ہے،
 جنت کے دروازے کھول دینا!
 الگ سے نئی تالیف کی ظرافت کا ایک نمونہ بھی پیش کیا جاتا ہے،
 جہاں اس نے پُرانی وضع کے حکام کا مضحکہ اُڑایا ہے:
 کچھری کے سامنے بہت سے کسان اور مزدور
 جمع ہوئے:
 سادہ لوحی سے سب کہنے لگے کہ ہمارے پیٹ
 خالی ہیں۔
 ”بیوقوفو! منشی نے کہا، ” تم میں سے ہر ایک کو
 سیر ہونا چاہیے

۱۸۶۶ء تک روس میں ہندوستان کی طرح انتظامی اور عدالتی محکمے یک جاتھے جس
 منشی کا یہاں ذکر آتا ہے اسے کلکٹر صاحب کا کلرک سمجھنا چاہیے۔

اس لیے کہ کل ہی انتظامی مجلس کے اراکین نے مچھلی خوب پیٹ بھر کر
کھائی تھی،

کسان بہت سی سن سے لدی ہوئی گاڑیاں بازار کو
لیے جا رہا تھا۔

کسان تو سیدھا سادہ ہوتا ہی ہے، وہ ان سب کو پل پر سے
لے گیا۔

”ارے بیوقوف“ منشی نے کہا، ”تو کیا سمجھتا ہے یہ پل
بیکار ہے؟“

پل کو گھس کر خراب نہ کر، دریا پار تیر کے جا،
جیسے بطخ،

واسکا وڈ لچک کے یہاں چور نے ایک بطخ
پکڑی،

تو لیے میں لپیٹ کر لے بھاگا، اور پولیس والے اس کو
پکڑ نہ پائے۔

”بیوقوفو!“ منشی بولا، ”یہ تو لیا آخر کس کا تھا؟
واسکا کا؟“

۱۰ روس میں کسان ایسے غریب اور محتاج تھے کہ کسی کے پاس تو لیا ہونا تعجب کی بات تھی
اور جس کسی کے پاس ہوتا تو اس پر چوری کا گمان ہوتا تھا۔

پھر تو واسکا بھی چور ہی، پھر تو واسکا کو بھی جرمانہ
دینا پڑے گا۔“

منشی کے پاس ایک بیمار آیا۔ کہنے لگا: ”ہائے، ہائے، ہائے، ہائے!“
دُہائی سرکار کی!

دن بھر میٹ میں درد ہوتا ہے اور سویرے کے وقت
اور بھی۔

نہ لیٹا جائے، نہ بیٹھا جائے نہ کھایا جائے
کچھ بھی۔“

”اکی سو قوت!“ منشی بولا، ”جا کبھی خالی پیٹ پر کھانا
مت کھا۔“

منشی کے پاس ایک آدمی عرضی لے کر آیا کہنے لگا: ”غریبوں کے
مائی باپ ہو،

میرا کام کرا دو، دیکھو میرے پاس روپے پیسوں کی
تھیلی ہے،

میرے لیے تمہاری ٹوپی میں دس روپے ڈال دینا
کوئی بڑی بات نہیں؟“

منشی نے ٹوپی بڑھائی، ڈانٹ کر بولا ”اس میں روپے
فورا ڈال دو۔“

۱۰ یعنی تقریباً پندرہ روپے۔

نی کولائی الک سے یوچ نکراسوف (۱۸۲۱ - ۱۸۷۸)

نکراسوف صوبہ پودولیا کے ایک چھوٹے شہر میں پیدا ہوا، جہاں اس کا باپ ملازم تھا۔ اس کے باپ نے اپنی حیثیت سے زیادہ ٹھاٹھ کی زندگی بسر کر کے موروثی جائیداد گنوا دی اور آخر کار پولیس میں ایک ادنیٰ ملازمت اختیار کرنے پر مجبور ہوا۔ خاندان چونکہ شریف تھا، اس لیے نکراسوف کو سولہ برس کی عمر میں پیتر برگ کے کیڈٹ کالج میں داخل کر دیا گیا، مگر اس نے فوجی افسر بننے کا حوصلہ چھوڑ کر یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنا شروع کر دیا۔ یہ اس کے باپ کی مرضی کے بالکل خلاف تھا اور سرکشی کی سزا میں نکراسوف کا خرچ، جو ویسے بھی بہت کم تھا، بلند ہو گیا۔ طالب علمی کے تین چار سال نکراسوف نے فاقے کر کے گزارے اور اس کے بعد بھی کئی سال تک انتہائی افلاس کی مصیبتیں جھیلتا رہا۔ ۱۸۴۷ء کے قریب، جب وہ اخبار "ہم عصر" میں مضامین اور نظمیں لکھتے لکھتے اس کا مددگار ایڈیٹر ہو گیا تو اس کی حالت کچھ سنبھل گئی اور عمر کا بقیہ حصہ اس نے کسی قدر آسودگی میں بسر کیا۔

بچپن میں نکراسوف اپنے باپ کے ساتھ گائوں کی گشت لگایا کرتا تھا اور اسی زمانے میں اُسے دیہاتیوں کے اخلاق اور عادات اور دیہاتی زندگی کے اچھے اور بُرے، دلکش اور دلگداز پہلوؤں سے بہت گہری واقفیت ہو گئی۔ پیتر برگ میں افلاس نے اُسے شہر کے سب سے ذلیل اور گرے ہوئے لوگوں کی صحبت میں ڈال دیا اور اُسے ان کی مادی اور روحانی حالت کا بھی علم ہو گیا۔ نکراسوف نے اپنی ذاتی مصیبتیں بہت جوں مرد

برداشت کی تھیں اور وہ اس کے دل میں نوع انسانی کی طرف سے کسی قسم کی
 نجش، بیزاری، مایوسی یا نفرت نہیں پیدا کر سکیں۔ پتھر برگ کے ان باشندوں
 میں جو سلاج سے خارج اور انسانوں میں شمار ہونے کے ناقابل سمجھے جاتے
 تھے اسے ہر طرح کے آدمیوں سے سابقہ پڑا، لیکن یہاں بھی نکر اسوف نے
 اپنا دل کھٹا نہیں ہونے دیا اور محبت اور انسانی ہمدردی کے سوا کوئی اور
 جذبہ اس کی طبیعت پر غالب نہیں آنے پایا۔ غریبوں اور مصیبت زدوں سے
 محبت اور ہمدردی رکھنے کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ نکر اسوف ان کی زندگی کو قابل
 برداشت بنانے کی عملی کوشش کرے۔ ۱۸۶۱ء تک وہ اور روشن خیال روپیوں
 کی طرح کسانوں کو آزاد کرانے کی جدوجہد میں مشغول بھی رہا، مگر پھر اس کے بعد
 عملی سیاسیات سے کنارہ کش ہو گیا۔ جیسا کہ اُس نے خود اعتراف کیا ہے: "پیٹ
 پالنے کی دشواریوں نے میری شاعری کھوٹی کر دی اور شاعری نے مجھے آزادی
 کا مجاہد نہیں بننے دیا" نکر اسوف واقعی اس کشمکش کی وجہ سے نہ کامل شاعر
 بن سکا۔ جاننا مجاہد۔ یہ بات قابل افسوس ہے، مگر اس کے تجربے نے اس کے
 دل میں ایک ایسا سچا اور جان سوز درد پیدا کر دیا جو اس کی شاعری کی ایک
 گراں مایہ صفت ہے اور اس کی وجہ سے اُسے شاعروں میں خاص امتیاز
 حاصل ہوا ہے۔ اس درد کے خلوص اور شدت کو سارے روسی نقاد تسلیم کرتے
 ہیں، لیکن اس کے سوا نکر اسوف کی شاعری کے بارے میں بہت کم اتفاق
 رائے ہے، بعض اسے لشکن اور لیر منتوف کا درجہ دیتے ہیں، بعض کو اسے
 اوسط درجے کا شاعر ماننے میں بھی تامل ہے۔ فن کے نقطہ نظر سے نکر اسوف کے

کلام پر بہت سے سخت اعتراض کیے جاسکتے ہیں، لیکن اس کا تخیل ہمیشہ
 بندی کی طرف مائل رہتا ہے اور اس کی تشبیہیں استعارے اور مضامین اکثر
 طبعِ نادر ہیں۔ وہ بات اٹک اٹک کر کہتا ہے، اکثر محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنے خیالات
 کو بہتر الفاظ میں ادا کر سکتا تھا، مگر پھر بھی یہ کہنے کی گنجائش رہتی ہے کہ ان خامیوں
 سے اس کے خیالات پر کوئی حرف نہیں آتا۔ نقادوں میں اختلاف زیادہ تر
 اس وجہ سے ہے کہ شاعری کے معیار مختلف ہیں، ہر شخص کا معیار اس کے مذاق
 کے مطابق ہوتا ہے اور مذاق میں یک رنگی اور ہم آہنگی پیدا کرنا مشکل ہے اور
 سچ پوچھے تو کچھ ایسا ضروری یا مفید بھی نہیں۔ جن روسیوں کی طبیعت قوم پرستی
 کی طرف مائل ہے اور جو عوام سے ہمدردی کرنا، ان کی زندگی سدھارنا اپنا فرض
 سمجھتے ہیں ان کی نظروں میں نکر اسوف کے مقابلے میں نشکن، لیر منتون اور
 چوچیف بھی مشکل سے جج سکتے ہیں۔ ان کے برخلاف جو لوگ شاعری کو لطیف
 جذبات تک محدود رکھنا چاہتے ہیں اور دوسروں کی مصیبت میں ہمدردی
 کرنا اپنا اخلاقی فرض نہیں سمجھتے وہ نکر اسوف کے فن کی خامیوں کو بہت زیادہ
 محسوس کرتے ہیں اور اس کی عظمت کبھی تسلیم نہیں کر سکتے۔ ان دونوں کے درمیان
 جو بہت بڑا فرقہ ایسے لوگوں کا ہے جنہیں نازک احساس یا باریک بینی نظر رکھنے
 کا دعویٰ نہیں ہے وہ نکر اسوف کے بارے میں کوئی قطعی رائے نہیں قائم کر سکتے
 اس کے خیالات کا ان کے دلوں پر ضرور اثر ہوتا ہے مگر اس کی نظم کو موزوں
 پڑھنے میں اُنہیں اکثر دشواری بھی ہوتی ہے۔

نکر اسوف کی نظمیں زیادہ تر حقیقت نگارانہ ہیں، ان میں دیہاتی اور شہری

زندگی کی پُرورد تصویریں ہیں یا دل سوز واقعات بیان کیے گئے ہیں اس کے سارے کلام میں وہ درد جو تجربہ اور انسانی ہمدردی نے اس کے دل میں پیدا کیا تھا نمایاں ہے اور وہ خاص نلفظ بھی جو اس درد کا نتیجہ تھا نکر اسوف غریبوں کی جہاتی اور روحانی تکلیفوں کی داستان سنا رہا ہے امیروں کے ظلم اور سرد مہری پر رہتا ہے اور دنیا کے اس نظام کی شکایت کرتا ہے جس نے انسان اور اس کی تمناؤں کو اس قدر بے بس کر دیا ہے۔ اس کی آخری صدا اُمید اور دلا سے کی ہوتی ہے، مگر یہ دلا سا وہ اسی وقت دیتا ہے جب وہ دوسروں کو اپنی طرح رنج اور حزن میں مبتلا کر کے ان کے دلوں کو وہ صدمے پہنچا لیتا ہے جو اس کے اپنے دل نے برداشت کیے ہیں۔ یہ دلا سا کسی اعلیٰ نصب العین کی صورت نہیں اختیار کرتا، نکر اسوف نے نہ کسی بہتر زندگی کے خواب خود دیکھے نہ دوسروں کو دکھا سکتا ہے، وہ ہمارے دل میں صرف ایسے جذبات بیدار کرتا ہے جن سے اس نے اپنی زندگی میں تسلی اور تسکین حاصل کی، جو اس کے درد کی دوا تو نہیں تھے مگر اسے حزن اور یایوسی اور کلہبیت کے مرض میں ہمیشہ کے لیے گرفتار ہونے سے بچاتے رہے۔

معدروس میں کون چین سے رہتا ہے، "نکر اسوف کی سب سے لمبی اور اکثر نقادوں کی رائے میں اس کی بہترین نظم ہے چند کسانوں میں یوں ہی باتوں باتوں میں یہ بحث چھڑ جاتی ہے کہ روس میں کس طبقے کے لوگ سب سے زیادہ خوش اور مطمئن ہیں اور چونکہ وہ بحث سے مسئلے کو طو نہیں کر سکتے اس لیے وہ ملک کا چکر لگاتے ہیں اور ہر طبقے کے نمائندوں سے اس کی زندگی کے اصل حالات دریافت کرتے ہیں۔ گو گول کی طرح نکر اسوف اس طریقے سے

روس کی دردناک حالت بیان کرتا ہے اور اگرچہ اس کی نظم میں فن کے اعتبار سے صرف بعض حصے واقعی اچھے ہیں اس نے کیرکٹروں کی صورت گری میں کمال دکھایا ہے۔ اس کی حقیقت نگاری گوگول کی ”مردہ روجوں“ کا مقابلہ کر سکتی ہے۔ لمبی نظموں میں روس میں کون چپن سے رہتا ہے“ کے بعد ”لال ناک والے پالے“ کا درجہ آتا ہے جس میں ایک غریب کسان کی بیوہ واریا کا قصہ ہے جو اپنے شوہر کے کفن کے لیے لکڑیاں کاٹنے کو جھجکل جاتی ہے اور وہاں پالے میں ٹھٹھ کر مر جاتی ہے۔ لال ناک والے پالے کی شکل میں موت کو آتے دیکھ کر وہ گھبراتی نہیں چلاتی نہیں، شکایت نہیں کرتی، صرف گزشتہ زندگی کے چند پیارے منظر اس کے سامنے آجاتے ہیں اور آخر میں اسے ایک سر بلا گیت سنائی دیتا ہے جسے سننے سننے وہ اس دنیا سے رخصت ہو جاتی ہے۔ ان دونوں نظموں کے علاوہ نکر اسوف کا ایک اور لمبی نظم بھی قابل ذکر ہے جس میں دکیبرست بغاوت کے سزاوار لوگوں کی داستان اور سائی بیریا میں ان کی زندگی کی کیفیت بیان کی گئی ہے، مگر اس نظم میں سوا اس حصے کے جہاں بیگم دول کو فس کیا اپنے سزا یافتہ شوہر سے ملتی ہے اور سب بہت اذیت دینے کے ہیں۔

نکر اسوف کی مختصر نظمیں فن کے لحاظ سے بہت اچھی ہیں اور ان میں اس کا تخیل نسبتاً آزاد بھی معلوم ہوتا ہے، گو اکثر ان میں بھی نکر اسوف مبلغ اور مصلح کا انداز ترک نہیں کرتا۔ دو نمونے ملاحظہ ہوں :-

مناجات

ایک خدا، اپنی برگزیدہ ملت کو نعمتوں سے مالا مال کر!

اس کی محنت و مشقت پر بار آوری کی برکت نازل کر!

اس کی آزادی کی آرزوؤں کو قوت دے،

اس کے اندر انصاف کی بنیاد کو مستحکم کر،

تاکہ اس کی مبارک کوششیں

کامیابی کے ساتھ جاری رہ سکیں،

قوم کو پیاس دے

اور علم کے سرچشمے کا اسے راستہ دکھا۔

غلامی کی ذلت سے

اپنی برگزیدہ بندوں کو بچا،

کہ وہ ترقی کے راستے پر یہ لغزہ مارتے ہوئے چلیں:

”خدا کو روس پر بھروسا ہی!“

ماں

اس کا دل غم سے بھرا ہوا تھا،

اور جس وقت اس کے تین شوخ اور کھلندڑے بچے

اس کے گرد کھیل رہے تھے اور شور مچا رہے تھے،

وہ کسی خیال میں محو تھی اور اس کے ہونٹ آہستہ آہستہ کہہ رہے تھے:

”بے نصیب بچو، تم آخر کیوں پیدا ہوئے؟“

تم بیدھڑک تباہی کے سیدھے راستے پر چلو گے،

تقدیر کے لکھے سے بچنے کی کوئی صورت نہیں!“

ای جانباز اور جفاکش ماں، ان کی قسمت پر مت رو،
 ان کے روشن دلوں کو غم سے تاریک نہ کر!
 انہیں شروع جوانی ہی سے یہ سمجھا دے:
 ایک ایسا زمانہ بھی ہوتا ہے، پوری صدیاں کی صدیاں
 جب کانٹوں کے تاج سے زیادہ زیبا اور پسندیدہ
 کوئی عزت نہیں ہوتی...

نکراسوف نے اپنی نظم ”پھیری والوں“ میں روسی دیہاتن کی ذہنیت
 کا خاکہ کھینچا ہے۔ ایک لڑکی کا دوست، کوئی رنگیلا پھیری والا، ایک خاص
 تہوار کے دن تک واپس آنے کا وعدہ کر کے چلا گیا ہے۔ لڑکی
 اکثر اکیلی پڑھی ہوئی

ساری رات جاگ کر گزارتی تھی،
 اور جب اونچے گیہوں کے کھیت کاٹتی
 تو آنکھوں سے آنسوؤں کے دریا بہتے تھے،
 وہ رنج اور مایوسی میں اپنے آپ کو ہلاک کر دیتی
 اگر رنج کرنے کی اسے مہلت ملتی،
 لیکن زمانہ کھیتی کاٹنے کا تھا، جلدی جلدی کام کرنے کا۔
 بیسیوں کام ختم کرنے تھے..

لہٰذا یہاں اس کانٹوں کے تاج کی طرف اشارہ ہے جو انجیل کے مطابق یہودیوں نے صلیب
 پر چڑھانے سے پہلے حضرت عیسیٰ کے سر پر رکھا تھا۔

درانتی کے نیچے وہ گھانس کے ڈھیر لگا دیتی
اور گیہوں کے انبار،

صبح سویرے کے وقت اپنی پوری طاقت لگا کر
اناج کھندلتی،

شام کو دیر تک شبنم سے تر چراگا ہوں میں
کٹا ہوا سن پھیلاتی۔

سن پھیلاتی، اور ایک خیال
کبھی اس کا پچھانہ چھوڑتا،
”کیا کوئی دوسری موہنی

ٹوٹا کر کے اس کے سن کو بھارا ہی ہے؟

کیا وہ بیوفائی کر رہا ہے؟ پردیس میں

دوسری عورتوں کے پیچھے لگا ہے؟“

یہ سوچ کر بچاری کا دل ٹوٹ جاتا...

دراڑے تو مجھ سے شادی کر لے، مجھ سے،

میں تجھے یا تیرے باپ کو

کبھی خفا نہ ہونے دوں گی،

تیری ماں کی گالیاں

چپ چاپ سن لوں گی،

لہ لڑکی اپنے غائب دوست سے دل ہی دل میں خطاب کر رہی ہے۔

میں نہ شریف نہ آدمی ہوں نہ سوداگر کی بیٹی ،
میری طبیعت مسکین ہے ،

تیری بیوی بنی تو ہمیشہ ...

خاموش رہوں گی ، محنت کروں گی ،

تجھے کام کرنے کی زحمت نہ ہوگی ،

میرے ہاتھ پاؤں کا اور کوئی مصرف نہیں ،

میں اپنے پیارے کے لیے

خوشی سے کھیت بھی جوتا کروں گی ۔

تو اپنی محنتی بیوی کے بل پر

خوب مزے سے رہنا ،

بازاروں کی سیر کرنا ،

مست ہونا ، گیت گانا !

اگر تو اناج کا سوداگر کے مست واپس آئے ،

تو تجھے کھلا پلا کر بلنگ پر لٹا دوں گی ۔

”سو میرے پیارے ، سو میرے موہن !“

اس کے سوا اور کچھ نہ کہوں گی ،

قسم ہے خدا کی ذرا خفا نہ ہوں گی ۔۔۔

تیرے گھوڑے کو سواری کے لیے سنواروں گی ،

تیرے پیروں پر گر کر کہوں گی ۔۔

”میرے دوست، مجھے پیار کرتا جا!“

کولٹ سوئٹنی کی تن اور الک سے نئی تالستانی نے پڑانے اسالیب میں اس طرز کا اصفانہ کیا جو عوام میں قدیم زمانے سے رائج تھا، نگر اسوت نے مضامین میں بہت سے ایسے جذبات کو شعر کا لباس پہنایا جو عموماً شعرا کی توجہ سے محروم رہتے ہیں۔ لیکن ان کے ہم عصر اور شاعر بھی تھے جنہیں جدت کا شوق نہیں تھا اور وہ معاصر روسی زندگی اور تہذیبی مسائل سے اس قدر بیگانہ تھے کہ انہوں نے قدیم کلاسیکی اسالیب اور کلاسیکی مذاق کو اپنا رہبر بنایا اور مضامین میں بھی جدت پر اس وضع اور خیالات کے اس رنگ کو ترجیح دی جو کلاسیکی عہد کے آخری دور میں پایا جاتا ہے۔ ان شاعروں کا معیار یہ تھا کہ آرٹ کی غرض صرف آرٹ ہی اور اسے کسی خاص زمانے کے حالات اور سیاسی یا سماجی مسائل سے کوئی واسطہ نہیں ہونا چاہیے۔ لیکن ۱۹۱۶ء کے بعد چھپس تیس سال تک ادب پر نئے خیالات کے مبلغوں اور قوم کے مصلحوں کا راج رہا اور یہ شاعر جو خالص آرٹ کے شیدائی تھے روس کی ادبی دنیا سے خارج رہے اور ان کے کلام کو بہت کم قدر دان نصیب ہوئے۔ ان میں سے اکثر نے ۱۹۲۰ء سے اپنی نظموں کی اشاعت شروع کر دی تھی، لیکن ان کا دور دراصل ۱۹۲۵ء کے بعد سے شروع ہوتا ہے۔

چچوچف ان شاعروں کا سر تاج مانا جاتا ہے اور ان میں وہی ایک تھا جو مذاق کی قدامت پسندی کے باوجود اپنے کلام میں اپنی شخصیت کو ظاہر کر سکا اور اسے نقل یا تقلید کے الزام سے پاک رکھ سکا۔ مائی کوف، فینت اور

پولون سکی، جن کا اس فرقے میں اس کے بعد درجہ آتا ہے، بڑی حد تک
 فرانسیسی، ”پارناسیوں“ کے مقلد سمجھے جاتے ہیں اور اسی وجہ سے یہ
 سارا فرقہ ”پارناسی“ کہلاتا ہے۔

لہ پارناسس یونان کے ایک پہاڑ کا نام ہے۔ چونکہ یہ شاعر کلاسیکی اسالیب کے بہت
 قائل تھے اس لیے یہ اس نام سے منسوب کیے جاتے ہیں۔

پانچواں باب

پارناسی شاعر، استعاریت اور انقلاب

اپولون نکولائی پوچ مائی کوف (۱۸۲۱ - ۱۸۹۷)

پارناسی شاعروں کی طرح مائی کوف قومی زندگی سے اس قدر بے تعلق رہا کہ اس کی اپنی زندگی میں کوئی خاص واقعات نہیں ہیں جو بیان کے لائق ہوں اور اس کے ذاتی معاملات معلوم بھی بہت کم ہیں۔ اس کا ارادہ پہلے مصوٰ بننے کا تھا، لیکن شاعری کا ذوق اس ارادہ پر غالب آیا۔ اس نے چودہ سال کی عمر میں اپنی پہلی نظم شایع کی اور جس انداز سے اس کا ادبی دنیا میں استقبال کیا گیا وہ نو عمر شاعر کی ہمت افزائی کے لیے بہت کافی تھا۔ ۱۸۴۷ء سے اس نے اپنی زندگی شعر و شاعری کے لیے وقف کر دی۔

- مائی کوف کے کلام پر فرانسیسی شاعر آندرے شے ٹی اے اور کلاسیکی ۱۷ فرانسیسی انقلاب کے زمانے کا ایک شاعر، جس کی غزلیں اور مرثیے مشہور ہیں۔ زبان اور

بیان میں اس نے یونانیوں کی تقلید کی ہے (۱۷۶۴ - ۱۷۹۴)

یونانی شعرا کا گہرا اثر پایا جاتا ہے اور اس کے مضامین بھی عموماً خالص مدسی نہیں ہیں بلکہ یورپ کی تہذیب اور مذہبی تاریخ سے لیے گئے ہیں۔ مگر آرٹ کی پرستش اسے اپنے ملک کے حالات سے بالکل بیگانہ رکھ سکی اور اس کے کلام کا رنگ قوم کے عام خیالات کے ساتھ بدلتا رہا شروع میں وہ خالص "پارناسی" تھا جب ۱۸۵۵ء کے بعد ملک میں آزادی کا غوغا ہوا تو اس کی نظموں میں اس کا عکس نظر آنے لگا اور پھر جب ۱۸۶۷ء کے بعد برلن تحریک کچھ کمزور پڑ گئی تو وہ بھی اپنا دامن جھاڑ کر آرٹ کے حرم میں روپوش ہو گیا۔ اس آخری تغیر سے اس کی شہرت میں بہت فرق آگیا، ورنہ اس زمانے میں بھی جب دوسرے "پارناسی" شاعر قوم کی بے توجہی دیکھ کر بالکل خاموش ہو گئے تھے اس کا کلام شوق سے پڑھا جاتا تھا۔ اب اس کے قدر دان بہت کم ہیں۔

"تین موتیں" اور "دو دنیا" جن میں مائی کو ف نے یونانی اور عیسائی تہذیبوں کی جنگ دکھائی ہے اور یونانی تہذیب کو اس کے حریف سے بدرجہا بہتر ثابت کیا ہے مائی کو ف کا شاہکار مانی جاتی ہے۔ رومن کلیسا کی تاریخ پر بھی اس کی چند نظمیں ہیں جو روسی شاعری میں کچھ حیثیت رکھتے کا دعویٰ کر سکتی ہیں۔ لیکن مائی کو ف نے جب کبھی معاصر مدسی زندگی کو اپنا موضوع بنایا تو اسے بہت ناکامیابی ہوئی۔ تاریخی نظموں کے علاوہ جو کچھ ہیں وہ اس کی مختصر نظمیں ہیں۔ ان میں اس کے تخیل کا زور اور اس کی طبیعت کی رنگینی کچھ نظر آتی ہے اس کی زبان شیریں اور پرترنم ہے اور اس کی فصاحت کا معیار بہت بلند ہے۔ ذیل کی نظم میں اس کے کلام کا خاص رنگ کسی قدر ظاہر ہو چکا گا

میرا باغ روز بروز کھلا رہا ہے
 ویران، اجڑا ہوا اور خالی خالی نظر آتا ہے،
 میرا دل غمگین ہے۔

خزاں کے سورج کی چمک،
 درختوں کی جھڑتی ہوئی پتیاں، شام کے ٹڈوں کی آواز
 طبیعت میں اُکھن پیدا کرتی ہے،

جب حسب عادت میری نظر چھت پر پڑتی ہے
 تو کھڑکی کے اوپر ایک خالی گھونسلہ دکھائی دیتا ہے۔

اس میں ابا بیلوں کی سرگوشیاں نہیں سنائی دیتی ہیں،
 اس کی گھاس اور تنکے ہوا سے ٹک آتے ہیں۔

مگر مجھے یاد ہے کہ اسے بنانے میں

دو ابا بیلوں نے کیا کیا کوششیں صرف کیں،

”ٹنگوں کو مٹی سے کس طرح جوڑ کر مضبوط کیا،

ادھر اُدھر سے بال اوپر کیسے جمع کر کے لائیں۔

اپنا کام وہ کس خوشی سے کرتی تھیں، کس صفائی سے!

ان کے دل کیسے باغ باغ تھے جب گھونسلے سے

پانچ ننھے چمچل بچوں نے

سر نکال کر اُدھر اُدھر دیکھنا شروع کیا!

تمام دن ان کی چوں چوں جاری رہتی

جیسے ننھے بچوں کی بکواس۔

اور پھر ایک دن سب کی سب اڑ گئیں!

اس دن سے پھر میں نے انہیں بہت کم دیکھا،

ان کا گھونسلہ خالی پڑا ہے!

وہ اب کہیں اور اڑ گئی ہیں۔

کہیں اونز یہاں سے بہت دور۔

آہ کاش میرے بھی پر ہوتے!

افناسی افناس یوچ فیت (۱۸۲۰-۱۸۶۲)

اس اصول کا کہ ”آرٹ کی غرض آرٹ ہے“ فیت سے زیادہ قابل

پارٹنسیوں میں بھی کوئی نہیں تھا، اسے روس کے سیاسی اور اقتصادی مسائل

سے بہت دلچسپی تھی، اگرچہ وہ صرف قدامت پسند نہیں بلکہ جدتوں کا جانی دشمن

تھا اور اس نے ان مسائل پر متعدد مضامین لکھے۔ لیکن اس نے اپنی شاعری

میں آرٹ کی پرستش کے سوا اور کسی غرض کو شامل نہیں ہونے دیا۔ ۱۸۵۵ء

کے بعد نقادوں کی عداوت نے اس کے کلام کی اشاعت روک دی اور

فیت نے اس زمانے کی نظموں کا مجموعہ ۱۸۵۶ء تک نہیں شایع کیا۔ اس

وقت ادب پر سے مبلغوں اور مصلحوں کا اثر جاتا رہا تھا۔

فیت کے کلام کی خاص صفت اس کے احساسات کی نزاکت ہے اس

میں تخیل کی کوئی خوبی ندرت یا گہرائی نہیں، صرف الفاظ اور ترنم کی پیدا

کی ہوئی ایک کیفیت ہوتی ہے جو جذبات میں گدگدی سی پیدا کرتی ہے۔ مجموعی

حیثیت سے نیت کے کلام میں یکرنگی محسوس ہوتی ہے، اس لیے کہ نازک احساسات کے سوا اس نے انسانی جذبات کے کسی اور پہلو کو اپنی شاعرانہ توجہ کے لایق نہیں سمجھا۔ غزل کی نظم کا نیت کے مخالفوں نے بہت مذاق اڑایا تھا، اس لیے کہ اس میں اول سے آخر تک کوئی فعل نہیں ہے۔

زیر آواز دہی سانسیں :

بیل کے لہرے

دریا کی چاندی جیسی چمک،

اس کی جھومتی چال۔

رات کی دھیمی روشنی۔ دھندلی تاریکی کا سمندر۔

تاریکی کا بے پایاں سمندر

ایک محبوب چہرے کی بدلتی ہوئی کیفیتیں،

مسحور کن ادائیں

دھوئیں جیسے بادلوں میں کہیں ارغوانی رنگ

کہیں کہر باکی جھلک

پیار، پیار اور آنسو۔

اور آفتاب کا طلوع! ...

- اسی انداز کی ایک اور نظم ملاحظہ ہو :

میں تجھے مبارکباد دینے آیا ہوں۔

یہ کہنے کہ سورج نکل آیا ہے۔

اور اس کی گرم، روشن کرنیں

پتیوں پر کانپ رہی ہیں -

یہ کہنے کہ جنگل جاگ اٹھا ہے،

سارے کا سارا جاگ اٹھا ہے، اس کی ہر شاخ،

ہر چڑیا چونک پڑی ہے،

اور وہ بہار کی آرزوؤں سے بھرا ہے

یہ کہنے کہ کل کی سی امیدیں اور جوش لے کر

میں پھرتے پاس آیا ہوں،

میرا دل اسی طرح مسرت کا

اور تیری خدمت کرنے کا آرزو مند ہے۔

یہ کہنے کہ ہر طرف سے میرے پاس

شادمانی کا پیغام آرہا ہے،

یہ کہنے کہ میرا دل نغمہ سرائی پر ٹلا ہوا ہے

مگر معلوم نہیں میں گاؤں گا یا نہیں...

یا کون پترو وچ پولون سکی (۱۹۱۹ء - ۱۹۲۰ء)

فیت اور مائی کون کے مقابلہ میں پولون سکی کے مضامین کا میدان بہت

وسیع ہے اور اس کا تخیل عام زندگی سے بہت زیادہ وابستہ ہے، اس کے احساسات میں

اتنی نزاکت نہیں کہ وہ معمولی انسان کی عقل اور سمجھ کو عاجز کر دیں۔ اس نے

عوام کے طرز پر چند نظمیں لکھی ہیں جو ادبی نقطہ نظر سے قابل قدر تو نہیں ہیں

مگر ان میں کچھ ایسی سادگی ہو اور ان کی زبان اتنی سہل کہ وہ ایک زمانہ میں بچے بچے کو یاد ہو کر تھی تھیں اس کے کلام میں ظرافت بھی پائی جاتی ہے اور سادگی ہی ایک فلسفہ حیات جو بہت گہرا نہیں ہے مگر اوسط درجے کے تعلیم یافتہ لوگ اس سے نہایت درجہ مرعوب ہوتے ہیں۔ پولونسکی روس کی سیاسی فرقہ بندیوں سے ہمیشہ الگ رہا اس لیے اسے نقادوں کی عداوت کا سامنا نہیں کرنا پڑا اور اس کے کلام کی اشاعت میں کوئی دشواری یا رکاوٹ نہیں ہوئی، مگر اعلیٰ ادبی مذاق کے لوگوں میں اسے بہت کم قدر دان سمجھے ہیں۔ اُسے وہی لوگ پسند کرتے ہیں جن کی علمی بساط کم ہے اور جو شاعری کے ذریعہ سے اپنے جذبات اور خیالات میں ذرا سا ہیجان یا ہلکا سا سرور پیدا کرنا چاہتے ہیں پولونسکی کی سب سے مشہور نظم ”موسیقی کے شوقین ٹڈے“ کا قصہ ہے جو کسی بلبل کا گانا سن کر اس پر عاشق ہو گیا اور ملاقات کے شوق میں اُس کا دل تڑپنے لگا۔ بڑی تمناؤں کے بعد آخر کار اُسے دیدار کا شرف حاصل ہوا لیکن بلبل اُسے دیکھتے ہی کھا گیا۔ اس نظم کے علامہ پولونسکی نے ”پارناسی“ طرز کے مطابق مختصر نظمیوں بھی لکھی ہیں جن میں سے بعض بعض ہر لحاظ سے بہت اچھی ہیں، مگر یہ اعلیٰ نمونے اس کے کلام میں صرف گاہے گاہے نظر آتے ہیں۔ اس کی بہترین نظموں میں سے ایک کا ترجمہ دیا جاتا ہے۔

گزر رہا ہوا زمانہ

مجھے یاد ہیں وہ بچپن کے دن، جب ہمارے گالوں پر پھول کی سی سرخی تھی،
ہم تم بھر بھرے برف پر کھیلتے پھرتے تھے۔

اور سردی ایک بوڑھی عورت کی طرح اپنے ہاتھوں سے
 ہمیں پیار کرتی اور پھر اپنی بیباکھی سے آگ کے پاس بھگا دیتی،
 شام کے اندھیرے میں تمھاری آنکھیں چمکتی تھیں،
 آتش دان کی چنگاری تمھاری صورت دیکھا کرتی تھی،
 اور بوڑھی کھلائی ہمیں کہانیاں سناتی تھی،
 ایک بے وقوف کی جو کسی زمانہ میں تھا۔
 لیکن وہ جاڑا بہار کی طرح مسکراتا ہوا چل دیا،
 گرمیاں بھی گزر گئیں اور اب خزاں کے طوفان کا شور سن کر
 ایک اور جاڑا آ رہا ہے، بالکل دوسری طرح کا،
 ایک بے حس جاڑا اور وہ بھی اپنی بیباکھی سے ڈرا رہا ہے...
 ہماری کھلائی پیر پھیلائے سو رہی ہے
 قبر میں آرام کر رہی ہے اور یہ بھی نہیں دیکھتی
 کہ تم تھک کر میرے سینے سے چمٹ گئی ہو،
 گویا سن رہی ہو کہ میرا دل کیا کہتا ہے۔
 لیکن کھلائی کی طرح میرا دل بھی آج پیار سے
 متاثر نہیں ہوتا، وہ چنگاری بجھ گئی ہے،
 اور میرا دل تمہیں کہانیاں سناتا رہا ہے،
 ایک بے وقوف کی جو کسی زمانہ میں تھا۔

۱۸۵۵ء سے ۱۸۶۳ء کے سیاسی جوش کے رفتہ رفتہ ٹھنڈے ہونے کے ساتھ ہی روسی شاعری کا معیار گرتا گیا، اس میں نہ فن کی وہ خوبیاں رہیں نہ تخیل کی وہ بلند پروازیاں جو لنتکن، لیرمنتوف اور چوچیف کے کلام میں پائی جاتی ہیں۔ نکر اسوف نے مضامین میں بہت جدت پیدا کی اور اگر اسے اچھے پیرو ملتے تو ممکن ہے روسی شاعری کا باغ پھر سرسبز اور شاڈا ہو جاتا اور اس میں نئے نئے پھول کھلتے۔ لیکن افسوس ہے ایسا نہ ہوا اور جب تک کہ صدی کے آخری سالوں میں استعاریت نے نئے باغبان نہیں پیدا کیے روسی شاعری کا باغ ویران ہوتا گیا۔ سیم یون یا کوف لے وچ نادسون (۱۸۶۲ء - ۱۸۸۶ء)، الک سے ئی نکولایے وچ اپوخ تن (۱۸۸۶ء - ۱۸۹۳ء) گونس تان تن کونس تان تی نوپچ سلوچیف سکی (۱۸۳۲ء - ۱۸۹۲ء) اور دلاجیر سرگے یوچ سولوف یوف (۱۸۵۲ء - ۱۸۹۶ء) کی شاعری میں اس دور کے تمام ذہنی اور فنی نقائص نظر آتے ہیں۔ نادسون نے بہت شہرت حاصل کی اور غالباً اس کے کلام سے زیادہ اشاعت اور ہر و لغزیری اس دور کے کسی شاعر کو نصیب نہیں ہوئی، لیکن نقاد اسکی مقبولیت کو محض عام مذاق کی سستی کی ایک علامت مانتے ہیں اور اگر غور سے دیکھا جائے تو نادسون کی شاعری میں لغظی کے سوا کچھ نہیں اور اس کے خیالات بھی جو کچھ ہیں وہ ذہن اور تصور کی بیماری کی دلیل ہیں۔ اپوخ تن کے کلام میں پھر بھی زیادہ جان ہے، لیکن اس میں ایک دوسرے طریقے پر ظاہر ہوتا ہے کہ روسی قوم میں انحطاط کی کیفیت تھی۔ اپوخ تن کی نظیں روس کے

رجسٹری گوتیوں کی زبانی بہت سننے میں آتی ہیں اور ان رجسٹری گوتیوں کا کام عموماً
 میخانوں میں لوگوں کو مست کرنا اور عیاشی میں چٹپٹا پن پیدا کرنا تھا۔ سلوچیف
 سکی اور سولوف یوف پر اس قسم کا کوئی الزام نہیں لگایا جاسکتا، لیکن ان
 دونوں میں فنی خامیاں بہت ہیں اور تخیل کی کوئی خاص خوبی نہیں پائی جاتی۔
 ان چاروں شاعروں کی یادگاروں کی وجہ سے قائم ہے کہ ان کے دور میں
 ان سے بہتر کوئی اور شاعر نہیں تھا، یہ "کلاسیکی" اور "استغاری" دوروں
 کی درمیانی کڑی ہے۔

استغاریت اس عام ذہنی سبجان کا ایک پہلو اور اس کی ایک پیداوار
 تھی جو انیسویں صدی کے آخر میں نظر آتا ہے اور جس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی
 کہ مہذب اور منظم ہونے کے باوجود روسی قوم اپنی سیاسی اور سماجی زندگی
 میں جان نہیں بھونک سکی تھی۔ ہر طرف خانہ ساز خیالات کا غوغا تھا، ہر
 روشن خیال آدمی اپنا فلسفہ حیات بناتا، قومی اصلاح اور نئی زندگی کی تعمیر
 کی تدبیریں سوچتا، کلیسا، مذہب، حضرت عیسیٰ کی شخصیت، ریاست پرستی
 زار پرستی، قوم پرستی، یورپ پرستی ان سب کے معتقد اور مبلغ تھے، مگر سب
 یکساں ناکامیاب رہے اور وہم و گمان کے جال میں گرفتار ہو گئے۔ نکر اسون
 کے بعد سے ۱۹۰۵ء کے انقلاب تک شاعری کا عام سیاسی اور سماجی زندگی
 سے بس اتنا تعلق تھا کہ بعض نادسون جیسے شاعروں نے قومی خدمت کی
 امنگوں کو نظم کا جامہ پہنایا، لیکن یہ زمانہ ایسے انحطاط کا تھا کہ ان شاعروں
 کے کلام میں نہ سلاف دوستی کے اعلیٰ جذبے نظر آتے ہیں، نہ قومیت کے بلند

دلوے۔ استعاریت کی تحریک روسی شاعری کو نئے اسالیب کے ذریعہ سے دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش تھی، اس کا سلسلہ نسب فرانسیسی شاعری کی ہم نام تحریک سے ملتا ہے، لیکن روسی استعاریت پسند شاعروں نے اپنے استادوں کی زیادہ پیروی نہیں کی اور دراصل ان سے سیکھا بھی بہت کم۔ امریکن شاعر ایڈگر ایلن پو (۱۸۰۹-۱۸۸۹) اور جرمن فلسفی اور شاعر گوٹے کاؤن پر فرانسیسی استعاریت پسند شاعروں سے بہت زیادہ اثر تھا۔

فرانسیسی شاعر بو دیلیر (۱۸۲۱-۱۸۶۷) کا ایک مصرعہ جس میں کائنات "استعاروں کا ایک جنگل" بتائی گئی ہے اور جرمن شاعر گوٹے کا ایک شعر کہ "سب فانی چیزیں محض مجازی نقوش ہیں" استعاریت کے فلسفے کی بنیاد ہیں۔ استعارے اور مجازی نقوش جس حقیقت پر پردہ ڈالتے ہیں اس کی جستجو اور اس کے دیدار کا اشتیاق روسی استعاریت پسند شاعروں کا محرک ان کا "جنون" اور "سودا" تھا۔ انھوں نے اپنے فرانسیسی استادوں کی طرح اسے صرف ایک شاعرانہ انداز اور نظم میں جدت اور انوکھا پن پیدا کرنے کا ایک بہانہ نہیں بنایا بلکہ اسے ایک مکمل فلسفہ حیات کی صورت دیدی اور اس سے وہ روحانی غذا حاصل کرنے لگے جو ان کا مذہب اور کلیسا فراہم کرنے سے معذور تھائیوں کو استعاریت شروع میں ایک مغربی چیز تھی اور مغربی رنگ میں ڈوبی ہوئی تھی روس میں اس نے بہت جلد روسی بھیس اختیار کر لیا، اپنا نسب بھول گئی اور روس کے گزشتہ ذہنی رہبروں خصوصاً دستہ نفا سکی سے بہت گہرا رشتہ قائم کر لیا۔ اس رشتے کے قائم ہونے سے

روسی ادب کو سراسر فائدہ ہوا، انحطاط کے زمانہ میں روس کے ادبی متاہیر کی طرف سے جو غفلت برتی جاتی تھی اس کے بجائے انھیں سمجھنے کا ایک نیا شوق پیدا ہو گیا، ان کے فلسفہ پر غور کرنے کی ضرورت محسوس ہونے لگی اور جیسے کوئی گہری منید سے چونک کر سونے سے پہلے کے واقعات یاد کرتا ہے اور انھیں اپنی زندگی کا ایک ضروری حصہ سمجھنے لگتا ہے، انحطاط کے بعد استعاریت پسندی کے ذریعہ سے روسی ذہن نے بیدار ہو کر اپنی ذہنی جدوجہد کے ٹوٹے ہوئے سلسلہ کو پھر جوڑ دیا وہ اپنی ذہنی دولت کو یوں بہت بڑھا دیا۔ اس کی سب سے روشن دلیل یہ ہے کہ روس کے استعاریت پسند شاعر آزاد خیال، بلند حوصلہ اپنے دلیں اور اپنی قوم کے پتے اور گہرے دوست اور خیر خواہ تھے۔ یہاں تک کہ ان میں سے کوئی شریک نہیں ہوا، لیکن ۵-۱۹ کے انقلاب میں انھوں نے دکھا دیا کہ وہ جاہلانہ حکومت کے دشمن اور ہر تحریک کے حامی ہیں جس کا مقصد روس کی آزادی اور یہودی ہو۔

استعاریت پسند شاعروں کے کلام کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے جمالیات پر تصوف اور فلسفے کا رنگ چڑھانا چاہا اور اپنے جذبات کو نفسانیت اور مجاز پرستی سے بڑھی حد تک پاک رکھا۔ عشق کو وہ ایک خالص روحانی کیفیت کی صورت میں پیش کرتے ہیں، جس کی پاکی اور صفائی پر انسان کے سرکش، نفس پرست جذبات دھتے لگاتے رہتے ہیں، جن ان کی نظروں میں ایک جلوہ ہے جس کے دیدار سے انسان محروم رہتا ہے، کیونکہ وہ ہوس اور شہوت کا بندہ ہے۔ لیکن یہ شاعر مذہبیت کے یا تو قائل نہیں یا اس کے

نا آشنا ہیں اور ان کی روحانیت کو تصوف کا ہم معنی نہ سمجھنا چاہیے۔ کائنات
 دنیا اور دنیاوی زندگی استعارے ہیں، حقیقت نہیں، استعاروں کے
 جنگل میں، بھٹکتے پھرنا انسان کے شایان شان نہیں، بس اسی کو جتا کر
 استعاریت کا فلسفہ ختم ہو جاتا ہے۔ باقی جو کچھ ہے وہ انسان کی گمراہی پر فوس
 تمناؤں کی میکی کا گلہ ہے اور سرد آہیں اور آنسو۔ نادسون اور اپو رخ تن کے
 بعد شعر و شاعری کا ایسا موضوع اختیار کرنا بہت قابل قدر جدت تھی اور اس
 کے ساتھ ہی استعاریت پسند شاعروں نے اپنے کلام کو فنی حیثیت سے بھی اس
 درجہ کمال تک پہنچایا جو لشکن کے عہد کے سواروسی شاعری کو کبھی نہیں نصیب
 ہوا تھا۔ یہ خاص طور سے تعریف کی بات ہے، کیونکہ ان شاعروں نے نئے مضامین
 نئے طرز پر ادا کئے، اور ایسے ادبی انقلابوں کے ہر اولوں میں عموماً فنی خابیا
 اس کثرت سے ہوتی ہیں کہ اہل ذوق کو ان کی جدتیں تسلیم کرنے میں بہت
 تامل ہوتا ہے۔

استعاریت پسند شاعروں کی تیسری خصوصیت ان کی زبان اور الفاظ
 کا انوکھا استعمال ہے۔ وہ زبان کو محض خیالات ادا کرنے کا آلہ نہیں سمجھتے
 بلکہ کیفیات اور فصنا پیدا کرنے کا ذریعہ بھی اور یوں وہ الفاظ کے معنی سے
 زیادہ ان کی آواز کی تاثیر کو توجہ کے لاین فرصن کرتے ہیں بحر اور قافیہ اور الفاظ
 کے آرکان کی اوپنچ نیچ سے وہی کام نکالنا چاہتے ہیں جو گویے سروں سے۔
 زبان اور الفاظ بھی ان کے نزدیک استعارے ہیں جن کے توسط سے
 جذبات کی حقیقت ظاہر ہوتی ہے اور چونکہ جذبات کا تعلق صرف انسان کے

ذہن سے نہیں بلکہ اس کی ہستی سے ہی، اس لیے وہ جذبات کے ادا کرنے میں شاعر کے لیے ایسا طرز اختیار کرنا لازم قرار دیتے ہیں جس میں تصویروں کے رنگ ہوں اور موسیقی کے سُور اور ناچ کے بھاؤ۔ ظاہر ہی یہ معیار کس قدر بلند اور مشکل ہے اور کوئی تعجب نہیں استعاریت پسند شاعروں کے کلام کا اکثر حصہ اس معیار پر پورا نہیں اُترتا، کبھی آواز کی تاثیر پیدا کرنے کی کوشش میں معنی خبط ہو جاتے ہیں کبھی کیفیت اور فضا کے چکر میں شاعر اپنے مطلب اور مقصد کو بھول جاتا ہے۔ پڑھنے والے کو بھی اپنا فرض ادا کرنے میں بہت دشواریاں ہوتی ہیں اور اگر استعاریت کے قدر دانوں میں ہلکے سرور اور ذرا ذرا سی گدگد می کا خاص شوق نہ ہوتا، اگر وہ نظم میں معنی اور مطلب اور فلسفے کی جگہ آوازوں کی خوش گو اور گونج اور اس کیفیت کے جو موسیقی کے سُوروں سے چھا جاتی ہے خواہش مند نہ ہوتے، تو ممکن ہے استعاریت ہر لغزیز اور شہرت سے محروم رہتی۔ لیکن استعاریت پسند شاعروں کے ہنران کے عیبوں کو نظر سے چھپا دیتے ہیں۔ ان کے کلام کے اعلیٰ نمونوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا تخیل صرف بلند اور پاک نہیں، وہ اپنی زبان کے سب جوہر پہچانتے ہیں، اس کے ہر رنگ سے واقف ہیں اور اس پر اتنی قدرت رکھتے ہیں کہ نازک سے نازک احساس اور نادر سے نادر کیفیت انتہائی سہولت اور صفائی سے بیان کر سکیں، الفاظ کی جاچ پر تال اور انتخاب میں وہ ویسے ہی ماہر ہیں جیسے موزوں شرابوں کا مزہ پہچانتے، یا جوہری نگینوں کے پرکھنے، یا سچا گویا اپنے راگ کو اور گیت کو خارجی فضا سے موزوں کرنے

میں۔ اپنے علم و ہنر کا کمال دکھانا بھی انہیں خوب آتا ہے۔

استعاریت کا پیش خیمہ دلاجمیر سولوفیون اور دمیتری برژدکوف سکی کا کلام تھا، لیکن اپنی اصل صورت میں وہ اس مجموعے میں نظر آئی جو ۱۹۱۲ء میں بال مونت (پیدائش ۱۸۶۷ء) اور بریوسوف (۱۸۶۳ء - ۱۹۲۲ء) نے "روسی استعاریت پسند" کے عنوان سے شایع کیا۔ اسی کے ساتھ ہی بال مونت نے اپنے کلام کا ایک مجموعہ بھی ناظرین کے سامنے پیش کیا۔ روسی نقاد ان جڑتوں کو تسلیم کرنے پر نہیں تیار تھے جو ان نظموں میں اختیار کی گئی تھیں اور استعاریت پسندوں پر اعتراضوں اور تضحیک کی پوچھا رہنے لگی۔ مگر وہ ہمت نہیں ہارے اور بیسویں صدی کے شروع تک وہ روسی مذاق پر حاوی ہو چکے تھے۔ ۱۹۱۵ء کے انقلاب نے انہیں ہر طبقے میں ہر لغزیر بنا دیا اور اس کے بعد سے دس سال تک میدان سخن میں انہیں کاراج رہا۔ ان میں سے اکثر کو ۱۹۱۷ء کے انقلاب کا منظر دیکھنا بھی نصیب ہوا اور جس صدق دل اور خلوص اور جوش سے انہوں نے اُس نئی زندگی کا استقبال کیا جس کی امید انہیں انقلاب کے بھونچال اور زلزلے دلا رہے تھے، وہ ان کی بیدار دلی، قوم پرستی اور قوم کے مستقبل میں شاعرانہ عقیدیت کو بہت سبق آموز بنا دیتی ہے اور ان کے کلام کی وقعت ہماری نظروں میں اور بھی بڑھا دیتی ہے۔

بال مونت اور بریوسوف کے کلام پر مغربی، یعنی فرانسیسی اور انگریزی اثرات غالب ہیں اور ان کی زبان میں نہ وہ فصاحت ہے اور نہ وہ ترنم جو

استعاریت پسند شاعروں کا معیار تھا۔ بال مونت فطرتاً شاعر تھا، مگر اس نے زبان کی طرف کوئی توجہ نہیں کی، بریوسوف نے محنت اور مشق سے زبان میں پختگی اور لوح پیدا کر لی لیکن اس کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا ذہن اور تخیل ایک سچے اور اعلیٰ شاعر کا نہیں تھا۔ بال مونت کے عروج کا زمانہ انیسویں صدی کے آخری سال تھے اور گو اس کے بعد بھی وہ ہر سال اپنی نظموں کے مجموعے شائع کرتا رہا، اس کا بعد کا کلام بالکل بے رس ہے۔ ۱۹۱۷ء میں اس نے پولشوک انقلاب کو تسلیم کرنے سے انکار کیا اور فرانس میں جا بسا۔ بریوسوف کو شہرت ۱۹۰۵ء کے انقلاب میں حاصل ہوئی، جب اس نے اپنی نظموں کا ایک مجموعہ جس کا عنوان ”سے فانوس“ تھا شائع کیا، اسے سیاسی معاملات سے کوئی گہری دلچسپی نہیں تھی، صرف اس کا شاعرانہ خیال تھا کہ

در مرکز حسن ہے مشرقی بادشاہ اسار ہرون کی قوت اور شان کا
جلوہ رعب دار ہے وہ منظر جب ایک بھری قوم کا غصہ بادشاہ
کے لڑکھڑاتے تخت پر طوفانی موجوں کی طرح تھپیڑیں مارتا
ہو، مگر قابل نفرت ہیں درمیانی کیفیتیں۔“

طوفان کے شوق نے بریوسوف کو ۱۹۱۷ء کے انقلاب کا بھی ہمدرد بنا دیا، لیکن اس کے کلام سے یہ نہیں ظاہر ہوتا کہ اسے روس یا اشتالیٹ سے واقعی کوئی روحانی تعلق تھا۔ آخر عمر میں اس کی سب سے قابل قدر خدمت تھی ”مزدور“ شاعروں کو اپنے فن میں تعلیم دینا، جس کا وہ شعر

کہنے سے زیادہ اہل تھا۔

بال مونت کی ایک نظم جس کا موضوع ڈاکٹر اقبال کی ”تنہا می“ سے
بہت متاثر تھا، ترجمہ کی جاتی ہے:

میں نے آزاد ہوا سے پوچھا:

کہ جوانی کا راز کیا ہے؟

ہوانے کھلتے کھلتے جواب دیا:

”قید صورت سے نجات حاصل کرنا، جیسے ہوا اور دھواں“

میں نے صاحبِ حمیت سمندر سے پوچھا

کہ زندگی کا سب سے اعلیٰ مقصد کیا ہے؟

سمندر نے اپنے راگوں میں جواب دیا:

”ہمیشہ میری طرح محو فریاد رہنا!“

میں نے آسمان کے بادشاہ، آفتاب سے پوچھا

کہ وہ چمک کیسے حاصل ہوگی جو صبح کو شرمندہ کرے؟

آفتاب نے کوئی جواب نہیں دیا،

مگر میرے دل میں کہیں سے آواز آئی، ”جلنے سے!“

بال مونت اور بریوسوف ہراول تھے، جو استعاریت پسندانہ شاعروں کے

بعد میدان میں آئے انھوں نے استعارہ شاعری سے بڑی حد تک وہ

فنی خامیاں دور کر دیں جو ان دونوں کے کلام میں پائی جاتی ہیں، استعارہ

کو مغرب کی رہنمائی سے بے نیاز کر کے اسے ایک خالص روسی تحریک

بنادیا، الفاظ اور طرز بیان خود ایک معیار ہونے کے بجائے شاعر کے فلسفہ حیات اور نظم کے موضوع کے ماتحت کر دیے گئے، گو ان کی استعارہی مہبت صرف قائم نہیں رہی بلکہ اور بڑھ گئی۔ اداں کوئی سکوی (۱۹۴۷ء) ایک بہت ہو بہا شاعر جو عین جوانی میں ڈوب کر مر گیا، الگ سا مذہب جانا لو وچ دو بر و لیو پوت (پیدائش ۱۹۴۷ء) ایک بہت ہی سنگی اور مرافی آدمی ہے اور لاپتہ پھرا کرتا ہے اور اب معلوم نہیں زندہ ہے یا نہیں اور ہے تو کہاں ہے۔ مرث کوئی سنگی کی بیوی، زنی دانگولا لٹنا ہے بس (پیدائش ۱۹۴۷ء) یہ تینوں استعارت پسندوں میں فلسفیانہ طرز کے شاعر مانے جاتے ہیں اور ان کے کلام میں کائنات اور انسانی زندگی کے معمے حل کرنے کی ایک بہت گرم آواز پائی جاتی ہے۔ انوکھتی فیوڈور وچ آسن سکی (۱۹۵۶ء - ۱۹۶۹ء) کے کلام میں استعارت کا اندازہ خالص شاعرانہ ہے، لیکن پس منظر میں وہی مسائل ہیں جن پر فلسفیانہ رجحان کے استعارت پسند محور ہتے ہیں۔ ناول نویس فیوڈور سولوگب (پیدائش ۱۹۴۷ء) نے اپنا ایک جمالیات اور اخلاق کا انوکھا فلسفہ گھڑا ہے، لیکن ذیل کی نظم سے معلوم ہوتا ہے کہ اس فلسفہ میں بھی وہ گہرے خیالات رکھتا ہے اور انھیں ادا بھی خوب کرتا ہے:

اس سے محبت کیوں کر، دنیا تری محبت کی

سزاوار نہیں۔

اس کے اوپر سے گزر جا، شہاب ثاقب کی طرح

تیزی سے۔

اس کی سر دفنا میں ایک لمحہ کے لیے
چمک اٹھ۔

ایک دم بھرا ایمان و عقیدت کی مشعل بن،
اور گل ہو جا۔

دیباچہ لاف اور انوف (پیدائش شروع) اور الگ سا نذر بلوک (۱۸۸۸ء
۱۹۲۱ء) استعاریت پسند شاعروں کے سر تاج مانے جاتے ہیں اور انہیں
کے کلام میں استعاریت اپنی پوری شان میں نظر آتی ہے۔ ادانوف پیتربرگ کے
حلقے بلوک ماسکو کے گردہ کا سردار تھا، اور دونوں اپنے طرز میں یکتا ہیں۔
ادانوف نے ۱۹۰۳ء میں اپنی نظموں کا پہلا مجموعہ شایع کیا۔ گو اس کا
کلام استعاریت پسندوں کے عام طرز سے بہت مختلف تھا، لیکن ان لوگوں
نے اس کی شاعری کی عظمت اور اس میں استعاریت کا خاص رنگ محسوس
کیا اور ادانوف کو اپنے حلقے میں شامل کر لیا۔ ادانوف کی شخصیت ایسی
قوی تھی، اس کے علم کا سرمایہ ایسا زبردست کہ وہ بہت جلد سب پر حاوی
ہو گیا اور ۱۹۰۵ء سے ۱۹۱۱ء تک پیتربرگ کے شاعروں کا بے تاج کا
بادشاہ رہا۔ اس کا مکان شاعروں کا مرجع تھا اور ہر بدھ کی رات کو وہاں
مجلسیں ہوا کرتی تھیں جن میں لوگ دوسرے دن صبح تک نظمیں سنتے اور
سناتے، یا مذہب اور تصوف کے مسائل پر بحث مباحثہ کیا کرتے تھے۔
۱۹۱۲ء میں کسی وجہ سے ان دوستوں میں جو یہاں جمع ہوا کرتے تھے،
پھوٹے پڑ گئی، ادانوف روس چھوڑ کر یورپ چلا گیا اور جب واپس ہوا

تو پتیر برگ کے بجائے ماسکو میں سکونت اختیار کی۔ پولشویک انقلاب کے وقت اس نے وہ جوش نہیں دکھایا جو ۱۹۱۵ء کے انقلاب میں، مگر پھر بھی وہ پولشویکوں کا حامی تھا اور اس نے خانہ جنگی کے زمانے کی (۱۹۱۵ء تا ۱۹۲۱ء) ساری مصیبتیں خاموشی سے برداشت کیں۔ ۱۹۲۱ء میں وہ آزر بائجان کے نئے قائم کردہ دارالعلوم میں قدیم یونانی زبان اور ادب کا پروفیسر مقرر ہوا اور وہاں تین سال کام کیا، ماسکو واپس ہونے پر بھی اس کے تعلقات پولشویک حکام سے بہت اچھے رہے۔

ادانوف نے ”دل سوزان“ کے عنوان سے اپنی نظموں کا دوسرا مجموعہ ۱۹۱۱ء میں شایع کیا اور یہ اس کے کلام کا عروج تھا۔ جاڑے کے گیت“ جو اس نے ۱۹۲۱ء میں شایع کیے، صرف اس کے ادبی ذوق کی شدت نہیں دکھاتے، بلکہ اس کے کلام کا ایک دوسرا رنگ بھی جو چند لحاظ سے ”دل سوزان“ کے جواہر ریزوں سے بھی بہتر ہے۔ اسی سال کا ایک اور کارنامہ ”دو گوشوں کے درمیان خط و کتابت“ ہے جس میں ادانوف اور اس کے دوست گرشن زون کی اس زمانے کی گفتگو ہے جب دونوں ہسپتال میں بیمار پڑے تھے، یہ مکرمے کے ایک گوشے میں، وہ دوسرے میں گرشن زون کی آرزو ہے کہ دنیا سے گزشتہ زندگی کے تمام آثار مٹ جائیں اور ایک نیا انسان ”ننگا“ آزاد، زندگی کی تعمیر نئے سرے سے شروع کرے۔ ادانوف انسان کی حاصل کردہ تہذیبی اور اخلاقی دولت کو محفوظ رکھنے کا قائل ہے اور انسان کی گزشتہ ذہنی جدوجہد کی بہت محبت، عقیدت

اور جوش سے حمایت کرتا ہے! ایسی صورت میں جب دن کو بھوک ستاتی ہو
 اور رات کو جاڑا، نظمیں لکھنا اور تمدن اور تہذیب کے گن گانا انتہائی
 شوق اور محویت کی دلیل ہے اور اوانوف کے لیے یہ اسی وجہ سے ممکن ہوا
 کہ وہ ساری عمر علم اور ادب میں ڈوبا رہے۔ اسے قدیم یونانی ادب سے
 بہت گہرا روحانی تعلق تھا اور اس نے جدید روسی ذہنیت پر قدیم
 یونانی فلسفے اور احساسات کی قلم جس صفائی اور کامیابی سے لگائی وہ
 واقعی حیرت انگیز ہے۔ اپنی نظموں میں اس نے اکثر یونانی محاورے استعمال
 کر کے ایک عجیب شوکت پیدا کر دی، اپنی مذہبیت کے مایوس چہرے میں
 قدیم یونانی رند مشربی کے پریشان بال اس طرح کھپائے کہ ایک ہی صورت
 معلوم ہوتی ہے، اور وہ بھی حسن اور ادا کا کرشمہ۔ اس کی نظمیں بہت مشکل
 ہیں، اس کے خیالات کی باریکیاں پورے طور سے سمجھنے کے لیے یونانی اور
 روسی ادب اور مذہب اور فلسفہ حیات سے گہری واقفیت درکار ہے،
 لیکن جو یہ استعداد نہیں رکھتے وہ اس کی زبان کے ترنم اور شیرینی کی
 لذت اٹھا سکتے ہیں اور اس کی ان کیفیتوں سے جن میں علمی اور تہذیبی
 نکتہ سنجی نہیں اور جو دراصل اس کے کلام کا بہترین حصہ ہیں اس شراب کا
 مزہ چکھ سکتے ہیں جس کے نشے میں شاعر خود چور رہتا تھا۔ اوانوف کا کلام
 کچھ اس وجہ سے بھی مشکل معلوم ہوتا ہے کہ اس میں معاصر روسی ذہنیت کا
 تقاضا کہ ہر شاعر اور ادیب کا اپنا فلسفہ بھی ہونا چاہیے پورا کیا گیا ہے اور
 چونکہ شاعر کی طبیعت وہ پابندیاں نہیں منظور کر سکتی جو کسی خاص نظام فلسفہ

یا مذہبی عقیدے کے مبلغوں پر لازم ہے، اس لیے اس کوشش سے اس کے کلام میں خواہ مخواہ الجھاؤ اور سچیدگی پیدا ہو جاتی ہے۔

ادانوف نے سن ۱۹۵۷ء کے انقلاب میں دستہ نعت سکی کے مشہور کیرکٹر اوان کرمازوف کے طرز پر انکار اور بغاوت کا فلسفہ اختیار کیا اور اس کی تعلیم دی کہ انسان کو تمام خارجی پابندیوں اور رکاوٹوں سے آزاد کرنا چاہیے۔ اس تصور کا نام اس نے "فلسفیانہ نراج" رکھا تھا، انقلاب کی تحریک دب جانے کے بعد "فلسفیانہ نراج" سے ادانوف کو زیادہ عقیدت نہیں رہی اور پیتربرگ کے استعاریت پسندوں کی رہبری کے زمانے میں اس نے ایک نیا فلسفہ اس بنا پر تعمیر کیا کہ آرٹ بھی ایک قسم کا مذہب اور تصوف ہی اور اس کا معیار مذہبی اور فلسفیانہ ہونا چاہیے۔ لیکن اس حالت میں جب کہ مذہب اور تصوف خود تعریف اور تعین کے محتاج ہوں اس قسم کے عقیدے بالکل بے معنی ہیں اور یہ نہ ادانوف کے ذہن میں کوئی مستقل صورت اختیار کر سکے نہ اس کے چیلوں کے ذہن میں۔ ادانوف کے کلام میں جو شخصیت ظاہر ہوتی ہے وہ آزاد ہے، نکتہ چیں ہے، کبھی کبھی شاکہ بھی ہو جاتی ہے، اپنے احساسات اس متانت اور شوکت سے ادا کرتی ہے کہ معلوم ہوتا ہے اسے مذہب اور تصوف کی سرپرستی بالکل درکار نہیں اور اس کے نغموں میں ایک سرور ہے جس کی تاثیر میں عقیدے کی موافقت و مخالفت سے کوئی فرق نہیں پڑ سکتا۔

ادانوف کی نظموں کا ترجمہ کرنا دراصل ان کی توہین کرنا ہے کیونکہ

زبان کا ترنم اور الفاظ کے انتخاب کی باریکیاں جو اس کی نظموں کا خاص
زیور ہیں ترجمے میں کسی طرح ظاہر نہیں ہو سکتیں اور اس کے خیالات اگر
ان خاص الفاظ سے الگ کر دیے جائیں جن سے آراستہ کر کے ادا نون نے نہیں
پیش کیا ہے تو ان کی صورت بگڑ جاتی ہے۔ تاہم ایک دو نظموں کا ترجمہ
دیا جاتا ہے۔

یونانی عشق کے دیوتا ایروس کی شان میں ایک گیت ہے جس کے
آخر میں شاعر کہتا ہے۔

تیرے تیر کا زخم کھاتے ہی
میں تیری تیر اندازی کا محرم راز بن گیا۔

تیرا شاگرد بننے سے معلوم ہوا
کہ جدائی ایک بیش بہا دولت ہے،
موت عشق کی ضمانت ہے
موت عشق کا ہم زاد ہے۔

اُس روح کے لیے جو دنیا میں پھنسی ہو،
موت اور عشق ایک ہی انجام کے
دو نام ہیں، پکارنے کے دو طریقے۔
”جاڑے کے گیتوں“ کی ایک شکایت سُنئے :-

میرے دیران راستوں کے غیبی رہبر!
تو مدتوں سے میری آزمائش کر رہا ہے۔

اعراف کے ان گہرے قعروں میں، جہاں داخل ہونے کو
ہم اس دنیا میں پیدائش کہتے ہیں۔

میری عزت چھن گئی اور مجھے ملا کیا؛

اوروں کے ساتھ ایک کال کوٹھری میں بند رہنا،

جب تک کہ میں ان چیزوں سے جو میرے دل کو نہیں بھائیں

راضی نہ ہو جاؤں، ایک بوسہ دے کر دل کا غبار دور نہ کر دوں۔

میں نے سنگ دل، بے لطف جاڑوں کی صحبت سے گریز کیا،

اور عیاشوں کی طرح ان دلیوں میں جا کر جہاں جاڑے کی پہنچ نہیں

مناظر فطرت کو محبوب بنایا اور رنگ رلیاں مناتا رہا۔

لیکن میرے آقا اور اُستاد نے خفا ہو کر حکم دے دیا

کہ تاریکی کے بادل میری دنیا ہوں، برف کے ڈھیر میری قبر

اور برف کے طوفان میری نجات کے لیے گیت گائیں، دعائیں مانگیں۔

استعاریت کے خاص طرز اور روسی کلاسیکی، رومانی اور حقیقت نگار

شاعری کے اسالیب کی بہترین آمیزش الکساندر بلوک کے کلام میں پائی

جاتی ہے۔ شروع میں اس پر سولوفیوٹ کے فلسفے اور زینئی دامپسکس کے

طرز کا اثر تھا اور اس کے پہلے مجموعہ کلام (۱۹۰۴ء) میں یہ ظاہر بھی ہوتا

ہے۔ نظمیں ایک ”خوبصورت خاتون“ کی شان میں تھیں اور یہ معلوم کرنا

دشوار نہیں کہ یہ ”خوبصورت خاتون“ کوئی انسان نہیں ہے بلکہ عقل کامل

کا وہ مجسمہ جسے بعض یونانی فلسفی ”صوفیا“ کہتے تھے اور جس کا ذکر سولوفیوٹ

کی نظموں میں آتا ہے۔ لیکن ”خوبصورت خاتون“ کی ذات و صفات اور نظم کی ساخت اگرچہ بلوک کی اپنی ایجاد نہیں، پھر بھی اس پر سرقے کا الزام نہیں لگایا جاسکتا اور اس کی ان نظموں میں بہت سی خوبیاں ہیں جو اس کی اپنی طبیعت کی پیدا کی ہوئی ہیں۔ اس مجموعہ نے شاعری کے عام قدر دانوں میں تو بلوک کو مشہور نہیں کیا، کیونکہ اس کے کلام کا استعاریت کے خاص تخمیل سے بہت تعلق تھا اور جو بلوک کے خیالات سے واقف نہ تھے انہیں ان نظموں کے سُرِیے الفاظ کے سوا اور کسی چیز سے لطف نہیں حاصل ہو سکتا تھا۔ لیکن خود شاعروں کے حلقوں میں بلوک اور اس کا کلام ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ ۱۹۵۰ء کے انقلاب میں بلوک کا خون بھی اُبل اُٹھا، وہ نظموں میں ”فلسفیانہ مزاج“ کی تعلیم دینے لگا، اور ایک موقع پر اس نے سُرِخ جھنڈا لے کر سُرِکوں کا گشت بھی لگایا۔ یہ جوش چند روزہ تھا۔ انقلابیوں کی ناکامی نے بلوک کو بہت مایوس کر دیا اور وہ صرف ”فلسفیانہ مزاج“ کے عقیدے نہیں بھول گیا بلکہ اپنی ”خوبصورت خاتون“ کو بھی اور ۱۹۵۶ء میں اس کے کا جو مجموعہ شایع ہوا اس میں ان دونوں کا پتہ نہیں ملتا۔ بلوک نے فلک پیمائی کے حوصلے چھوڑ کر دنیا کی طرف رُخ کیا، شاعرانہ طبیعت کے نازک احساسات ترک کر کے دنیا اور زندگی کی حالتوں اور کیفیتوں کو اپنا موضوع بنایا۔

”خوبصورت خاتون“ کی بجائے اب ایک ”اجنبی عورت“ کا تصور اس کے ذہن پر حاوی ہو گیا، ایک انجان ہستی جو ”خوبصورت خاتون“ کی طرح آسمان کی رہنے والی اور ستاروں کی سہیلی نہیں ہے بلکہ ایک لڑکی جو طرح طرح کے

بھیس بنا کر دنیا کا تماشا دیکھتی پھرتی ہے اور اکثر ایسے مقامات پر نظر آتی ہے جہاں شرابی اور عیاش جمع ہوتے ہیں۔ کبھی شاعر اسے دور سے دیکھتا ہوا "تیز شراب دل کے گوشہ گوشہ میں سرایت کر جاتی ہے" کبھی مٹھ بھڑ ہو جاتی ہے اور شاعر کو اس کے چہرے پر اس کے مزاج کی عجیب عجیب کیفیتیں اس کے دل کے راز، اس کی آرزوئیں اور تمنائیں نظر آتی ہیں۔ لیکن گو "اجنبی عورت" کی کیفیتیں روشن ہیں، شاعر اپنی امنگیں اور خواہشیں نہیں سمجھتا کہ کیا ہیں۔

"میں، اپنے نصیب کے ستارے کے چمکنے سے مست اور مسحور ہوں۔

شراب نے اور صبح کی رونق اور دیدار نے

مجھے بے زبان کر دیا ہے، تڑپا دیا ہے،

مجھے امید اب کس بات کی ہے، انتظار کا ہے کاہ

"خوبصورت خاتون" اور "اجنبی عورت" دونوں کے عشق سے بلوک

اپنے دل کو تسکین نہیں پہنچا سکا اس کا جذبہ نہایت پاک تھا اور شوق بے انتہا

لیکن یہ استعارے اصالت کی شکل نہیں اختیار کر سکے اور بلوک ان میں جان

ڈالنے کی کوشش سے اکتا گیا۔ آخر میں روس، اس کا دل، وہ سرزمین جس

کی گود میں اس کی شخصیت پلی بھتی، جس کی مصیبتوں نے اس کا دل دکھایا تھا

جس کی فضا نے اسے نواسنجی سکھائی تھی، اس کی معشوقہ بن گئی۔ نظموں کا تکرار

مجموعہ جس میں بلوک کے فلسفے کا یہ رخ نظر آتا ہے، ہر صورت سے اس کے کلام

کا بہترین حصہ ہے۔ وہ مایوسی جو اس سے پہلے کی نظموں میں محسوس ہوتی ہے،

لے روسی زبان میں روس نوشتہ ہے۔

اب حد سے گزر جاتی ہے، مگر اس کے ساتھ ہی بلوک کو روس کے مستقبل کا خیال
 کر کے کچھ روحانی سہارا بھی مل جاتا ہے اور اس کی مایوسی محض ایک ذاتی کیفیت
 ہو جاتی ہے، کل کائنات پر چھائی ہوئی نہیں رہتی۔ اس مجبوسے کی اشاعت
 کے ایک سال بعد ہی بولشوک انقلاب نے روسی زندگی کی کایا پلٹ دی اور
 گو بلوک کو سیاسی معاملات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، وہ بولشویکوں کے ساتھ
 شریک ہو گیا اور اپنی شاعرانہ امیدوں کو ان کی کوششوں سے وابستہ کر دیا۔
 اس کی دو لمبی اور بہت سی مختصر نظمیں جو انقلاب کے دوران میں لکھی گئیں
 ان امیدوں کا رنگ دکھاتی ہیں لیکن اپنی نسبت اس کا وہی خیال رہا، اپنی
 ذات کی طرف سے وہی مایوسی جو ۱۹۱۷ء کی ایک نظم سے ظاہر ہوتی ہے:

اور اگر ہمارے بستر مرگ پر

پہلے کتے چلائیں اور منڈلائیں تو پروا نہیں۔

تو ان کو جو ہم سے زیادہ سزا وار ہیں،

اور خدا اپنے جلوے کے دیدار سے سرفراز کر!

بلوک کے پہلے طرز کی دو نظمیں ملاحظہ ہوں:

مجھے مت بلائیں بن بلائے

تیرے حرم میں پہنچ جاؤں گا۔

غاموشی سے تیرے پیروں پر

سر کو جھکا دوں گا،

تیرے احکام سنوں گا،

چپ چاپ انتظار کروں گا۔

دیدار کے لمحے کے مزے لے کر

پھر اسی آرزو میں محو ہو جاؤں گا؛

تیرے جذبات کی شدت

میرے گلے کا طوق ہوگی۔

کبھی خادم بنوں گا، کبھی محبوب

اور ہمیشہ غلام رہوں گا؛

شاعر کے دل کی ایک خاص کیفیت کا بیان مینے۔

شام کو جب زمین کہرے کی نقاب ڈال لیتی ہے

تو بھوسچال اور شعلوں سے گھرا ہوا

ایک فرشتہ قرآن کے صفحوں سے نکل کر

میرمی مردہ روح میں داخل ہو جاتا ہے۔

دماغ کمزور اور تھکا ماندہ ہوتا ہے؛

روح اڑتی چلی جاتی ہے...

ہر طرف بے شمار پروں کی پٹھڑ پٹھڑا ہٹ ہوتی ہے،

کانوں میں ایک پُراسرار گیت کی صدا گونجتی ہے۔

تیسرے دور میں بلوک کی ذہنیت پر مایوسی کا غلبہ تھا۔ ایک مختصر نظم میں وہ

اسے اپنے خاص طرز میں ظاہر کرتا ہے:

عیش و طرب کی مجلس کا لطف اٹھا کر

میں رات کو بہت دیر سے گھر واپس آیا۔

رات کا اندھیرا میرے کمروں میں منڈلا رہا تھا،

میرے گوشہ عافیت کی حفاظت کرنے کو...

صرف میرا شیطان دم بھر بھی چین نہیں لیتا۔

وہ مجھ سے کہتا ہے: دیکھ یہ تیرا چھوڑنا ہے،

اب اس وقت کی کیفیت، اس وقت کی بیہودگیاں بھول جا

اور پارساؤں کا سامنہ بنا کر اپنے گیتوں میں گزشتہ زمانے کی چھوٹی تعریف کر۔

اس دور کی بہترین نظمیں وہ ہیں جن میں بلوک نے اپنے کو مخاطب کیا ہے،

مگر افسوس ہی طوالت کے اندیشہ سے یہاں ان کے ترجمے دینا ممکن نہیں۔ بلوک

کی استعاریت پر آخری دور میں حقیقت نگاری کا جو رنگ چڑھ گیا اس کی

بہت اچھی مثال ایک نظم میں ملتی ہے جس میں ایک فوج کاریل پر سوار ہو کر پیر برگ

سے میدان جنگ کے لیے روانہ ہونا بیان کیا گیا ہے:

اس ریل گاڑی کے مسافروں میں جدائی کے درد، محبت کی بے چینیوں

قوت، جوانی، امید کے ہزاروں پھول کھلے ہوئے تھے...

اور دور مغرب کی طرف

دھویں جیسے بادل، خون میں ڈوبے ہوئے تھے۔

۔ موت کا یہ شگون اور بھی واضح کر دیا جاتا ہے۔

گاڑی اسٹیشن سے نکل گئی

اندھیرے میں آخری ڈبے چھپ گئے۔

اور خاموشی نے صبح تک کے لیے ڈیرے ڈال دیئے؛
لیکن بارش سے گیلے میدانوں سے ”ہویا“ کی آواز آتی رہتی
جس کی ہولناک صدائے بازگشت تھی ”آگیا، وقت آگیا“

۱۹۱۷ء کے بعد استعاریت کا زور کم پڑ گیا۔ اگرچہ بلوک اور ویاچسلاف
ادانوف، اس کے دو عظیم الشان نمائندے زندہ تھے اور ان کا کلام بہت
مرغوب بھی تھا؛ اس سال سے ایک نئی تحریک شروع ہوئی جو ”شاعری
پیشہ برادری“ کے نام سے مشہور ہے اور جس کا بانی نکولائی سینیا نوویچ گومی
لیوف تھا۔ شاعری کے اس نئے معیار کے مطابق دنیا اور زندگی کو استعارہ
سمجھنا غلط تھا، اور شاعر کا فلسفہ حیات ایک حقیقت نگاری قرار دی گئی جو
پھول کو پھول کہے اور خوبصورت سمجھے، مگر اپنے احساسات کے بیان میں
وہ تازگی پیدا کرے، اپنی نظر میں وہ سادگی جو اس انسان کی خصوصیات تھیں
جس نے پہلے پہل دنیا میں وارد ہو کر دنیا کو دکھا اور اس پر تعجب کیا، اس
نئے معیار نے تصوف کو بھی شاعری سے خارج کر دیا اور شاعر کو بجائے استعارہ
پسندوں کی طرح عارف سمجھنے کے محض صنائع قرار دیا۔ خود گومی لیوف کا
کلام اس معیار پر پورا اترتا ہی، کیونکہ وہ آدمی بہت من چلا تھا، سیاحت
اور درندوں کے شکار کا شوقین، بالکل ویسا ہی دنیا میں نو وارد انسان جیسا
”شاعری پیشہ برادری“ والوں نے شاعر کے لیے ہونا لازم کیا تھا۔ اس کی
نظموں کے موضوع بھی جنگل اور شکار اور شکار کے حادثے، سمندر کے سیاح

اور بہادر سپاہی تھے۔ ایک نظم میں جہاں گومی لیون نے جسم اور روح کا ایک مکالمہ بیان کیا ہے، جسم کہتا ہے: ”مگر اس سب کے بدلے جو میں نے لیا ہے اور اب بھی لینا چاہتا ہوں، اپنی خوشی اور حماقتوں اور رنج کے بدلے، میں، جیسا کہ ہر مرد آدمی کو چاہیے، مرنے اور مٹ جانے پر بھی راضی ہوں۔“ مردانگی کو اس درجے تک پہنچانا کہ وہ شعر بن کر بھی ظاہر ہوا کرے آسان کام نہیں، اور ”شاعری پیشہ برادری“ کا گومی لیون کے علاوہ ایک ہی اور رکن ہے جس نے میدان سخن میں نام پیدا کیا: آئنہ آخنا تووا، جو چند سال تک گومی لیون کی بیوی بھی رہ چکی ہیں۔

آئنہ آخنا تووا (پیدائش ۱۸۸۹ء) کی نظمیں پہلی بار ۱۹۱۱ء میں، گومی لیون سے شادی ہونے کے ایک سال بعد شایع ہوئیں۔ یہ نظمیں خاص شاعروں کے حلقوں میں بہت پسند کی گئیں، عام شہرت آئنہ آخنا تووا کو ان کے کلام کے دوسرے مجموعے کی اشاعت پر حاصل ہوئی (۱۹۱۴ء) اس کے بعد دو اور مجموعے شایع ہوئے، ایک ۱۹۱۶ء میں دوسرا ۱۹۲۲ء میں بلوک کے انتقال پر پتیر برگ کے شاعروں کی سرداری ان کا حصہ ہوئی۔

آئنہ آخنا تووا کی نظمیں زیادہ تر ڈراما کے سے مناظر ہیں، مگر بہت مختصر۔ ان کے جذبات میں کسی قسم کا شاعرانہ بناؤ سنگار نہیں، لیکن شدت ہے اور خلوص، طرز بیان کے اختصار سے ان کی نظموں میں ایک عجیب طبع پیدا ہوتا ہے اور گو وہ زیادہ تر آپ بیتی سُناتی ہیں، ان کی کیفیت ایک خواب کی سی رہتی ہے۔ دو نمونے ملاحظہ ہوں۔

جیسا کہ سیدھی سادھی خوش اخلاقی کا تقاضا ہے،
تم میرے پاس آئے ہمسکرائے۔

کچھ پیار سے، کچھ بے پروائی سے
میرے ہاتھ پر یوسہ دیا،

اور مجھ پر ایک نظر ڈالی۔ معلوم ہوا

کہ پُرانی اسجان صورتیں مجھے دیکھ رہی ہیں۔

میں نے ایک لفظ کہا جس میں

دس برس کی آہوں، اس مردنی کی جو مجھ پر طاری تھی،

ان راتوں کی جو میں نے جاگ جاگ کر کاٹی تھیں

ساری تاثیر جمع تھی۔ مگر اس کا کہنا بے سود ہوا۔

تم چلے گئے اور پھر میرا دل

سپاٹ اور دیران اور خالی ہو گیا۔

جُدائی کی ایک صورت یوں بیان ہوتی ہے:

میں تیرا سفید مکان، تیرا خاموش باغ چھوڑ دوں گی،

اس کی پروا نہ کروں گی کہ میری زندگی دیران ہو گئی، جیسے بے بادل آسمان،

تیرا صرف تیرا اپنے گیتوں میں چرچا کروں گی،

مجھے مشہور کروں گی، جیسا کہ نئی عورت اپنے دوست کو نہیں کر سکتی ہے۔

تو اپنی عزیز دوست کو یاد کرے گا، اس جنت کو

جو تو نے اس کی آنکھوں کو فرحت پہنچانے کے لیے بنائی تھی،

اور میں سوداگری کر دوں گی ایک مہینہ بہا مال کی:
 تیری الفت اور محبت کو شعر بنا کر بچوں گی۔
 آنا آخا تو وا کی ایک اور نظم کا ترجمہ دیا جاتا ہے جس میں صرف روس کی
 نہیں بلکہ ہر اس قوم کی ذہنیت جو تنزل کی حالت میں ہوتی ہے بہت سچے اور
 دل کش طریقے پر بیان کی گئی ہے:

ہم نے سمجھ لیا کہ ہم مفلس ہیں، ہمارے پاس کچھ بھی نہیں۔
 اور جب ایک کے بعد ایک نعمت ہمارے ہاتھ سے جانے لگی،
 اور ہر دن ایک نئے نقصان کا ماتم ہونے لگا،
 تو ہم نے گیت بنا کر شروع کیے
 خدا کے عظیم الشان فیض و کرم پر،
 اور اس دولت پر جسے کبھی ہم اپنی کہتے تھے۔

استعاریت کے زوال پر روسی شاعروں کے اصولوں اور اسالیب
 میں انتشار پیدا ہو گیا اور ابھی تک یہی صورت قائم ہے۔ اوسپ یمیل پوچ
 ماڈل تام نے شروع میں "شاعری پیشہ برادری" کے اصول نظم اور گومی کیون
 کی تقلید کی، لیکن پھر اپنا نیا طرز ایجاد کیا ہے جس میں خیالات اور زبان
 کے اعتبار سے کوئی خوبی نہیں، صرف الفاظ کے انتخاب اور ترتیب سے
 موسیقی کی خاص کیفیتیں شعر میں پیدا کر دی گئی ہیں۔ ۱۹۱۷ء کے بعد دواور
 نئے حلقے وجود میں آئے ہیں "دیہاتی شاعری" یا "تصوری" اور "مستقبل"۔
 دونوں پر اشتمالیت کی تعلیم اور انقلاب کی فضا کا بہت اثر ہے، یعنی انھوں نے

فن شاعری کے وہ بنیادی اصول اور وہ مقاصد جو شروع سے اس وقت تک ہر شاعر نے تسلیم کیے ہیں اور جو شاعروں کا خاص میدان سمجھے جاتے ہیں بالکل رو کر دیے ہیں۔ ان کی شاعری کو جہالیات سے کوئی واسطہ نہیں، وہ خود نہ لطیف جذبات رکھتے ہیں نہ دوسروں کی طبیعتوں میں ان کا وجود تسلیم کرتے ہیں، محسن سے انھیں کوئی سروکار نہیں، خواہ وہ مناظر فطرت کا ہو یا انسان کا یا تخیل کا۔ اس صورت میں ان کے کلام کا ذکر کرنا فضول ہی اور اسے سمجھنے کی کوشش کرنا بیکار۔ ان جذبوں سے کہیں بہتر ان پرانے شاعروں کی نظمیں ہیں جو انقلاب کے زمانے میں انقلاب کی اخلاقی اور روحانی کیفیات پر لکھی گئی ہیں، جن میں سچی باتیں اچھے طریقے سے کہی گئی ہیں اور جن کے مصنف روسی قوم اور روسی فطرت سے انقلابیوں کی نسبت بہت زیادہ گہری واقفیت رکھتے ہیں۔

انقلابی دور کی پرانے طرز کی شاعری کا ذکر کرتے ہوئے سب سے پہلے بلوک کا نام زبان پر آتا ہے۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے، بلوک نے "خوبصورت خاتون" اور "اجنبی عورت" کی طرف سے سرد مہر ہو کر اپنی سرزمین روس کو معشوقہ بتایا تھا۔ پہلے انقلاب کی ناکامی اور اصل حقیقت کے انکشاف نے اسے بہت مایوس کر دیا تھا، مگر اس مایوسی کے باوجود اس کی محبت کا جذبہ بہت قوی رہا۔ ایک نظم میں وہ روس کو ایک دنیا دار عورت کی شکل میں پیش کرتا ہے اور اس کی طرف ہر قسم کی اخلاقی پستی اور دل کا کیفینہ بن منسوب کر کے آخر میں کہتا ہے:

مگر اس صورت میں بھی، اسی سرزمین روس
 تو مجھے دنیا کے ہر ملک سے زیادہ عزیز ہے۔
 جہاں روسی فطرت کی خامیاں نہیں بیان کی جاتی ہیں وہاں اور
 عیبوں پر افسوس ظاہر کیا جاتا ہے۔ مگر شاعر کی محبت ہر دوسرے جذبے پر غالب
 رہتی ہے۔

روس، مفلس روس، میرے نزدیک

تیرے مٹیالے جھونپڑے،

تیرے گیتوں کے سبک نغمے۔

گراں بہا ہیں جیسے محبت کے بہائے ہوئے پہلے آنسو۔

کبھی کبھی اُمید نے بلوک کی دست گیری کی اور اس نے اپنے ملک کی
 عظمت کے سجدہ دل ربا خواب دیکھے، جن میں سے ایک اس کی نظم
 ”نئے امریکہ“ میں بیان کیا گیا ہے۔ لیکن ترقی اور رونق کے یہ خواب اس
 کے دل سے بے چینی اور اندیشہ دور نہ کر سکے۔ ۱۹۰۶ء میں اس نے ایک نظم
 ”میدان کوئی کودو“ لکھی جس میں جنگ عظیم اور انقلاب کے زلزلے کی پیشین گوئی ہے اور انقلاب
 تک بلوک اپنے دل کو اسی اُمید سے تسکین دلاتا رہا کہ روسی زندگی میں کوئی نہ کوئی ایسا
 بنیادی تغیر ضرور ہوگا جو حالات کو بالکل بدل دے گا، پرانے فلسفہ حیات کو
 جڑ سے اُٹھا کر پھینک دے گا اور یوں روس کی فلاح کا ذریعہ ہوگا لیکن
 حزن اور مایوسی بلوک کی طبیعت پر اس طرح حاوی ہو گئی تھی کہ جب مستقبل
 کے وجدانی علم نے اسے انقلاب کے آمد کی خوش خبری سنائی تب بھی وہ

اپنے آپ پر، یا ان روسیوں پر جو اس کے ہم عمر تھے مطلق اعتبار نہ کر سکا،
 روس میں جان پھونکنے کی خدمت دوسروں کو سونپی اور اپنے لیے روحانی
 تباہی کے سوا اور کوئی انجام تصور نہ کر سکا۔ مایوسی اور امید کی عجیب آمیزش
 ان تمام نظموں میں پائی جاتی ہے جو اس نے انقلاب کے زمانے میں لکھیں اور
 جو دراصل اس دور کی سب سے قابل قدر ادبی یادگار ہیں۔ اپنی کیفیت
 وہ ذیل کی نظم میں بہت پروردگر صحیح طریقے سے ظاہر کرتا ہے:

مجھ پر بیچارے جاہل ہفتے تھے،

کہتے تھے نوجوان شاعر شعبدہ بازی کر رہا ہے،

جہاں امید کی صورت نہ تھی، امید پیدا کر دی،

جس کی کوئی انتہا نہ تھی، اس کی حد باندھ دی،

مجھے خود بھی وہ شعلہ جو میں نے روشن کیا ہے

عجیب نظر آتا ہے، میرے دل کو اس سے وحشت ہوتی ہے،

میں خود اپنے تیر کا زخمی ہوں،

خود اس نئی زندگی کا بوجھ اٹھانے سے ہمت ہار بیٹھا ہوں۔

گزرنے والو، میرے پاس سے گزرتے جاؤ،

میرے درد کا مذاق اڑانے جاؤ

میں تو مر رہا ہوں، مگر مجھے معلوم ہی میری بنائی ہوئی دنیا

میری موت کو برداشت کرے جلتے گی اور تھاری ہیبت ناک تصحیک کو بھی۔

ایک اور نظم ملاحظہ ہو، اس میں مایوسی کی وہ شدت نہیں اور ناکامی کا

کچھ اندیشہ جو ظاہر ہوتا ہے انقلاب کے غطت کے احساس میں محو ہو جاتا ہے:
 دنیا کی اس تاریکی پر جو صدیوں سے چھائی ہوئی تھی،
 اس تاریکی پر جو نفرت اور شہواہیت سے بھری ہوئی تھی،
 اس تاریکی، پر جنگی نعروں کے جواب میں آسمان پر
 ایک نئی قوت کا آفتاب طلوع ہو رہا ہے۔

وہ شعاعیں جو اس آفتاب کے تاج کے گوشے ہیں
 بہت جلد کالے بادلوں کی گھٹا کو پار کر جائیں گی،
 اور لوگ میدان جنگ سے دریا کے دھارے کی طرح
 اس کے چمکنے ہوئے تخت کے سامنے پہنچیں گے۔

ہم جو صرف رات کے اندھیرے اور طوفان سے آشنا ہیں
 اس شاہانہ جلوے کے دیدار کی تاب نہ لا سکیں گے۔
 اور ہماری دنیا آسمان کا وحشت ناک منظر دیکھ کر۔
 راکھ کا ایک ڈھیر بن جائے گی۔

انقلاب کے زمانے کا ادبی کارنامہ بلوک کی نظم ”بارہ سوار“ ہے جس کا
 اکیس مختلف زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے، اور بعض زبانوں میں متعدد بار۔
 اس میں بارہ سواروں کا قصہ ہے جو رات کو شہر میں پہرہ دے رہے ہیں
 اور فحش گیت گاتے اور ادھر ادھر گولیاں چلاتے سڑکوں کی گشت لگا رہے
 ہیں۔ انقلاب کا زمانہ ہے۔ زیادہ رات گزرنے کے بعد لوگوں کو سڑکوں پر
 گھومنے کی اجازت نہیں ہے، اس لیے یہ بارہ سوار جب اپنے آگے ایک شخص

کو سر جھکانے جاتے ہوئے دیکھتے ہیں تو اسے فوراً لٹکارتے ہیں وہ شخص کوئی
 جواب نہیں دیتا، سوار فوراً گولی مارتے ہیں، مگر اس کا بھی راہ رو پر کوئی اثر
 نہیں ہوتا۔ تب وہ گھوڑوں کو ایڑ لگا کر اس کے پاس پہنچتے ہیں۔ راہ رو منہ
 پھیر کر ان کی طرف دیکھتا ہے اور سوا اس کی صورت دیکھ کر دنگ رہ جاتے ہیں
 کیونکہ وہ کوئی معمولی راہ رو نہیں، خود حضرت عیسیٰ ہیں، جو اپنی محبوب قوم
 میں روحانی بیداری کے آثار دیکھ کر آتے ہیں کہ کچھ ان کی بھی امیدیں پوری
 ہوں۔ اس نظم میں بلوک نے صرف انقلاب کی روحانی اہمیت نہیں بتائی
 ہے بلکہ شاعری کا ایک کرشمہ دکھایا ہے۔ اس کی زبان وہی ہے جو عوام خصوصاً
 شہری مزدوروں کے گیتوں کی، مگر اس کی بحرین موسیقی اور ترنم کے جوہر
 ریزے ہیں اور اس میں ایک شان ہے جو بہت کم نظموں میں پائی جاتی ہے۔
 بلوک کے علاوہ ان تمام شاعروں نے جن میں وطن پرستی کی ذرا بھی گدگری
 تھی اپنے اپنے طرز پر انقلاب سے ہمدردی اور ان مصیبتوں پر افسوس ظاہر
 کیا جو انقلابیوں اور روس کی عام آبادی کو اس تحریک کے کامیاب بنانے
 کے لیے اٹھانی پڑیں، لیکن بلوک کے پایے کو کوئی نہیں پہنچا۔ آئنا آئنا تو
 کو بھی اپنے وطن سے بہت محبت ہے اور لڑائی کے زمانے میں انہوں نے اپنے
 جذبے کا یوں اظہار کیا۔

برسوں بیمار رکھ کر میری زندگی تلخ کر دے،

مجھے سانس کے روگ میں مبتلا کر دے، میری نیند چھین لے، مجھے گرمی میں جلا،

اولاد اور دوست سے محروم کر دے،

نغمہ سرائی کی پُرا سرار نعمت والیں لے لے ،
 لیکن اسی خدا، میری یہ دعا بھی قبول کرے
 کہ اتنے دنوں تکلیف دینے اور ترہ پانے کے بعد
 وہ بادل جو تار یک روس پر جھپایا ہوا ہے
 آخر کار آفتاب کی شعاعوں سے چمک اُٹھے۔

لیکن یہ وطن پرستی ایسی شدید اور دل افروز نہیں کہ شاعرہ کو مستقبل
 کے راز بتا دے، یا انقلاب کے روحانی اسرار اس پر واضح کر سکے۔ انقلاب
 کی نسبت آنا آٹنا تو واضح صرف یہ کہہ سکیں :

گزشتہ عہدوں سے ہمارا زمانہ کس صورت سے بدتر ہے؟
 کیا اس لحاظ سے کہ درد اور پریشانی کی انتہائی حالت میں
 اس نے وہ روگ دور کرنا چاہا جو سب سے زیادہ زہریلا تھا،
 اور ناکامیاب رہا؟

ان شاعروں نے جو انقلاب اور انقلابیوں کے خاص حامی اور مبلغ
 مانے جاتے ہیں اور جن کا سردار مایا کوفسکی (پیدائش ۱۸۹۲ء) ہے، تخیل
 کی بلند پروازی اور ادبی کمال سے بالکل بیگانہ ہیں اور ان کی شاعری کو
 دراصل ادب میں شامل ہی نہ کرنا چاہیے۔ البتہ انقلاب نے نئی زندگی کی
 تعمیر کا سچا جوش اور حوصلہ پیدا کر دیا ہے اور یہ حوصلہ ممکن ہے رفتہ رفتہ نئے
 پھول کھلائے۔ ولیری بریوسوف کی نظم ”قیسری خزاں“ کے آخر میں جو
 دعویٰ ہے اس میں مبالغہ بہت ہے مگر روسی قوم کی عام بیدار دلی دیکھتے ہوئے

اس کا بھی امکان ہے کہ وہ ایک حد تک صحیح نکلے:

ای ہوا، ای ہوا، یہ یاد رکھ

کہ جھگڑوں اور مکیبی اور مفلسی کے باوجود

سارا روس تعمیر کی خوابوں سے مرت

خدا کے حکم پر چلے گا اور فتحیاب ہوگا!

ای ہوا، یاد رکھ کہ پُرانی قوت پھر روس میں آگئی ہے،

فتحیابی کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے،

اور اس کی روز افزوں طاقت اور اقتدار

اسے دنیا کی ساری قوموں کا رہبر بنا دے گا!

روسی حکایتیں

ادان آندرے یوچ کرلیوف (۱۷۶۸-۱۸۴۲)
کرلیوف، روس کا حکیم لقمان، زمانے کے اعتبار سے شروع کے
ادیبوں میں تھا، لیکن اس کی بالکل جداگانہ حیثیت ہے اور اس سبب
سے اس کا الگ ذکر نامناسب معلوم ہوتا ہے۔ روس کا وہی ایک
ادیب ہے جس نے حکایتیں لکھیں اور جو حکیم کہلانے کا مستحق ہے، وہ نہ
شاعروں میں کھتا ہے اور نہ ڈراما نویسوں میں، اگرچہ ڈراما نویسوں میں
اس نے خاصا ملکہ پیدا کیا اور اپنے زمانے میں خاصا مشہور ہوا۔ قصہ
کہانی کا وہ خاص انداز جو حکایت میں اختیار کیا جاتا ہے افسانہ نویسی
سے بالکل جدا ہے۔

کرلیوف کی زندگی اور ادبی کوششیں روسی قوم کی سرگزشت
سے بہت ملتی جلتی ہیں۔ وہ ایک فوجی افسر کا لڑکا تھا جسے ایمانداری
نے دوسروں کی طرح رشوت کھا کر دولت نہیں جمع کرنے دیا اور اسے
درثے میں باپ کی نیک نامی اور صندوق پھر کتابوں کے سوا اور کچھ
ہنسی ملا۔ لیکن کرلیوف کو تعلیم حاصل کرنے کا سچا شوق تھا، اور جو

مشکلیں مفلسی نے پیدا کیں وہ اس کی غیر معمولی محنت اور جفاکشی نے
 اس پر آسان کر دیں۔ ۱۹۰۲ء میں وہ اپنی ماں کے ساتھ پتیر برگ
 گیا، جہاں اسی زمانے میں ایک نیا ٹھیٹر کھلا تھا اور فون ویزن کے
 ڈرامے دیکھ کر کرلیون کو بھی ڈراما نویسی میں طبع آزمائی کرنے کا حوصلہ
 ہوا۔ اس کا پہلا ڈراما فون ویزن کے طرز پر تھا، مگر اس میں آئندہ ترقی
 کے آثار ایسے نمایاں تھے کہ ایک کتب فروش نے نوجوان انشا پرداز کی
 ہمت افزائی کے لیے اسے ۸۰ روپل میں خرید لیا۔ کرلیون نے اس
 روپیے سے مشہور فرانسیسی ڈراما نویس مولیئر، رسین اور کورنے می
 کے ڈرامے خریدے اور ان سے سبق لے کر پھر مشق شروع کی۔ اس کے
 ڈراموں میں آج کل تو کوئی خاص خوبی نظر نہیں آتی، لیکن اس وقت
 ان کی خاص قدر کی گئی اور کرلیون ڈراما نویس کی حیثیت سے شاہی
 ٹھیٹر میں ملازم رکھ لیا گیا۔ کرلیون کی آزادی پسند طبیعت ملازمت
 کی پابندیوں کو گوارا نہیں کر سکتی تھی، اس نے ۱۹۰۹ء میں استعفا
 دے کر چند دوستوں کی شرکت میں ایک اخبار نکالا جس میں کرلیون کا
 حصہ طنزیہ مضامین، ڈرامے اور قصے لکھتا تھا۔ یہ اخبار بہت جلد بند
 کر دیا گیا اور اس کے بعد کوئی تین سال تک کرلیون آوارہ گردی کرتا
 رہا۔ ۱۹۱۴ء میں اس کی نواب گولیٹین سے ملاقات ہوئی اور ۱۹۰۵
 تک کرلیون اس کے ساتھ رہا۔ اس عرصے میں اس نے بہت سے ڈرامے
 لکھے، مگر ایک مرتبہ اس نے جوئے میں تیس ہزار روپل جیتے تو اس نے اپنے

رئیس دوست کو خیر باد کہی اور پھر آوارہ گردی کرنے لگا۔ دو سال تک وہ میلوں اور بڑے شہروں کے قمار خانوں میں جو اکھیلتا پھرا اور آخر کو تھک کر پتیر برگ میں مستقل رہنے کا انتظام کر لیا۔ اسی زمانے میں اسے اپنی ایک نئی صلاحیت کا پتہ چلا تھا۔ اس نے مشہور فرانسیسی حکایت نویس لافون تین کی دو حکایتوں کا ترجمہ کر کے ایک ممتاز نقاد دمیتری لفن کو دکھایا اور دمیتری لفن نے اسے یقین دلادیا کہ اس کی طبیعت اس قسم کی کہانیاں لکھنے کے لیے خاص موزونیت رکھتی ہے۔ کرپوف نے اس کی مشق جاری رکھی اور جب اس نے ۱۸۰۸ میں پتیر برگ کے ایک رسالے میں سترہ حکایتیں شائع کیں تو وہ اس فن کا استاد مان لیا گیا، زار روس سے لے کر معمولی تعلیم یافتہ آدمیوں تک سب کو اس نے اپنا گرویدہ کر لیا اور اس کی حکایتوں کا چرچا وقت کے ساتھ برابر بڑھتا رہا۔

کرپوف کی ہر دلغری کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ اس کی طبیعت اس کی ذہنیت، اس کی حکمت اور اس کا انداز بیان ٹھیکہ روسی تھا۔ بچپن میں وہ گلی کوچوں میں مارا مارا پھر چکا تھا، آوارہ گردی کے زمانے میں اسے ہر قسم اور ہر طبقے کے لوگوں کی صحبت میں بیٹھنے کا موقع ملا تھا۔ وہ مثلیں، کہاوتیں، چبھتے ہوئے فقرے جو اس نے سنے تھے سب اس کے ذہن نشین ہوتے گئے اور جب اس نے حکایتیں لکھنا شروع کیا تو سمجھے اس کی زبان خود بخود روسی قوم کی ترجمانی کرنے لگی۔ شاعری اور ڈراما نویسی کی مشق سے اسے زبان پر اتنی قدرت ہو گئی تھی کہ وہ موقع

اور طرز بیان میں انتہائی مناسبت پیدا کر سکتا تھا اور حکایتوں کا رس کبھی
نظم کی لطافت ہوتی ہے، کبھی ڈراما کی کشمکش اور کبھی حکمت اور نصیحت کی نکتہ
رسی۔

حکایتوں کے چند نمونے پیش کیے جاتے ہیں۔ اس کا خیال رہے کہ یہ
ترجمے ہیں اور ترجمے میں خواہ مخواہ ایک بناوٹ آجاتی ہے، خاص طور سے
اگر مترجم کو بات کہنے کا وہ سلیقہ نہ ہو جو اصل مصنف کو۔
گوئیے

ہماتے نے ہماتے کی دعوت کی۔

مگر اس میں ایک غرض بھی تھی:

میربان کو تھا موسیقی کا شوق

اور اس نے ہماتے کو اس بہانے سے چند گویوں کا گانا سنانے کو بلایا تھا۔

یہ پہلوان بڑی بے جگری سے سردوں کی کھینچ تان کرتے رہے،

خوب گلا پھاڑ پھاڑ کر چیخے...

مہان کے کان جھٹانے لگے،

سر جکرانے لگا۔

اس نے حیرت سے پوچھا: ”بھئی مجھے معاف کرنا

مگر اس میں بات کیا ہے؟ تمہارے گویے تو

پھٹے ڈھول کی طرح چلاتے ہیں“

مہان نے معذرت کے لہجے میں جواب دیا: ”یہ تو ٹھیک ہے،

ان کی آواز بھٹی بھٹی سی ضرور ہے،
مگر یہ بھی تو دیکھیے کہ یہ شراب بالکل نہیں پیتے
اور چال چلن کے بہت اچھے ہیں۔“
مگر میں کہتا ہوں: پینے کو جی چاہے تو خوشی سے پیو،
پر اپنا کام سلیقے سے کرو۔

ہاتھی اور کتیا

سڑک پر ہاتھی کو گھما رہے تھے،
ظاہر ہی اس لیے کہ سب اسے دیکھیں۔
یہ تو آپ جانتے ہیں ہاتھی ہمارے یہاں ایک انوکھی چیز ہے۔
اس لیے ہزاروں آدمی منہ پھیلائے اس کے پیچھے پیچھے پھر رہے تھے۔
نہ جانے کدھر سے ایک ذرا سی کتیا نکل پڑی۔
اور ہاتھی کو دیکھتے ہی اس پر لپکی،
بھونکی، غڑائی، پتیرے بدل بدل کر جھپٹی...
سمجھو لڑائی پر تلی تھی۔

”بی ہسانی، اپنی لاج نہ گنواؤ۔“

اس سے ایک کتے نے کہا: ”تمہاری حقیقت کیا ہے کہ ہاتھی سے
لڑائی چھیڑو؟“

دیکھو، تم چلا رہے ہو، وہ اطمینان سے چلا جا رہا ہے،
گویا تمہاری آواز اس کے کانوں تک پہنچتی ہی نہیں!“

”ارے جاؤ بھی“ کتیا نے پھٹ سے جواب دیا،

”میری تو اس بات سے اور ہمت بڑھتی ہے

کہ میں بغیر لڑے ہوئے

بڑے جنگی جانوروں کا سامنا کر لیتی ہوں...

تم آپ ہی دیکھنا، سارے کتے کہیں گے،

”دیکھو تو اس کتیا کو، یہ بڑی سو رہا ہوگی

جو ہاتھی پر بھی بھونک لیتی ہے!“

بطنیں

کوئی کسان بطنوں کو ایک لمبی قطار میں

بیچنے کے لیے بازار ہنکانے لیے جا رہا تھا۔

پس تو یہ ہے کہ وہ بطنوں کے اس جھنڈ کا کوئی خاص لحاظ نہیں کرتا تھا:

بازار کا دن تھا، وہ چاہتا تھا جلدی سے جا کر انھیں اچھے داموں

بیچ آئے۔

لیہ تو آپ جانتے ہیں، منافع کی خاطر

بطنیں کیا آدمی بھی بیچ ڈالے جاتے ہیں)

میں کسان پر کوئی الزام نہیں لگاتا

مگر ان بطنوں کی رائے کچھ اور تھی

اور راستے میں جب انھیں ایک مسافر ملا

تو وہ اس سے کسان کی شکایت کرنے لگیں:

”بھلا دنیا میں کسی اور پر بھی ایسا ستم ڈھایا گیا ہوگا جیسا کہ ہم پر؟
یہ کسان ہمارے ساتھ بدسلوکی کرتا ہے،

ہمیں ادھر ادھر ہنکاتا پھرتا ہے، سمجھتا ہے ہم معمولی بطخیں ہیں۔
اس گنوار کو یہ نہیں معلوم ہے۔

کہ ہماری عزت کرنا اس کا فرض ہے،

کیوں کہ ہم ان بطخوں کی ناموسیل سے ہیں

جنہوں نے ایک زمانے میں روم کو دشمنوں سے بچایا تھا

اور جن کی یاد تازہ رکھنے کے لیے ایک تہوار منایا جاتا تھا!

مسافر نے پوچھا: ”مگر آپ کس بنا پر اپنی قدر کرنا چاہتی ہیں؟“

”مگر دیکھیے تو، ہمارے آبا و اجداد۔“ ”جی میں جانتا ہوں،

میں نے یہ سب کتابوں میں پڑھا ہے۔۔۔ میں تو یہ پوچھ رہا ہوں

کہ آپ نے کسی کا کیا بھلا کیا ہے؟“

”حضرت! ہمارے آبا و اجداد نے روم کو بچایا تھا!“

”یہ تو ٹھیک ہے، مگر آپ نے بھی کچھ کر دکھایا ہے؟“

”ہم نے؟۔۔۔ نہیں کچھ نہیں۔“ ”تو پھر آپ میں کون سی صفت ہے؟“

اپنے آبا و اجداد کو آرام کرنے دیجیے،

اُنھوں نے جو کچھ کیا اس کا انہیں اجر ملا،

آپ تو بس پکا کر کھانے ہی کے لائق ہیں!“

اس کہانی کا مطلب اور زیادہ صاف صاف بیان ہو سکتا ہے،

پر میں ڈرتا ہوں کہیں اور بطنیں خفا نہ ہو جائیں!
بھیڑ اور کتے

بھیڑیوں سے بچنے کے لیے بھیڑوں کے ایک گلے نے
بہت سے محافظ کتے رکھے۔

اور انجام کیا ہوا؟ ... کتوں کا ایسا ہجوم ہو گیا
کہ بھیڑیوں سے تو بھیڑیں بچی رہیں،
لیکن کتوں کو بھی تو آخر بھوک لگتی ہی:

پہلے تو انھیں بھیڑوں کے بچے کھلانے جانے لگے،
اس کے بعد باری باری سے بھیڑیں ان کی نذر ہونے لگیں،
آخر میں صرف پانچ چھو باقی بچیں
اور انھیں بھی کتے چٹ کر گئے...

پن چکی والا

ایک پن چکی والے کے حوض سے پانی بہنے لگا۔

یہ کوئی بڑی مصیبت نہ تھی

اگر سوراخ پہلے ہی سے بند کر دیا جاتا۔

لیکن۔ کیا یہ کہنے کی ضرورت ہے۔ پن چکی والے کو اس کی پروا بھی نہ ہوئی،
اور پانی دن بہ دن زیادہ بہنے لگا۔

معلوم ہوتا تھا کوئی گھڑوں میں بھر بھر کر پھینک رہا ہے۔

اے پن چکی والے، کھڑا جمھائی کیا لے رہا ہے؟

ذرا اپنی چیز کی خبر لے؟“
 مگر پن چکی والے نے کہا: ”بھی کون سی مصیبت آپڑی ہے!
 مجھے سمندر بھر پانی تو چاہیے نہیں،
 اور جتنا چاہیے اتنا میرے حوض میں رہتا ہی ہے۔“
 وہ بے فکر رہا اور اس درمیان میں
 پانی مشکوں پہنے لگا۔

اب مصیبت نے پتھر آگھیرا تھا:
 چکی کے ہاٹ چلتے چلتے رک گئے، پن چکی بے کار ہو گئی۔
 تب پن چکی والے کو کام سنبھالنے کی سوجھی، خوب کانکھا، پسینے پسینے ہو گیا،
 اور پانی بچانے کی بسیوں ترکیبیں سوچیں۔۔۔
 وہ پانی کا بہاؤ دیکھنے کے لیے حوض پر کھڑا ہوا تھا
 کہ اتنے میں اس کی مرغیاں بہتے پانی کو پینے پہنچیں۔
 وہ دانت لٹکتا کر چلا یا: ”نکمی! حرام خور! بد معاش!
 میری سمجھ میں نہیں آتا کہ پانی کہاں سے لاؤں
 اور تم مزے میں اسے پیے ڈالتی ہو!“
 اس نے کھینچ کر ان کے ڈنڈا مارا۔ اور سب کو لٹا دیا۔
 لیکن اس سے فائدہ کیا ہوا؟
 پانی پہ چکا تھا، مرغیاں بھی ہاتھ سے گئیں۔
 میں نے اکثر ایسے حضرات دیکھے ہیں

(اور انہیں کی خدمت میں یہ کہانی بطور تحفہ پیش کی جاتی ہے)
 جو فضول چیزوں میں ہزاروں روپے پھینکتے ہیں،
 مگر جلی ہوئی موم بتیوں کے سرے پچالیں
 تو سمجھتے ہیں کہ بڑی کفایت کی،
 اس لیے ان کو اٹھار کھنے کا بڑا اہتمام کیا جاتا ہے۔
 جس گھرانے میں ایسی گرسی کی جاتی ہو
 وہ کیا تعجب ہے کہ ستیا ناس ہو جائے۔

استرہ

سفر میں ایک مرتبہ میرا اور ایک دوست کا ساتھ ہوا
 اور رات کو ہم ایک ہی کمرے میں سوئے۔

صبح سویرے میری آنکھ کھلی تو کیا دیکھتا ہوں
 میرا دوست بڑی سوزت تکلیف میں ہے۔

رات کو ہم منہسی مذاق کی باتیں کرتے بے فکر سوئے تھے،

صبح جو پہلی آوازیں کان میں پڑیں ان سے پتہ چلا کہ اس کی کیفیت کچھ
 اور ہے:

”وہ کبھی چلا اٹھتا ہے، کبھی کراہتا ہے، کبھی ہائے ہائے کرتا ہے!“

”میرے مشفق، تمہیں کیا ہو گیا ہے... کیا تمہارے کہیں درد ہور ہا ہے؟“

”ارے نہیں، میں دائرہ ہی موند رہا ہوں...“

”کیا ہا بس!“ یہ کہہ کر میں اٹھ بیٹھا۔ دیکھتا کیا ہوں: میرا مسخرہ

آئینے کے سامنے کھڑا ہوا، آنکھوں میں آنسو ہیں اور ایسی بھیاں تک نکلیں بنا رہا ہے۔
کہ گویا اس کی کھال کھینچی جا رہی ہے۔۔۔

جب مجھے داؤد پلا کا سبب معلوم ہوا

تو میں نے کہا، ”کوئی تعجب نہیں، تم تو اپنے اوپر ظلم کر رہے ہو!
ذرا مہربانی کر کے دیکھو تو۔“

مٹھارا اُسترہ اُسترہ نہیں کلبھاڑی ہے!

تم اس سے ڈاڑھی نہیں مونڈ سکتے، صرف اپنے آپ کو تکلیف پہنچا سکتے ہو۔
”ارے بھئی، میں بھی جانتا ہوں میرے اُسترے سب کُند ہیں!

میں ایسا بیوقوف نہیں ہوں کہ اتنی سی بات بھی نہ سمجھوں۔۔۔

لیکن میں ڈرتا ہوں کہ تیرا اُسترے سے کہیں کھال نہ کٹ جائے!“
”مگر، میرے دوست، میں تو یہ کہوں گا

کہ کُند اُسترے سے کھال کٹ جانے کا اندیشہ زیادہ ہے۔

تیرا اُسترے سے حجامت بہت اچھی بنے گی۔

بس اسے استعمال کرنا سیکھ لو!“

میں اس کہانی کا مطلب اور واضح کیے دیتا ہوں:

کیا ایسے بہت سے لوگ نہیں ہیں، چاہے وہ اس کا اقرار کرتے ہوئے
شرمائیں

جو سمجھ دار آدمیوں سے ڈرتے ہیں

اور صرف بیوقوفوں کی صحبت گوارا کر سکتے ہیں۔

تماشائی

”ارے یار! کہو اچھے رہے؟ کہاں سے آرہے ہو؟“

”بھئی میں تو عجائب خانے گیا تھا۔ تین گھنٹے تک وہاں گھومتا رہا، سب کچھ دیکھ آیا، خوب جی بھر کر دیکھا۔ تم تو مانو گے نہیں، لیکن مجھے تو وہاں کی عجائبات نے ایسا حیرت میں ڈال دیا کہ بیان نہیں کر سکتا! سچ کہتا ہوں، وہاں عجائبات سے کمرے بھرے پڑے ہیں!

قدرت نے بھی کیا کیا ایجادیں کی ہیں!

کیسے کیسے جانور، کیسے کیسے پرند دیکھنے کو ملے!

کیسی کیسی تتلیاں، پتنگے مارنگین کیڑے مکوڑے، نکھیاں، جھینگر، کوئی زردی رنگ کا، کوئی جیسے مونگا۔

ایسے ننھے ننھے جھنگے جیسے آپس کا سر!

مگر یہ تو بتاؤ، تم نے وہاں ہاتھی کو بھی دیکھا؟ وہ بھلا کیا

ہوتا ہے؟

میں سمجھتا ہوں اُسے دیکھو تو معلوم ہو کہ جیسے کوئی پہاڑ سانے

آگیا!

”کیا وہاں ہاتھی بھی ہے؟“

”ہاں ہے!“

”پھر تو مجھ سے چوک ہوئی، ہاتھی مجھے دکھائی نہیں دیا!“

روسی ڈراما

پہلا باب

روس میں مغربی تہذیب کی نقل کے سلسلے میں ڈراما دیکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ شروع میں یہ شاہی خاندان اور درباریوں تک محدود تھا اور پیتراغظم کا باپ ماسکو کے چند جرمن باشندوں سے ڈرامے لکھوا کر دربار میں متاثر کراتا تھا۔ ان جرمن ادیبوں کے علاوہ اس دور میں ایک روسی عالم پولوٹسکی کا نام بھی ڈراما نویسوں میں ملتا ہے اور اس کے چند مذہبی ڈرامے اب تک موجود ہیں۔ لیکن اس فن کو رائج کرنے کی کوشش قبل از وقت تھی، اور قدامت پسند امیروں اور درباریوں نے اسے جائز دیکھیوں میں شامل نہیں ہونے دیا۔ جب پیتراغظم تخت پر بیٹھا اور اسے ریاست پر کافی تسلط حاصل ہو گیا تو اس نے جرمنی سے ایکٹر بلوائے اور خود ان کے رہنے سہنے کا انتظام کیا (۱۸۰۲ء)۔ پہلے ماسکو میں ایک ٹھیٹر قائم ہوا جو بعد کو پیتراغظم کے بے دارالسلطنت میں منتقل کر دیا گیا، اور رفتہ رفتہ ناظرین کے شوق اور دل چسپی کے ساتھ ٹھیٹروں اور ایکٹروں کی تعداد بڑھتی رہی۔ ان ٹھیٹروں میں

جو ڈرامے دکھائے جاتے تھے وہ زیادہ تر جرمن ڈراموں کی نقلیں یا ترجمے ہوا کرتے تھے اور ان کے ایکٹربھی اکثر غیر قوموں کے لوگ ہوتے تھے، ۱۷۵۰ میں چند لوگوں نے مل کر قصبہ یاروسلافل میں ایکٹروں کی جماعت بنائی اور انھیں کوروس کے پہلے دیسی ایکٹر سمجھنا چاہیے۔ قائم ہونے کے چھو سال بعد ملکہ ایلزبتا کے حکم سے یہ جماعت پیربرگ بلالی گئی، اسے "شاہی ٹھیٹر" کا خطاب دیا گیا اور ریاست نے باقاعدہ اس کی سرپرستی شروع کر دی۔

ملکہ کیتھرین دوم (۱۷۶۲-۱۷۹۶) کو تمام فنون لطیفہ کا بہت ذوق تھا، اور انشا پر دازی میں وہ طبع آزمائی بھی کیا کرتی تھی۔ اس کے عہد میں ٹھیٹر کو بہت فروغ ہوا اور سوارو کوف نے متعدد ڈرامے لکھ کر دکھانے کے واسطے بھی بہت سامان ہتیا کر دیا۔ اس زمانے کے ایکٹروں اور ڈراموں پر تنقید نہ کی جائے تو بہتر ہے۔ فرانس کی تقلید میں سارے تعلیم یافتہ روسی ایسے دیوانے ہو گئے تھے کہ ڈراما اور ایکٹنگ میں فرانسیسی طرز کے سوا ان کی نظروں میں کچھ حجتا نہیں تھا، اور مصنوعی، بے جان فرانسیسی طرز کی نقل کر کے انھوں نے اپنا معیار بہت گرا دیا۔ تقلید کے مرض نے انتہا کو پہنچ کر ایک حد تک خود اپنا علاج کیا اور ملکہ کیتھرین کے عہد ہی میں بے تکی تقلید کے مخالفت اپنی آواز بلند کرنے لگی۔ کنیاژنن (۱۷۴۲-۱۷۹۱) اور اوزے روف (۱۷۶۹-۱۸۱۶) نے فرانسیسیوں کی نقل تو نہیں چھوڑی مگر انھوں نے

روس کی زندگی کو اپنا موضوع بنایا اور یوں روس کے پہلے حقیقت نگار ڈراما نویس دے نیس فون ویزن (۱۷۹۲ - ۱۷۴۴) کے لیے میدان تیار ہو گیا۔

دے نیس فون ویزن کا خاندان جرمنی سے آکر روس میں آباد ہوا تھا، لیکن فون ویزن کی پیدائش تک وہ بالکل روسی ہو گیا تھا اور جو دولت اس کے پاس تھی وہ بھی زیادہ تر گنوائی جا چکی تھی۔ ۱۷۶۲ میں فون ویزن نے تعلیم ختم کر کے وزارت خارجہ کے ایک دفتر میں نوکری کر لی، جہاں اسے فرانسیسی اور لاطینی زبان سے کاغذات کا ترجمہ کرنا ہوتا تھا۔ نوکری ہونے کے دو سال بعد ہی اس نے اپنا پہلا ڈراما "فوجی افسر" شایع کیا اور اگر وہ اپنی تصانیف کا سلسلہ جاری رکھتا تو وہ روس کی ادبی دنیا پر آسانی سے چھا جاتا، کیوں کہ "فوجی افسر" کو جس نے پڑھا اس نے بہت پسند کیا۔ لیکن فون ویزن کو ملازمت میں بہت ترقی ہوئی، وہ امیرانہ زندگی بسر کرنے لگا، کئی سال پورے کا سفر کرتا رہا، اور یوں "فوجی افسر" کے بعد اٹھارہ سال تک اس نے کوئی ڈراما نہیں لکھا۔ لیکن جب فون ویزن نے اپنا دوسرا ڈراما "پیرنا بلخ" شایع کیا اور وہ ایسٹ پر دکھایا گیا تو اس کی ایسی دھوم مچی جس کا آج کل اندازہ کرنا مشکل ہے۔ "پیرنا بلخ" اس کا لازماً تھا اور اس کی آخری تصنیف بھی۔ ایک خاص قسم کی کیفیت، جو معلوم نہیں کہ مذہب کے اثر سے پیدا ہوئی یا کوئی بیماری تھی، اس کے ذہن پر

بھوت کی طرح سوار ہو گئی اور اس کی صحت عیاشی کی نذر ہوئی۔ موت سے بہت پہلے اس کی زندگی بے مصرف ہو چکی تھی۔

اس زمانے کا تقاضا تھا کہ روسی سوسائٹی پر تنقید کی جائے اور فون دیزن نے اپنے دونوں ڈراموں میں تنقید اور طنز سے رنگ پیدا کیا۔ اس نے یہ طرز بلاوجہ نہیں اختیار کیا، اس کا خیال تھا کہ مغربی قوموں کا دن ڈھل رہا ہے، اور روس میں ابھی صرف افق پر ڈرامی سُرخی نئے دن اور تازہ زندگی کی پہلی جھلک دکھا رہی ہے۔ ہم شروع کر رہے ہیں، وہ خاتمے کے قریب ہیں۔ مستقبل ہمارا ہے اور ہم اپنی قومی زندگی کو جو شکل چاہیں دے سکتے ہیں، اس عقیدے نے فون دیزن کے طنز کو اور بھی بے باک کر دیا اور روسیوں میں خود داری پیدا کرنے کی آرزو کو اور بھی گرمادیا۔ "فوجی افسر میں اس نے اپنے زمانے کی فرانس پرستی اور اس تربیت کا مذاق اڑایا ہے جو فرانس پرستی نے رائج کرائی تھی، اس ڈرامے کا ہیرو اوانشکا اس زمانے کے نوجوانوں کا ایک مثالی نمونہ ہے، اور اسے پیش کرنے کا مقصد والدین کو بیدار کرنا اور نوجوانوں کو عبرت دلانا ہے۔ اوانشکا نے جس اسکول میں تعلیم پائی اس کا بانی، منتظم اور ہیڈ ماسٹر ایک فرانسیسی ہے جو پیرس میں کرایے کی گاڑی چلاتا تھا، اور روس میں آکر عالم اور مدرس بن گیا۔ اس مدرسے سے فارغ ہو کر اوانشکا پیرس گیا، وہاں اوباشوں کی صحبت میں پڑ کر بازاری زندگی کی راہ و رسم سیکھی اور روس واپس ہوا تو اپنی

قابل رشک تربیت کی بنا پر ناز نخرے کرتے لگا۔ والپی کے بعد باپ سے اس کی جو پہلی گفتگو ہوتی ہے اس کا ایک حصہ ملاحظہ ہو:-

فوجی افسر (اوانشکا کا باپ) سن رے، اوان، بچپن سے اب تک میری نظر شرم سے بہت کم نیچی ہوئی ہے لیکن تو نے تو مجھے ایسا شرمندہ کر رکھا ہے کہ جی چاہتا ہے زمین میں دھنس جاؤں اوانشکا: ابا جان، میں کیسے گوارا کر سکتا ہوں کہ آپ لوگ کسی روسی لڑکی سے میری شادی کر دیں۔

فوجی افسر: مگر تو فرانسیسی کیسے بن بیٹھا؟ کیا تو روس میں نہیں پیدا ہوا تھا؟

اوانشکا: میرا جسم روس میں پیدا ہوا مگر میری روح شاہ فرانس کی تابعدار ہے... مجھے آپ کے عہدے اور آپ کی عزت آبرو سے کوئی واسطہ نہیں، میں اس کا لحاظ کرنے پر تیار نہیں، خصوصاً جب آپ یہ بھول جاتے ہیں کہ میں دنیا کی سیر کر آیا ہوں، پیرس میں رہ چکا ہوں۔

فوجی افسر: بھلا یہ بھول جانا کسی کے بس کی بات ہے؟ جناب من، ہر لمحے آپ کی کوئی نہ کوئی نئی حماقت اس کی یاد تازہ کر دیتی ہے اور آپ کی حماقتیں ایسی ہیں کہ اگر آپ فوج میں ہوتے تو آپ کی سب سے ادنیٰ حماقت کی سزا میں آپ کی نازک پیٹھ پر کوڑے لگتے۔

اوانشکا: ابا جان، آپ تو ہر وقت اسی خیال میں رہتے ہیں کہ آپ کے سپاہیوں کی ایک قطار کھڑی ہو اور آپ کمان دے

رہے ہیں۔ آخر اس قدر چلانے کی ضرورت کیا ہے؟

فوجی افسر: ٹھیک کہتا ہے، چلانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ لیکن تو نے مجھے پھر تنگ کیا تو تیری پیٹھ پر کم از کم سو روسی ڈبے

رسید کروں گا۔ سمجھا؟

اوانشکا: جی سمجھا... میرے خیال میں اگر آپ کی کسی جنگل میں ایک

ریچھ سے ٹڈ بھڑ ہو جائے تو وہ آپ کے ساتھ ویسا ہی

سلوک کرے جیسا آپ میرے ساتھ کر رہے ہیں۔

فوجی افسر: کیا بد زبان لوند اہر! ہاپ کو ریچھ سے تشبیہ دیتا ہے۔

کیا میری صورت ریچھ کی سی ہے؟

اوانشکا: مشابہت کا کوئی سوال نہیں۔ میں نے تو بس اپنا خیال

صاف صاف ظاہر کر دیا ہے۔ میری طبیعت ہی کچھ ایسی

صاف گو واقع ہوئی ہے۔

فرانس پرستی ہی روسی سماج کا روگ نہیں تھی کوئی سمجھ دار

روسی اس سے انکار نہیں کر سکتا تھا کہ قدامت پسند حلقوں میں

جمالت اور تنگ نظری کی کوئی انتہا نہ تھی اور ان لوگوں کی اصلاح

کرنا اتنا ہی ناگزیر تھا جتنا فرانس کے مقلدوں کا دماغ درست کرنا۔

فون ویزن نے اپنے دوسرے ڈرامے "پیرنا بالغ" میں قدیم طرز کے

ایک گھرانے کی تصویر دکھائی ہے اور پُرانے فلسفہ حیات اور طرز
 معاشرت کا بھرم کھول دیا ہے۔ ڈرامے کا تہیر و متر و فان ایک سولہ
 سترہ برس کا نوجوان ہے جس کی دماغی حالت چھو سات سال کے بچے
 کی سی ہے، اسے اپنی طبیعت پر بالکل قابو نہیں اور اپنی تربیت کی
 وجہ سے وہ انسانیت کی تمام فضیلتوں سے بالکل محروم رہ گیا ہے۔
 اس کی ماں پر دستکودا کو حکومت کی ایسی ہوس ہے کہ وہ اسے یا
 اس کے باپ کو کسی قسم کی آزادی دینا گوارا نہیں کر سکتی، شوہر کو
 اس کی ڈانٹ ڈپٹ نے ایسا سہا دیا ہے کہ وہ کسی معاملے میں رائے
 رکھنے کا حوصلہ ہی نہیں کرتا، اور متر و فان کو اس کے دلارنے چھیننا
 اور احمق بنا دیا ہے۔ پر دستکودا کے گھر کی حالت ڈرامے کے پہلے دو
 سین سے معلوم ہو جاتی ہے۔

پہلا سین

متر و فان، پر دستکودا اور ایک خادمہ متر و فان ایک تازہ
 سلا ہوا کفتان پہنے ہے۔

پر دستکودا: کفتان بالکل چوہٹا ہو گیا ہے (خادمہ سے) اے ری،
 جا ذرا اس بد معاش تریٹکا کو بلا تو لا! مونے چوٹے نے
 کفتان بالکل تنگ کر دیا ہے متر و فان بیٹے، میں تو سمجھتی
 ہوں تمہارا اس میں دم گھٹ رہا ہوگا۔ چہ بچارہ!

لہ کفتان یا کفتان ایک طرح کا کوٹ جو اچکن سے بہت ملتا تھا۔

جاؤ، ذرا اپنے ابا جان کو بلا لاؤ۔ (متر و فان چلا جاتا ہے)

دوسرا سین

پر دستکوا، تریشکا، خادمہ۔

پر دستکوا: ابے گدھے، ادھر آ... میں نے تجھ سے کہہ دیا تھا کہ گفتان

ذرا ڈھیلا سینا، ایک تو بچہ ابھی خدا کے فضل سے بڑھ

رہا ہے، دوسرے اسے تنگ کپڑے پہننا نہیں چاہئیں،

اس کا بدن بہت نازک ہے۔ پھر بتا تو نے گفتان کیوں

تنگ کر دیا۔

تریشکا :- بی بی آپ تو جانتی ہیں میں درزی نہیں ہوں، آپ

کے حکم سے سینا شروع کیا ہی میں نے تو پہلے ہی عرض

کیا تھا کہ گفتان کسی اچھے درزی سے سلوائے۔

پر دستکوا: تو کیا گفتان سینے کے لیے درزی ہونا ضروری ہے؟

تیری بھی کیا گائے بھینس کی سی سمجھ ہے!

تریشکا :- مگر سرکار درزی اپنا کام سیکھتے ہیں، میں نے تو کبھی کچھ

سیکھا نہیں۔

پر دستکوا: تو تو بس اپنی رٹ لگائے ہی۔ ارے یہ تو بتا کہ اگر ایک

درزی نے دوسرے سے سیکھا تو آخر دنیا میں جو سب

سے پہلا درزی تھا اُسے کس نے سکھایا؟

تریشکا :- اگر اُسے کسی نے سکھا یا نہیں تو وہ گفتان مجھ سے بھی بڑے

سیتا ہوگا۔ (مستروفان دوڑتا ہوا اندر آتا ہے)
 مستروفان: ابا جان کو بلا آیا ہوں۔ اُنھوں نے فرمایا: ابھی آتا ہوں۔
 لیجیے وہ آ بھی گئے۔ (پرستکوف ڈرتے ڈرتے داخل
 ہوتا ہے)

پرستکوف: یہ تم آخر مجھ سے چھپے چھپے کیوں رہتے ہو؟ ...
 دیکھو سرکار، آپ کی طبیعت کی ترمی نے مجھے کیا دن
 دکھائے ہیں۔ دیکھو ماموں کی منگنی کے دن بھانجے
 کو کس شان کا کفتان پہننا نصیب ہوا ہے! دیکھو تریشکا
 نے کیا نفیس کفتان سیاہی!

پرستکوف: (خوف سے پیچھے ہٹتے ہوئے) ہاں، کچھ ڈھیلا ہے۔

پرستکوف: میں عقلمند، آپ خود ڈھیلا ہیں۔

پرستکوف: مگر میں تو سمجھا تھا کہ آپ کا بھی یہی خیال ہے۔

پرستکوف: مگر تم خود کیا اندھے ہو گئے ہو؟

پرستکوف: آپ کی موجودگی میں میری آنکھیں نہیں دیکھتی ہیں۔

پرستکوف: یا اللہ، مجھے بھی کیا شوہر ملا ہے! اتنی بھی سمجھ نہیں

کہ ڈھیلا اور تنگ میں تمیز کر سکے۔

پرستکوف: مجھے ہمیشہ آپ کی رائے پر اعتبار رہا ہے اور رہے گا

پرستکوف: جی، تو پھر یہ بھی سمجھ لیجیے کہ میں ان لونڈی غلاموں کو

سرنہ جڑھاؤں گی۔ جاتیے، اس لڑکے کو فوراً سزا دیجئے

(سکوئی نن، پروستکووا کا بھائی داخل ہوتا ہے)۔

سکوئی نن: کسے سزا دیجیے؟ کیوں؟ خاص میری منگنی کے دن؟

بہن، آپ سے التجا کرتا ہوں کہ سزا کو منگنی کے بعد تک

ملتی رکھیے... میرا نام تراں سکوئی نن نہیں اگر میں

کبھی کسی کو سزا دینے میں تامل کروں، اس معاملے میں

بہن میری آپ ہی کی سی عادت ہے۔ لیکن آپ خفا

کس بات پر ہوئیں؟

پروستکووا: دیکھو بھیا، تمہاری آنکھوں کے سامنے ہے۔ متر دفان

پیارے، ادھر آؤ۔ دیکھو بھیا، یہ کفتان ڈھیلا ہے؟

سکوئی نن: نہیں۔

پروستکووا: مگر بیگم میں نے تو خود کہا تھا تنگ ہے!

سکوئی نن: مجھے تو وہ تنگ بھی نہیں معلوم ہوتا۔ کفتان تو بھی نہیں

نفیس سلا ہے۔

پروستکووا: (تریشکا سے) دور ہو، مردود! (خادم سے) جا بچے

کو ناشتہ کھلا، اس کے استاد آتے ہوں گے۔

”پیرنا بالغ“ کی ہیروئن پروستکووا کی ایک رشتے کی بھتیجی سونیا

ہی، جو اپنے والد کے انتقال کے بعد پروستکووا کے یہاں رہنے لگی اور

وہیں اس نے تربیت پائی۔ سکوئی نن کی منگنی جس کا اوپر ذکر آیا

ہے، اسی کے ساتھ ٹھہری تھی۔ ڈرامے کا اصل قصہ اس وقت سے

شروع ہوتا ہے جب پر دستکو وا کو خبر ملتی ہے کہ سوفیا کو ورثے میں دس
 ہزار روپے نقد اور ایک جائیداد ملنے والی ہے۔ سوفیا کے ساتھ اس کا
 برتاؤ ہمیشہ سے خراب تھا، لیکن یہ خبر سنتے ہی وہ اس پر نہایت
 مہربان ہو جاتی ہے اور کوشش کرتی ہے کہ وہ سکوتی نن کی بجائے
 متردفان سے شادی کرے۔ سکوتی نن کی ساری عمر سو رہا لے
 گزری ہے، اور سوروں کے سوا وہ کسی موضوع پر گفتگو نہیں کر سکتا،
 لیکن روپے کے لالچ میں سوفیا سے اس کا برتاؤ نہایت نیاز مند
 ہو جاتا ہے اور وہ خاندان والوں کو اس پر مجبور کرنا چاہتا ہے کہ سوفیا
 کی اس سے شادی کر دی جائے۔ بہن اور بھائی میں اپنی اپنی غرض
 پوری کرنے کے لیے جو مقابلہ ہوتا ہے اور ایک دوسرے کو زچ کرنے
 کو وہ جو چالیں چلتے ہیں نہایت مضحکہ خیز ہیں۔ مگر بچاری سوفیا
 مصیبت میں پھنس جاتی ہے۔ اتفاق سے اس کا چچا ستارہ دوم اس
 موقع پر آ پہنچتا ہے اور سوفیا کو پناہ مل جاتی ہے۔ ستارہ دوم کے
 سامنے پر دستکو وا اور سکوتی نن کے کچھ بنائے نہیں بنتا، اور آخر
 میں سوفیا اسی کے مشورے سے ایک خوش اخلاق اور روشن خیال
 نوجوان سے شادی کر لیتی ہے۔ پر دستکو وا کی ناکامی اس کی تباہی
 کا پیش خیمہ ہوتی ہے، کیوں کہ جائیداد کو ساہوکاروں سے بچانے کی
 یہی صورت تھی کہ متردفان کی کسی امیر لڑکی سے شادی ہو جائے۔
 سکوتی نن مایوس ہو کر بھراپنے سوروں میں جا بیٹھتا ہے۔

”پیرنا بالغ“ کا موضوع نہایت مناسب ہے اور اس کے اکثر کیرکٹر اس کے زمانے کے روسیوں کی سچی تصویریں ہیں۔ لیکن مصنف نے واقعات کا سلسلہ ختم کرنے کے لیے بیان میں بہت عجلت کی ہے جو کبھی کبھی ناگوار معلوم ہوتی ہے اور ڈرامے کے بعض کیرکٹر اس طرح عین موقع پر نمودار ہوتے ہیں کہ ڈرامے کی حقیقت نگاری میں شبہ پیدا ہو جاتا ہے۔ نئے خیالات کی تبلیغ بھی جس انداز سے کی گئی ہے وہ ”پیرنا بالغ“ کو بحیثیت ڈرامے کے کم زور کر دیتی ہے اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف کو اپنے قدر دانوں سے اس کی اُمید نہیں تھی کہ وہ اشارے اور کنایے سے بات سمجھ لیں گے اور سب کچھ تفصیل سے کہنے پر مجبور تھا۔ پر دستکو داسکو تین دن اور متردفان روس کے دیہاتی شرفا کی ذہنیت کے عیب دکھانے کے لیے بہت کافی ہیں۔ ان کی سیرت کا نقشہ کھینچنے کے بعد اس کی ضرورت نہیں رہتی کہ اصلاح کی انگ سے ترغیب دلائی جائے۔ لیکن سوفیا کا چچا ستار دوم، جسے فون دیزن نے اپنے خیالات کا منبع بنایا ہے نہایت لمبی لمبی تقریریں کرتا ہے جن سے طبیعت اکتا جاتی ہے اور ڈرامے کا ایک اچھا خاصا کیرکٹر ہماری نظروں سے گر جاتا ہے۔ دراصل ”پیرنا بالغ“ کا کوئی اچھا کیرکٹر اس خوبی سے نہیں دکھایا گیا ہے جیسے پر دستکو داسکو تین دن۔ ہر ایک میں یہ نقص ہے کہ وہ خالص خوبیوں کا مجسمہ بنایا گیا ہے، اور ایک جیتی جاگتی ہستی

نہیں بلکہ مصنف کی ایجاد معلوم ہوتا ہے۔

”پیرنا بلخ“ کے بعد ایک مدت تک کوئی ایسا ڈراما نہیں لکھا

گیا جو صحیح معنوں میں روسی کہا جاسکتا ہے۔ اور نے روف (۱۸۱۶-۱۷۶۹)

کے ڈراموں میں رومانیت کے اثرات نظر آتے ہیں اور اگرچہ رومانیت

بھی روس میں یورپی انشا پردازی کی تقلید میں اختیار کی گئی، اس میں

قومی فطرت اور مذاق کے ظاہر ہونے کی خاصی گنجائش تھی۔ اور نے روف

نے اس وقت جب پولین سے جنگ ہو رہی تھی ایک قومی ڈراما،

”دمیتری دون سکومی“ لکھا، جو نہایت مقبول ہوا، لیکن دراصل ڈراما

اور تاریخ دونوں کے لحاظ سے یہ بالکل مہل ہے۔ کرلیون جس کی کہانیاں

اتنی مشہور ہوئیں، کئی سال تک ڈرامے کے میدان میں طبع آزمائی کرتا

رہا، مگر اس کی طبیعت ڈراما نویس کے لیے بالکل ناموزوں تھی اور

وہ فرانسیسی اور کامیاب روسی ڈراموں کی نقل سے آگے بڑھنے کی ہمت

نہیں کر سکا۔ جو ترقی انیسویں صدی کے پہلے بیس سالوں میں ہوئی وہ

ایکٹنگ اور اسٹیج تیار کرنے کے فن میں ہوئی۔ اس

زمانے میں اچھے ایکٹروں کی ایک خاصی تعداد پتیر برگ اور ماسکو میں پیدا

ہو گئی اور فرانسیسی ڈرامے اور ان کی روسی نقلیں دونوں مقابلتاً بہت

بہتر طریقے سے دکھائی جانے لگیں نیکسپیر کی قدر دانی بھی اسی دور میں

شروع ہوئی اور یوں ایکٹروں کو اپنا کمال دکھانے کے لیے بہت

موقع تھا۔

روسی سوسائٹی کا عکس اتارنے اور روسیوں کو حقیقت سے آگاہ
 کرنے کا بیڑا الکساندر سرگے پوچ گریوے دوف (۱۷۹۵-۱۸۲۹) نے
 اٹھایا۔ ”عقل مندی کی سزا“ حقیقت نگاری اور تنقید کا ایک اعلیٰ نمونہ
 ہے۔ گریوے دوف ایک رئیس خاندان میں پیدا ہوا اور اس نے بہت
 اچھی تعلیم پائی۔ ”عقل مندی کی سزا“ کا خاکہ اس کے ذہن میں طالب
 علمی کے زمانے ہی سے قائم تھا اور اس وقت سے ۱۸۲۴ تک جب ڈراما
 مکمل ہو گیا، وہ اسی کی تصنیف میں مشغول رہا۔ ۱۸۱۲ میں نپولین نے
 روس پر حملہ کیا اور گریوے دوف وطن کو دشمن سے محفوظ رکھنے کے
 لیے فوج میں بھرتی ہو گیا۔ اس نے چار سال فوجی افسر کی زندگی بسر کی،
 یہاں اسے خلاف معمول صحبت بہت اچھی ملی، کیوں کہ وطن پرستی
 کے جوش میں تعلیم یافتہ طبقے کے بہترین نوجوان فوج میں بھرتی ہو گئے
 تھے۔ گریوے دوف نے اس صحبت سے پورا فائدہ اٹھایا اور اس کے
 ڈرامے کے بصیرت افروز خیالات اسی زمانے کی یادگار ہیں۔ ۱۸۱۶
 میں گریوے دوف نے اپنی ماں کے اصرار پر وزارت خارجہ میں
 ملازمت کر لی، اور دو سال بعد روسی سفیر کا سکریٹری ہو کر طہران چلا
 گیا۔ یہاں اس نے فارسی سیکھی، ایران کی خوب سیر کی اور اپنی خوش
 مزاجی اور شرافت کی وجہ سے دربار میں بھی ہر دل عزیز ہو گیا۔ مگر وہ
 بہت سچا اور مخلص، یعنی نہایت ہی خود غرض وطن پرست تھا اور
 ہم وطنوں کی حمایت کے سلسلے میں اسے بہت کچھ کرنا پڑا جو شاہ ایران

اور اس کے دلی عہد عباس مرزا کو بہت ناگوار معلوم ہوا۔ ۱۸۲۱ میں گریبویے
دو فٹ نفلس آیا اور چوں کہ علاج کی غرض سے کچھ عرصے وہیں رہنا تھا اس
لیے اس نے قفقاز کے گورنر کے مشیر کا عہدہ حاصل کر لیا اور یہ خدمت بھی
بہت تن دہی اور سلیقے سے انجام دی۔ کوئی تین سال بعد وہ رخصت
لے کر روس آیا اور اپنے دوستوں کو "عقلمندی کی سزا" جو اس نے نفلس
کے قیام کے دوران میں ختم کر لیا تھا، دکھایا۔ ڈراما بے حد پسند کیا گیا،
لیکن کوشش اور سفارشوں کے باوجود دفتر احتساب نے اسے کھٹیر میں
دکھانے کی اجازت نہیں دی۔ گریبویے دو فٹ رخصت کے بعد نفلس
واپس ہوا ہی تھا کہ پیتر برگ میں ۱۸۲۵ کی مشہور بغاوت ہوئی اور اس
کی گرفتاری کا حکم بھی جاری ہوا۔ اس کی خبر گریبویے دو فٹ کو ایک
دوست کے ذریعے سے مل گئی تھی اور جب پولیس والے تلاشی لینے آئے
تو وہ کل کاغذات جن سے اس کا باغیوں سے تعلق ظاہر ہوتا تھا جلا جکا
تھا۔ پھر بھی وہ گرفتار کر کے پیتر برگ بھیجا گیا اور ایک سال کے قریب
قید رہا۔ قید سے چھوٹا تو وہ قفقاز میں اپنے پُرانے عہدے پر دوبارہ
مامور ہو گیا اور روس اور ایران کی جنگ میں جو اسی زمانے میں چھڑ گئی
اس نے بہت حصہ لیا۔ جنگ کے ختم ہونے پر وہ روس کی طرف سے
صلح کے شرائط منظور کرانے کو ایران بھیجا گیا۔ ان شرائط نے ترکمان
چائی کے صلح نامے کی صورت اختیار کی جس کے رو سے ایران کے
ایک بہت زرخیز علاقے پر روس کا قبضہ ہو گیا اور اس کو ایران کے

انڈرونی معاملات میں دخل دینے کا حق بھی حاصل ہو گیا۔ صلح کے بعد گریجویٹے دو فونچند مہینے کے لیے روس آیا اور پھر روسی سفیر کی حیثیت سے طہران گیا۔ اسے معلوم تھا کہ عباس مرزا، شاہ ایران، ترکمان چائی کے صلح نامے کا بدلہ ضرور لے گا اور وہ طہران یہی سمجھ کر گیا تھا کہ شاید ہی زندہ واپس آنا ہو۔ چنانچہ ہوا بھی ایسا ہی۔ ایک روز شہر کے غنڈوں کی ایک فوج نے اس کے مکان کو گھیر لیا اور انڈرگھس کر اسے مار ڈالا۔ سرکاری ملازمت کی وجہ سے گریجویٹے دو فون کو ادبی مشاغل کے لیے بہت کم مہلت ملتی تھی۔ ”عقلندی کی سزا“ کے علاوہ اس نے صرف ایک ڈراما اور لکھا جس کا آخری حصہ گم ہو گیا ہے۔ اس وقت اس کی نسبت صرف اتنا کہا جاسکتا ہے کہ جن لوگوں نے پورا ڈراما پڑھا ان کا بیان ہے کہ وہ بہت اچھا تھا۔ گریجویٹے دو فون کی قبل از وقت موت سے روسی ادب کو بہت نقصان ہوا، مگر اس کا نام زندہ رکھنے کو ”عقلندی کی سزا“ بہت کافی ہے۔

یہ ڈراما نظم میں ہے، لیکن روسی نقاد سب اس پر متفق ہیں کہ نظم میں ہونے کے باوجود وہ ماسکو کی عام بول چال کی زبان کا بہترین نمونہ ہے۔ اس کی ظرافت بھی بے مثل ہے اور اس کی ہر دل عزیز می کا بہترین ثبوت یہ ہے کہ اس کے سینکڑوں فقرے مدتوں تک ہر روسی کی زبان پر رہے۔ اس کا قصہ بھی ایسا ہے جسے صرف اس زمانے کی نہیں بلکہ ہر وقت اور تقریباً ہر قوم کے تعلیم یافتہ اور خوش حال طبقے کی

زندگی کا آئینہ کہا جاسکتا ہے اور دیکھنے والا اس کے کیر کٹر ہر جگہ دیکھ
سکتا ہے۔ فاموسوف، جو کسی محکمے میں ایک اعلیٰ عہدہ دار ہے، ہر وقت
اپنی لڑکی سوفیا کے واسطے شوہر کی تلاش میں رہتا ہے اور یہ فرض اس پر
بہت گراں گزرتا ہے۔ اس کی لڑکی سوفیا کو مگر کسی بات کی فکر نہیں
رات کو دیر تک وہ عشق کے فسانے اور جذبات کو بھڑکانے والے
فرانسیسی ناول پڑھتی رہتی ہے، دن کے دوپہر گزر جاتے ہیں تو سوکر
اٹتی ہے اور لوگوں سے ملنے ملانے چلی جاتی ہے۔ اس کی کل روحانی ضرورت
ناولوں کے مطالعے سے پوری ہو جاتی ہیں اور جب جی چاہتا ہے تو
تو وہ اپنے باپ کے سکرٹری مولچالین کو دل بہلانے کے لیے اپنے
پاس بلا لیتی ہے۔ مولچالین کو اس سے کوئی محبت نہیں، وہ صرف
اپنی ترقی کے واسطے ضروری سمجھتا ہے کہ اپنے آقا کی لڑکی کو خوش
رکھے۔ اس وجہ سے وہ سوفیا کے کمرے میں جا کر بیٹھتا ہے اور عجز و
نیاز کی باتیں کرتا ہے مگر موقع ملتا ہے تو سوفیا کی عادیہ لیزا کو پیار
کرنے کی کوشش کیا کرتا ہے۔ فاموسوف کے ملنے والوں میں ایک فوجی
افسر سکا لوزوب ہے، جس سے وہ اپنی لڑکی سوفیا کی شادی کرنا
چاہتا ہے، مگر سکا لوزوب سوفیا کو ایک آنکھ نہیں بھاتا، کیوں کہ
وہ ہر وقت فوجی معاملات پر گفتگو کرتا رہتا ہے اور فوجی معاملات
کے سوا اور کچھ اس کی سمجھ میں آتا نہیں۔ سکا لوزوب کے علاوہ
فاموسوف کے اور بہت سے معزز لوگوں سے مراسم ہیں، بیگم

تو گواہوں نے سکی، جن کی چھوڑ لڑکیاں ہیں اور جو ہر شخص کو اس نظر سے
دیکھتی ہیں کہ وہ ان کا داماد بن سکتا ہے یا نہیں، ان کے یہاں اکثر
آتی ہیں، اسی طرح زگورٹسکی، رے پے تی لوف، وغیرہ بھی جو
ملازم ہیں اور ترقی کی ترکیبیں سوچتے رہتے ہیں۔ اس گروہ میں
جہاں ہر شخص کی نظر محدود اور خیالات تنگ ہیں، ڈراما کا ہیرو
چاٹسکی پہنچ کر ایک طوفان برپا کر دیتا ہے۔ وہ بچپن میں سو فیہا کے ساتھ
کھیلا کرتا تھا، سو فیہا سے اسے محبت تھی، لیکن کچھ صحت کے خیال
سے اور کچھ سیر و سیاحت کے شوق میں زیادہ تر ماسکو اور اپنے
بچپن کے ماحول سے دور رہا، اور کئی سال غائب رہنے کے بعد
اس ارادے سے واپس آیا ہے کہ اگر ممکن اور مناسب ہو تو سو فیہا
سے شادی کر لے۔ اپنے ہم وطنوں کی تنگ نظری اور غفلت سے
اسے شکایت پہلے سے تھی، مگر اس مرتبہ یہ قومی عیب اس کو
ناقابل برداشت معلوم ہونے لگے اور اس کی زبان، جو ہمیشہ سے
تیز اور اس کے قابو سے باہر تھی، عیب جوئی کرنے اور زہر اگلنے سے
ایک لمحہ بھر بھی باز نہیں رہتی۔ پہلے ہر جگہ سب اس کی آؤ بھگت
کرتے ہیں، کیوں کہ وہ رئیس ہے، اور اس کی شادی نہیں ہوئی ہے، مگر
اس کی زہر ملی اور خطر ناک باتیں سب کو بہت جلد نیرا کر دیتی ہیں۔
چاٹسکی خود برداشتہ خاطر ہی اور جب اسے سو فیہا کے چال چلن کی
خبر ہو جاتی ہے تو ماسکو کی زندگی سے اس کا آخری رشتہ ٹوٹ جاتا ہے۔

ڈرامے کے آخر میں، جب فاموسوف نے ایک دعوت دی ہے اور اس کے تمام دوست آشنا جمع ہیں، چاٹسکی ایک لمبی تقریر میں اپنی ساری نفرت اور بیزاری بیان کر کے چل کھڑا ہوتا ہے اور ارادہ کر لیتا ہے کہ پھر کبھی ماسکو کی صورت نہ دیکھوں گا۔ فاموسوف کے ہمان، جو چاٹسکی کا مطلب نہیں سمجھ سکے ہیں اور اس کے اچانک غائب ہوجانے کی اصل ہیں، اس کی تاویل یوں کرتے ہیں کہ اسے پولیس نے گرفتار کر لیا ہے اور پھر مبالغہ غلط فہمی اور غیبت کا شوق ایک حیرت انگیز طریقے سے انھیں یقین دلا دیتا ہے کہ چاٹسکی دیوانہ ہو گیا ہے۔

ہنڈب اور تعلیم یافتہ لوگوں میں ایک ایسے شخص کا جو بلند حوصلہ روشن ضمیر اور بیدار دل ہے، بلاوجہ دیوانہ قرار پانا مصنف کی طرف سے ان لوگوں کی ایسی سخت تنقید ہے جس کے مقابلے میں خود چاٹسکی کے اعتراض ہلکے اور معمولی نظر آتے ہیں۔ اس کے بعد چاٹسکی کی عذر خواہی کرنا ضروری نہیں۔ لیکن چاٹسکی کے خیالات اور اس کی ہمت کی داد دیتے ہوئے ہمیں اس کی اپنی خامیوں سے چشم پوشی نہیں کرنا چاہیے، اور مصنف کا مقصد بھی یہ نہیں معلوم ہوتا کہ ہم ایسا کریں۔ چاٹسکی کا معیار بلند ہے، اس کے خلوص سے انکار نہیں کیا جاسکتا، اس کا درد سچا اور دل سوز ہے، مگر اس کے خیالات کا تعمیری پہلو بہت کم زور ہے، وہ سب کچھ درہم برہم کرنے پر تکیا ہوا ہے، کچھ بنا کر کھڑا کرنے کا اہل نہیں۔ اس نے ارادہ کر لیا ہے

کہ نوکری، خوشامد، خود پسندی اور حیوانی سکون سے اپنی زندگی کو پاک رکھوں گا، مگر اس کی زندگی بس ایک صاف مکان ہے جس میں رہتا کوئی نہیں۔ گریجویٹے دو ف اپنے ہیرو کی اس کم زوری سے بخوبی واقف ہے اور جس طرح چاٹ سکی کے اعتراض عبرت انگیز اور دل افروز ہیں، اسی طرح اس کی خامیاں بھی حقیقت کی ایک بن آموز اور پُرور تصویر بن جاتی ہیں۔ جس حقیقت کو یہ ڈراما واضح کرتا ہے دراصل یہ ہے کہ روسی سوسائٹی کے معترض اور مصلح اتنے ہی بے بس اور مجبور ہیں جتنے کہ وہ لوگ جو ان کی نظافت اور طنز کا تختہ مشق ہوتے ہیں، اور یہی حقیقت کی وہ تصویر ہے جسے دیکھ کر ہنسی بھی آتی ہے اور رونا بھی آتا ہے۔

”عقل مندی کی سزا“ کی تصنیف کے بعد سے ۱۸۳۵ تک جب گوگول کا ڈراما ”انسپیکٹر جبریل“ شایع ہوا، ڈراما نویس کا کوئی اچھا نمونہ نہیں ملتا۔ لیکن کے ”بورس گو دو نو ف“ میں شاعرانہ خوبیاں بہت ہیں، مگر ڈرامے کی حیثیت سے وہ بہت معمولی ہے۔ گوگول کے ڈراموں کا اس کی تصانیف کے سلسلے میں پہلے ذکر آچکا ہے، اس کی خصوصیت جس کا روسی ٹھیٹر اور ناٹک کے فن پر بہت گہرا اثر ہوا، یہ تھی کہ اس نے ایکٹروں کا ایک دوسرے سے اور ان سب کا ڈرامہ نویس سے ایسا تعلق قائم کرنے کی کوشش کی جس سے ڈرامے کا مطلب، اس کی خوبیاں اور باریکیاں پوری طرح سے

ظاہر ہو سکیں، ایکٹر بجائے اپنا اپنا کمال دکھانے کے ڈرامے کی خاص فضا پیدا کرنے کی طرف متوجہ ہوں، اور مختلف کیرکٹروں کی ہم آہنگی ان کا معیار بن جائے۔ ”عقل مندی کی سزا“ کو تو بہت عرصے تک محکمہ احتساب نے اسٹیج پر دکھانے کی اجازت نہیں دی، لیکن گوگول کے ڈرامے اور بیرونی ڈراما نویسوں کے چند منتخب کارنامے ماسکو میں ایک ایسے ٹھیٹر کا کام چلانے کے لیے کافی تھے جس نے گوگول کے معیار کو اختیار کیا تھا۔ ایکٹروں کو اس تیاری کی بہت ضرورت تھی، کیوں کہ گوگول کے بعد جو ڈراما نویس پیدا ہوا اس کے ڈراموں کا حق ادا کرنا کوئی آسان کام تھا۔

دوسرا باب

اوس تروفنگی

فن ڈراما نویس کا یہ استاد روس کی ان چند ادبی شخصیتوں میں سے تھا جنہیں اطمینان سے زندگی بسر کرنا نصیب ہوا۔ اور اس کی عمر ایک گہرے دریا کے دھارے کی طرح آہستہ اور خاموش بہتی ہوئی گزر گئی۔ اس نے شہرت حاصل کی، مگر اس کی کبھی دھوم نہیں مچی، وہ بے چینی کی کیفیتیں جو اس نے اپنے ڈراموں میں انتہائی نفاست اور نکتہ بینی سے پیش کی ہیں۔ اس کے اپنے روحانی سکون میں کوئی خلل نہیں ڈال سکیں اور اگر ہم یہ نہ بھی مانیں کہ اس کا دل پیچ و تاب سے بالکل ناآشنا رہا، تو بہر حال اس کی سیرت کا توازن ایسا تھا جس کو درد اور تلخ تجربے بگاڑ نہیں سکے۔

وہ ۳۱ مارچ ۱۸۲۳ء میں پیدا ہوا۔ اسکول اور یونیورسٹی میں اس نے کسی غیر معمولی قابلیت کا ثبوت نہیں دیا۔ دو چار نظمیں جو اس نے اس زمانے میں لکھیں بڑی نہیں ہیں، مگر اس کے

افسانوں کو کسی نے نہیں پوچھا۔ شاعری اور افسانہ نویسی کے میدانوں میں طبع آزمائی کرنا اس نے خود ہی چھوڑ کر ڈراما نویسی کی مشق شروع کی اور اسی کا اسے سچا شوق بھی تھا۔ اس کی تعلیم ختم نہیں ہوئی تھی کہ اسے ایک عدالت میں ملازمت مل گئی، جہاں وہ دنیا کے کاروبار کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتا تھا، اور یہی مشاہدہ اور معلومات اس کے لیے محرک بنیں اور موضوع فراہم کرتی رہیں۔

۱۹۸۶ء میں اس نے ”اپنے لوگ ہیں، آپس میں سمجھ لیں گے“ کے عنوان سے ایک مختصر اور نامکمل منظروں کا مجموعہ ماسکو کے ایک رسالے میں شائع کیا، اور پھر اسے مکمل کر کے اپنے ایک پروفیسر کے مکان پر ایسی محفل میں پڑھ کر سنایا جس میں ماسکو کے بیشتر مشہور ادیب موجود تھے۔ پروفیسر خود بہت صحیح اور اعلیٰ مذاق رکھتا تھا، اس نے فوراً اس تروف سکی کی قدر پہچان لی اور محفل میں کوئی ایسا نہیں تھا جسے یقین نہیں ہو گیا کہ اس تروف سکی روسی ڈرامے کو ایسی بلندی پر پہنچائے گا جو اسے پہلے کبھی نصیب نہ ہوئی تھی اور روسی ادب کے باغ میں نئے پھول کھلنے والے ہیں۔ اس تروف سکی کا یہ ڈراما شائع تو ہو گیا، لیکن محکمہ احتساب نے اسے ایسٹج پر دکھانے کی اجازت نہیں دی، پھر بھی نوجوان مصنف نے ہمت نہیں ہاری اور اپنی مشق کو جاری رکھا۔ ”غریب کنواری“، ”مغلسی عیب نہیں“، ”پرائی گاڑی میں کیوں بیٹھو“ اور ”اپنی ہی مرضی پر

مست چلو" یکے بعد دیگرے شایع ہوئے (۱۸۵۱-۱۸۵۴)۔ ۱۸۵۳ء
 میں محکمہ احتساب سے چند ترمیموں کے بعد اسے "اپنے لوگ ہیں،
 آپس میں سمجھ لیں گے" ایسٹج پر دکھانے کی منظوری مل گئی۔ اس کے
 بعد سے اس تروف سکی تقریباً ہر سال ایک نیا ڈراما لکھتا رہا اور
 وہ تاشائیوں میں اس قدر ہر دل عزیز ہو گیا تھا کہ اس کے ڈرامے
 ٹھیٹروں میں دکھائے بھی جاتے رہے۔ ٹھیٹروں کے مالکوں اور
 منتظموں سے ناراض ہو کر اس نے کچھ عرصے تک اپنا خاص طرز
 چھوڑ دیا اور تاریخی ڈرامے لکھنا شروع کیا، مگر شاعری کے بعد
 پھر اپنے پرانے ڈھڑے پر آگیا اور آخر تک اسی پر قائم رہا۔

۱۸۴۰-۴۱ میں اس تروف سکی نے اطالیہ کا سفر کیا۔ اس

ملک کو روسی انشا پرداز باغ ارم سمجھتے آئے تھے اور اس کی سیر
 کرنا ان کی معراج تھی، اکثر پر اطالیہ کے مناظر اور آثار قدیمہ نے
 گہرا اثر کیا اور ان کے دلوں میں ہزاروں نئی امنگیں پیدا کر دیں۔
 جرمن شاعر گوٹے کی زندگی اور فلسفے کا ایک نیا دور اس زمانے
 سے شروع ہوتا ہے جب وہ اطالیہ گیا اور وہاں کے کھنڈروں سے
 اس نے انسانیت کی جدوجہد اور سرگزشت کی ایک نئی بصیرت
 افروز دستاویز لیکن اس تروف سکی پر اطالیہ اور اس کے
 جادو کا مطلق اثر نہیں ہوا۔ اس نے عمارتیں دیکھیں، سیر کی، مگر
 سفر کے حالات اور آثار قدیمہ کی تعریف اس نے جس انداز سے

اور جن معمولی روزمرہ الفاظ میں کی ہو وہ صاف ظاہر کر دیتے ہیں کہ اٹالیہ اور یورپ کی قدیم تہذیب اسے گرویدہ نہیں کر سکی۔ اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ بے حس تھا، یا اٹالیہ کے مناظر اور ان کیفیتوں کا جو یہ مناظر پیدا کرتے ہیں پورا حق ادا کرنا اس کی بساط سے باہر تھا۔ اس تروف سکی سچا روسی تھا اور اسے روسی سیرت، طرز معاشرت اور فلسفہ حیات سے ایسا لگاؤ تھا کہ یورپی تہذیب سے فریفتہ ہونا تو درکنار، اس سے متاثر اور مرعوب ہونے کا بھی کوئی امکان نہیں تھا۔ اس کا یہ ذہنی رجحان اس کے ڈراموں کی سب سے نمایاں خصوصیت ہی اور جب تک اس کا پورا لحاظ نہ کیا جائے، ہم اس کا اصل مطلب اور نقطہ نظر صحیح طور پر سمجھ نہیں سکتے۔

اس تروف سکی نے کل چوالیس ڈرامے لکھے، جو موضوع کے لحاظ سے تین حصوں میں تقسیم کیے جاسکتے ہیں۔ پہلا حصہ وہ ہے جس میں ۱۸۶۱ سے پہلے کا طرز معاشرت اور روسی سیرت کا وہ خاص رنگ جو اس معاشرت کا ایک حد تک نتیجہ قرار دیا جاسکتا ہے، دکھایا گیا ہے۔ یہ دور ۱۸۶۰ کے قریب ختم ہوتا ہے۔ اس کے بعد اس تروف سکی نے حقیقت نگاری ترک کر کے تاریخی ڈرامے لکھنا شروع کیا اور کوئی دس سال تک زیادہ تر تاریخی سیرتیں اور واقعات اس کا موضوع رہے۔ یہ اس کے ڈراموں کا دوسرا

حصہ ہیں۔ ۱۸۷۰ کے بعد پھر وہ معاصر زندگی اور مسائل کی طرف متوجہ ہوئے اور اس کی تصانیف کے تیسرے دور کا پس منظر ۱۸۶۱ کی اصلاحوں کا پیدا کیا ہوا طرز معاشرت اور فلسفہ حیات ہے اور اس کا موضوع وہ انوکھی طبیعتیں اور نفسیات کے گہرے اور پیچیدہ مسائل ہیں جو اس وقت ظہور میں آئے۔

اوس تروفسکی نے جب لکھنے کو قلم اٹھایا تو اس کے ذہن پر ان لوگوں کی سیرتیں حاوی تھیں جن سے اس کا ان عدالتوں میں سابقہ پڑا جن میں وہ نوکر تھا اور سب سے پہلے اس نے انھیں سیرتوں کا عکس بھی اُتارا۔ یہ سیرتیں زیادہ تر تاجروں کی تھیں، جن کا ہندوستان کی طرح روس میں بھی عام طور سے سوسائٹی کے بقیہ حصے سے الگ طبقہ تھا، اور ان کا اپنا طرز معاشرت اور ایک بالکل جداگانہ فلسفہ حیات تھا۔ یہ طبقہ اب تک انٹارڈازوں کی توجہ اور حقیقت نگاروں کی پردہ درمی سے بالکل محفوظ رہا تھا اور جب اوس تروفسکی نے اس کی زندگی پر ایک بارگی تیز روشنی ڈالی تو بہت کچھ نظر آیا جسے دیکھ کر بھی یقین کرنا مشکل تھا۔ اوس تروفسکی کے پہلے ڈرامے پڑھ کر خیال ہوتا ہے کہ اس نے جدت کے شوق میں چلتا رستہ چھوڑ کر ایک نیا ڈھنگ اور تازہ موضوع محض اس نیت سے اختیار کیا کہ لوگوں کی توجہ اپنی طرف جلد منتقل کرے اور ان کی ناواقفیت سے فائدہ اٹھا کر اپنے آپ کو تنقید اور اعتراضات سے

بچائے رکھے۔ لیکن اوس تروف سکی کا مقصد اپنے ناظرین اور نقادوں کو حیرت میں ڈالنا نہیں تھا، اور اس کے وہ یورپ دوست مداح جو سمجھ بیٹھے تھے کہ وہ تاجروں کی زندگی اس غرض سے عام نظروں کے سامنے پیش کر رہا ہے کہ ان کی اصلاح کی ترکیبیں سوچی جائیں بہت جلد اپنی غلطی سے آگاہ ہو گئے۔ اوس تروف سکی کا مقصد صرف زندگی کی تصویریں اور حسی جاگتی ہستیوں کو ان کے اصل ماحول میں دکھانا تھا اور اس نے تاجروں کو سب سے پہلے اپنا موضوع اس لیے بنایا کہ اس کی نظر سب سے پہلے انھیں لوگوں پر پڑے گی۔ اس دور کے بعض ڈرامے ایسے ہیں جن میں زمینداروں کی زندگی دکھائی گئی ہے، اور گو وہ انوکھی اور نرالی سیرتیں جو خاص طور پر تاجر طبقے میں پائی جاتی تھیں اوس تروف سکی کے ڈراموں میں آخر تک ملتی ہیں، اس کا ہرگز ارادہ نہ تھا کہ اپنے میدان کو تاجروں کی زندگی تک محدود رکھے۔

تاریخی ڈراموں کی تصنیف کے بعد جب اوس تروف سکی نے پھر معاصر حالات کی طرف رجوع کیا تو زندگی کا نقشہ بالکل بدل گیا تھا، کسانوں کے آزاد ہو جانے سے زمینداروں کی آمدنی میں بہت کمی پڑ گئی تھی، اور کمی پوری کرنے کے لیے انھیں اپنی نوابی چھوڑ کر کسب معاش کے عام مقابلے میں شریک ہونا پڑا۔ اسی طرح تاجروں نے بھی نئے حالات دیکھ کر اپنی وضع بدلی اور اپنے کاروبار

اور تعلقات کا دائرہ وسیع کیا۔ یوں ان دونوں طبقوں کے درمیان جو دیوارِ حائل تھی وہ گر گئی، ان کے ایک دوسرے سے مراسم ہو گئے، آپس میں شادی بیاہ ہونے لگے اور وہ تفریق جسے پہلے دونوں قائم رکھنے پر مصر تھے خود بخود منٹ گئی۔ اصلاحوں نے انفرادی آزادی اور حقوق میں بھی بہت اضافہ کر دیا، خصوصاً عورتوں کے حقوق میں، اور پُرانا فلسفہٴ حیات، جس نے عورتوں کی زندگی اور دلچسپیوں کو بہت محدود رکھا تھا، رد کر دیا گیا، مگر اس کے ساتھ ہی بہت سے معنی اور پیچیدگیاں پیدا ہو گئیں جن کے حل کرنے کی کوئی صورت نہ تھی۔ اس وقت کے اہم معاشرتی اور روحانی مسائل میں سے اوس تروٹا سکی نے کسی کو نظر انداز نہیں کیا، اور وہ ہر مسئلے پر اپنی رائے رکھتا تھا، مگر نصیحت یا کسی خاص خیال کے پرچار کو اپنا فرض نہیں سمجھتا تھا۔ جس طرح پہلے وہ بغیر اپنی رائے ظاہر کیے اور بغیر کسی کو بُرا بھلا کہے تاجروں کی معاشرت اور ان بگڑی طبیعتوں کو جو اس معاشرت میں گندے پانی کے کیرٹوں کی طرح نمودار ہو رہی تھیں دکھاتا تھا، ویسے ہی اس نے نئے نئے حالات اور نئے ماحول میں جو لوگ اور جو مسائل قابلِ غور معلوم ہوئے انھیں ہو بہو ناظرین کے سامنے پیش کر دیا اور اپنی طرف سے ان کی رائے پر اثر ڈالنے کی ذرا بھی کوشش نہیں کی۔

اوس تروٹا سکی کے خیال میں روسی طرزِ معاشرت کوئی ناپائیدار چیز نہیں تھی جس کی طرف زیادہ توجہ کرنا یا جسے زیادہ اہمیت دینا

بے کار یا غلط ہو۔ وہ قوم پرست مگر جدت کے فدائی لوگوں کی طرح صرف اصلاح کی گنجائش نکالنے یا اس کی ضرورت ثابت کرنے کی فکر میں بھی نہیں تھا۔ اپنے ایک خط میں وہ لکھتا ہے: ”بہتر یہی ہے کہ روسی اپنے ہم شکل اور ہم صفت لوگوں کو اسٹیج پر دیکھ کر خوش ہوں اور اپنی مشاہدے کی خواہش پوری کریں، مصلح تو انھیں ہمارے علاوہ بھی بہت سے مل جائیں گے۔ جو کوئی یہ نہ ثابت کر سکے کہ وہ ان کی نسبت اچھی باتیں بھی جانتا ہے اور کہہ سکتا ہے وہ ان کی اصلاح نہیں کر سکتا، صرف توہین کرتا ہے۔“ جیسا کہ اوپر ضمناً بیان ہوا ہے، اوس تروف سکی کو روسی طرز معاشرت اور فلسفہ حیات سے سچا اور گہرا لگاؤ تھا اور وہ ان دونوں کی تعظیم کرتا تھا۔ گو اسے روسی طرز معاشرت سے محبت تھی اور وہ ان اصولوں کو مانتا تھا جو صدیوں سے روسی قوم کی رہبری کرتے آئے تھے، اس محبت اور عقیدت نے اُسے تعصب، عیب پوشی یا طرف داری پر مائل نہیں کیا۔ اس کی آنکھوں سے نہ وہ داغ دھبے چھپے رہے جو روسی سوسائٹی پر لگ گئے تھے، نہ وہ روگ جنھوں نے روسیوں کو پست اور انسانیت کے فرائض سے غافل کر دیا تھا، اور اس نے اپنے ڈراموں میں صاف گوئی بلکہ عیب نمائی میں کبھی تامل نہیں کیا۔ لیکن اس کا عقیدہ تھا کہ زندگی کی ایک خاص شکل ہونا چاہیے جو قومی سیرت کے مناسب ہو اور اسی لحاظ سے اس کو قدیم روسی طرز معاشرت تشکیل زندگی کی ایک نہایت کامیاب کوشش معلوم ہوئی۔

پیتر اعظم کی اصلاحوں نے اوس تروف سکی کے زمانے تک قدیم طرز معاشرے
 اور فلسفہ حیات بس نام کو باقی چھوڑا تھا اور وہ بھی تاجروں کے طبقے میں۔
 اوس تروف سکی نے اسی کی سرپرستی شروع کی اور نکتہ چینی کے ساتھ
 اس کی حمایت بھی کرتا رہا، کیوں کہ اپنی برائیوں کے باوجود وہ ایک
 قدیم مسلک تھا اور روسیوں کے لیے اس پر چلنا بہتر تھا بہ نسبت اس
 کے کہ وہ اپنی خودداری اور انفرادیت سے ہاتھ دھو کر یورپ کی اندھا
 دھند تقلید کریں اور بعد کو پچتائیں۔ اوس تروف سکی اصلاح چاہتا تھا
 مگر ایسی نہیں جو زندگی کو بالکل بے اصول اور بے شکل کر دے، تاریخ
 اور روایات کا سلسلہ بالکل توڑ ڈے اور سلامت روسی بلکہ اخلاق کی
 تعلیم ہی ناممکن کر دے۔ ۱۸۶۱ کے بعد جب پُرانی روش ایک بڑی
 اور تکلیف دہ عادت کی طرح ترک کر دی گئی، تو اوس تروف
 سکی نے اس کا ماتم نہیں کیا، نئے حالات سے کوئی نارضا مندی نہیں
 ظاہر کی اور نئی فضا کو بلا تکلف اپنی حقیقت نگاری کا موضوع بنا لیا۔
 پہلے وہ ذراتنگ معنوں میں حقیقت نگار تھا اور خاص روسی طرز
 معاشرت کا اپنے ڈراموں میں عکس اُتارنا چاہتا تھا، آخری دور میں
 وہ وسیع معنوں میں حقیقت نگار بن گیا، اور بغیر ماحول کی بدلتی ہوئی
 کیفیتوں کو نظر انداز نہ کیے، ان مسائل پر بحث کرنے لگا جو انسانی زندگی
 کا ایک لازمی جزو ہیں، اور جنہیں قوموں کی تقدیر ٹھیرایا جائے تو بے جا
 نہ ہوگا۔ آخری دور میں نہ کوئی ایسے اصول تھے نہ کوئی ایسا فلسفہ جس کی

طرف وہ قلبی یا ذہنی اور اخلاقی گتھیاں سلجھانے کے لیے اشارہ کرتا لیکن اس کے ڈرامے دل میں کوئی بے چینی نہیں پیدا کرتے اور جہاں اس کی نظر چن چن کر وہ تمام خامیاں نکالتی رہی جو نئے دور کے لوگوں میں تھیں اور اس کی عاقبت اندیشی ان خظروں سے آگاہ کرتی رہتی ہے جن میں نیا طرز معاشرت لوگوں کو ڈال رہا تھا، وہاں اس کی انسانی ہمدردی کبھی ساکت نہیں چھوڑتی اور ہر پریشانی اور درد کے لیے وہ کوئی نہ کوئی دوا بھی تجویز کرتا رہتا ہے۔ اسے نئے دور کے لوگوں سے، ان سیرتوں سے جو اس وقت ظہور میں آئیں، اتنی ہی محبت تھی جتنی پہلے دور کے لوگوں سے، اگرچہ طرز معاشرت اور فلسفہ حیات کی تبدیلی نے دونوں میں زمین آسمان کا فرق پیدا کر دیا تھا، اور یہ محبت اس کے ڈرامے آخر وقت تک ظاہر کرتے ہیں۔

اوس تروف سکی کے خیالات، اُس کا اخلاقی اور سماجی فلسفہ اس وجہ سے خاص اہمیت رکھتا ہے کہ اُس کے فن پر اس کا بہت اثر پڑا۔ کسی ڈرامے کی جب تنقید کی جاتی ہے اور اس کی خوبیاں کا اندازہ لگایا جاتا ہے تو ہم پہلے یہ دیکھتے ہیں کہ جن مسائل پر اس میں بحث کی گئی ہے ان کی اہمیت کیا ہے اور جس طریقے سے وہ پیش کیے گئے ہیں وہ ان کی اہمیت اور مصنف کا مطلب پورے طور پر واضح کر دیتا ہے یا نہیں۔ سیرتیں اور سیرت کشی، مکالمے کی دلچسپی اور بقیہ فنی نکات بعد کو دیکھے جاتے ہیں، مگر اوس تروف سکی کے ڈرامے

جا پنجنے کے لیے ایک اور ہی معیار کی ضرورت ہے، کیوں کہ اس کے ڈراموں میں بظاہر نہ کوئی مقصد نظر آتا ہے نہ کوئی خاص پلاٹ۔ اگر وہ مصلح ہوتا تو خاص معاشرتی مسائل یا عیبوں کو ڈرامے کی شکل دے کر ناظرین کو حقیقت سے آگاہ کرتا اور انھیں اصلاح پر آمادہ کرتا، یا وہ نیک سپیر کی طرح انسانی سرگزشت کو جذبات کا کھیل یا تقدیر کا ماسٹا جان کر سبق آموز اور عبرت انگیز یا پر لطف داستانیں سناتا۔ اس تروف سکی کو یہ دونوں طریقے گوارا نہ تھے، لیکن اس نے جو نرالا طرز اختیار کیا وہ ڈراما نویسی کے عام اسلوب سے ہرگز گرا ہوا نہیں اور بعض لحاظ سے بہتر ہی ہے۔

اس تروف سکی مصلح نہیں تھا اور جن مسائل پر اس نے جایجا بحث کی ہے وہ بھی اس طرح سے نہیں پیش کیے گئے ہیں کہ وہ ڈرامے کا مقصد کہے جاسکیں، کیوں کہ وہ سمجھتا تھا کہ زندگی کو تصویر کی طرح چوکھٹے میں رکھنا، اس کی صورت بگاڑنا ہی اور یہ ٹھیک بھی ہے کہ جب ڈراما نویسی کا مقصد کچھ ثابت کرنا یا کوئی خاص نتیجہ نکالنا ہوتا ہے تو وہ زندگی کی شکل کسی قدر بدل یا بگاڑ دیتا ہے۔ لیکن اس تروف سکی اگر مصلح نہیں تھا اور اس کے نزدیک ماحول کو درست کرنا اور رکاوٹیں دور کرنا ہی انسان کو بہتر اور زندگی کو زیادہ مفید اور خوش گوار بنانے کی صحیح تدبیر نہیں تھی، تو اس کے معنی یہ نہیں کہ وہ طرز معاشرت اور فلسفہ حیات کی ہر خصوصیت کو جو پرانی تھی قائم رکھنا چاہتا تھا۔ اسے ہر طرف

عیب نظر آتے تھے اور زندگی کو سدھارنے اور سنوارنے کی آرزو اس کے دل کو ہر وقت بے تاب رکھتی تھی۔ اس کے جوصلے وہی تھے جو ہر سچے مصلح کے ہوا کرتے ہیں، صرف طرزِ عمل جدا تھا اور وہ اسی چیز کی اصلاح کا قائل تھا جسے عام طور سے مصلح نظر انداز کرتے ہیں یا چھیننے کی ہمت نہیں کرتے، یعنی انسان کا دل۔ اس سے کوئی انکار نہیں کرتا کہ انسان پر جو مصیبتیں آتی ہیں اور سماجی زندگی میں جو بڑی دشواریاں پیدا ہوتی ہیں وہ صرف دل اور نیت کے بگاڑ سے اور اگر انسان کا دل اور اس کی نیت درست ہو تو پھر کسی اصلاح کی ضرورت نہیں رہتی۔ لیکن انسان کے دل کو مخاطب کرنے کی جرأت کسی کو نہیں ہوتی اور سب زندگی کے خارجی نظام کی مرمت کیا کرتے ہیں، اس لیے کہ وہ بہت زیادہ آسان کام ہے۔ اس تردد سکی نے اصل دشواری سے منہ موڑ کر اپنا کام آسان نہیں کیا، دستہ لف سکی کی طرح وہ بھی مصلح نہیں، ناصح تھا، اس نے ماحول درست کرنے کی ترغیب نہیں دلائی، نیت اور دل کو سدھارنے کی تلقین کی نصیحت کو آرٹ کا جامہ پہنانا بہت مشکل ہے، کیوں کہ اس کوشش میں نصیحت اور آرٹ دونوں کے مضحک بن جانے کا اندیشہ رہتا ہے اور اس تردد سکی ان چند اُستادوں میں سے ہے جنہوں نے اس کوشش میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔

دوسری خصوصیت جو اس تردد سکی کے ڈراموں میں پائی جاتی ہے، یعنی پلاٹ کی عدم موجودگی، وہ بھی اس تامل کا نتیجہ ہے جو ہر سچے

آرٹسٹ کو اپنی غرض پوری کرنے کی خاطر زندگی کی صورت بدلنے میں
 ہوتا ہے۔ یورپی ڈراما نویسوں کو جو معیار یونانی مصنفوں سے ورثے میں
 ملا ہے اس میں زندگی کی کشمکش ڈراما کا موضوع مانی گئی ہے، اور اسی کو
 مد نظر رکھ کر ڈرامے کے پلاٹ کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ یہ کشمکش انسانی سیرت
 کی خصوصیتیں پیدا کر سکتی ہیں یا معاشرتی رداج اور قانون یا ایسی قوتیں
 جو انسان کے قابو سے باہر ہیں مگر اسے زنجیروں کی طرح جکڑے ہوئے
 ہیں یا طوفان اور بھونچال کی طرح اس کی بے بسی پر ہنستی ہیں۔ فیہی نقطہ
 نظر سے بڑی بات یہ ہے کہ ڈرامے میں جو کشمکش دکھائی جائے وہ زندگی
 میں موجود ہو، ڈرامے کی خاطر پیدا نہ کی جائے، لیکن یہ کشمکش ہمیں بہت
 کم اتنی صاف نظر آتی ہے کہ ہم اس کی تصویر اتار سکیں۔ ڈراما نویس اس
 پر مجبور ہوتا ہے کہ اپنے ادراک اور بصیرت سے دھندھلے نقشوں پر روشنی
 ڈالے اور ان کہی باتوں کو کہ دے۔ یونانی اصول کے مطابق ڈراما نویس
 کو اپنا مطلب ادا کرنے کے لیے واقعات کا ایک مکمل مجموعہ تیار کرنا
 چاہیے اور جس طرح ایٹھج کا پردہ اٹھنے سے منظر سامنے آتا ہے، اسے
 تماشائیوں کے سامنے واقعات کا سلسلہ پیش کر کے آہستہ آہستہ ان
 کے جذبات میں ایسی کیفیت پیدا کرنا چاہیے کہ وہ ڈرامے کے مرکزی
 واقعے اور اس حقیقت سے جو اس میں مضمحل ہو پورا اثر لے سکیں۔ اس
 کے برخلاف وہ طرز ہی جو اس تردد سکی اور اس کے بعد خوف نے
 اختیار کیا۔ اس میں کشمکش نام کو بھی نہیں، ڈراما کیفیتوں کا مجموعہ

چاہے ہو بھی جائے، واقعات کا مکمل مجموعہ نہیں ہوتا اور وہ اس طرح
 نامکمل چھوڑا جاتا ہے کہ ناظرین جو کچھ ایسٹج پر دیکھیں اس سے بہت زیادہ
 ان کا تخیل ڈرامے سے متاثر ہو کر انھیں دکھائے اور فنی رسموں نے
 زندگی اور ڈراما کے درمیان جو فرق پیدا کر دیا ہے وہ مٹ جائے۔ اس
 تروف سکی کے متعلق ایک روسی نقاد نے لکھا ہے کہ "اس کے ہر ڈرامے
 کے پلاٹ کی سب سے ممتاز صفت اس کی سادگی ہے... کسی کسی ڈرامے
 میں تو خیال ہوتا ہے کہ کچھ پیش نہیں آتا، ایک منظر کے بعد دوسرا دکھایا
 جاتا ہے اور سب کے سب خصوصیت سے محروم، معمولی روزمرہ زندگی
 کا نقشہ ہوتے ہیں۔ مگر پھر ہم ایک بارگی چونک اٹھتے ہیں اور ایک
 دل سوز ڈراما نظروں کے سامنے دیکھتے ہیں۔ واقعی یہ کہا جاسکتا ہے
 کہ ہم کو ایسٹج پر اس تروف سکی کے ڈرامے نہیں دکھائے جاتے بلکہ
 ہماری زندگی ایک گہرے دریا کی طرح بہتی ہوئی سامنے سے گزرتی
 ہے اور ہم اس کا گزرنا محسوس بھی نہیں کرتے" اس تروف سکی
 کے کسی ڈرامے کا مقصد بیان کرنا یا یہ بتانا کہ اس میں کیا تعلیم دی گئی
 ہے مشکل ہوتا ہے، مگر ہمیں اس کا یقین ہو جاتا ہے کہ ہم نے زندگی کا بھیر
 افروز مشاہدہ کیا ہے اور ہمارے دل میں وہ درد کچھ اور شدید ہو جاتا ہے
 جو سچے علم اور کھری انسانی ہمدردی کی خاص علامت ہے۔

ہم عصر روسی نقادوں کو اس تروف سکی کے ڈراموں کی فنی
 خصوصیات تو انوکھی یا قابل اعتراض نہیں معلوم ہیں، لیکن ان کی

کلمتہ چینیوں اور تعریفیں دونوں اکثر بے جا ہوتی تھیں، کیوں کہ
 دونوں صورتوں میں ان کی نیت ادبی تنقید ہوتی تھی۔ یورپ دوست
 خیال کے لوگ اوس تروف سکی پر یہ الزام لگاتے رہے کہ وہ قدیمت
 پسند اور روسی قوم کی ذہنی اور معاشرتی اصلاح کا مخالف ہے، سلات
 دوست فرقے نے اسے اپنا ہم خیال اور مغربی تہذیب کا جانی دشمن
 سمجھ کر اس کے ڈراموں کو اپنے خیالات کی تبلیغ کا ایک ذریعہ فرض
 کر لیا۔ اوس تروف سکی کو ہمدردی اسی فرقے سے تھی اور وہ روسیوں
 کو اپنی خود داری بھلا کر اور انفرادیت سے ہاتھ دھو کر یورپ کی
 اندھا دھند تقلید کرنے سے روکنا چاہتا تھا، مگر اس کا ہرگز یہ ارادہ
 نہیں تھا کہ اپنی تصانیف کو سلات دوست عقیدوں کے پرچار کا
 ایک ذریعہ بنائے اور جن لوگوں نے اس کے ڈراموں کو یہ معنی پہنچا
 انہوں نے اس کے ساتھ بہت نا انصافی کی۔

اوس تروف سکی کا پہلا موضوع، جیسا کہ بیان ہو چکا ہے، تاجر
 طبقے کی زندگی تھی، اور اس زندگی کا وہ رخ جس پر عدالت کے ملازم
 کی حیثیت سے اس کی نظر سب سے پہلے پڑی۔ عدالتیں اور ہسپتال،
 یہ دو مقام ایسے ہیں جہاں ہر قوم کی زندگی کا سب سے ناگوار اور
 قابل اعتراض پہلو ہی دکھائی دیتا ہے اور اوس تروف سکی نے روسی
 زندگی کا بھی یہی پہلو دیکھا۔ چنانچہ "خاندان کی تصویر" میں شرابی،
 آوارہ اور بدتمیز مردوں اور بدچلن عورتوں کی ایک دن کی کارگزاری

دکھائی گئی ہے جس سے ان کے باہمی تعلقات اور ان کے ظاہر اور باطن
 کی حالت معلوم ہو جاتی ہے: مرد دن بھر دوستوں کے ساتھ شراب پیتے
 پھر کرتے ہیں، عورتیں اپنی دل چسپی کے لیے دوسرے مردوں سے
 آشنائی پیدا کرتی ہیں اور جس طرح مرد انہیں جھوٹ بول کر دھوکا
 دینا چاہتے ہیں، ویسے ہی وہ بھی انہیں چکے دیا کرتی ہیں۔ "اپنے
 لوگ ہیں، آپس میں سمجھ لیں گے" تو بد چلنی کی یہ شدت نہیں دکھاتا
 لیکن اس میں اور عیب کھولے گئے ہیں جو سماج کے لیے بد چلنی سے
 کم مضر نہیں کہے جاسکتے۔ ایک تاجر اپنے قرض خواہوں کو دھوکا دینے
 کے لیے دیوالیہ بن جاتا ہے اور ایک کارندے کے ساتھ اپنی لڑکی کی
 شادی کر کے کل ملکیت اس کے حوالے کر دیتا ہے۔ اس کا کارندہ،
 جو پہلے علم اور فرمان برداری کی ایک اعلیٰ مثال تھا، دولت ملتے
 ہی طوطے کی طرح آنکھ بدل لیتا ہے اور تاجر کی لڑکی کو بھی دھوکے باز
 باپ پر ترس نہیں آتا۔ اس بے ایمان تاجر پر جس نے یوں منہ کی کھائی
 کچھ افسوس تو ہوتا ہے: ڈرامے کی فضا دل میں جو کیفیت پیدا کرتی ہے
 وہ انتہائی مایوسی، بنیراری اور نفرت کی ہوتی ہے، لیکن اوستہ و فسکی
 کا یہ ارادہ نہ تھا کہ تاجروں کی طرف سے لوگوں کو بدظن کرے، یا اس
 فلسفہ حیات کی جس کے وہ معتقد تھے اور جو صحیح معنوں میں اردسی تھا
 تحقیر کرے۔ اس نے جو شکایتیں کی تھیں وہ ایک دوست اور
 ہمدرد کی حیثیت سے اور اس نے اسی کے بعد ہی ایک دو ڈراموں

میں ثابت کر دیا کہ وہ اس طبقے کی دل سے قدر کرتا تھا جس میں ایسے لوگ بھی تھے جیسے کہ ”اپنے لوگ ہیں۔ آپس میں سمجھ لیں گے“ کی سیرتیں۔

”بڑے منافع کا عہدہ“ (۱۸۵۵) اور ”بے پالک“ (۱۸۵۸) اسی شکایت کو جاری رکھتے ہیں جو ”اپنے لوگ ہیں، آپس میں سمجھ لیں گے“ میں شروع کی گئی تھی۔ پہلا رشوت خور سرکاری ملازموں کا فلسفہ اور طرز عمل بیان کرتا ہے، دوسرا ۱۸۶۱ سے قبل کے اُن زمینداروں کا رویہ جو اپنی رعایا کی جان اور عزت کے مالک تھے۔ دونوں ڈرامے اپنے اپنے رنگ میں بے مثل ہیں۔ دونوں میں کوئی سیر و نہیں، کوئی مرکزی سیرت یا واقعہ نہیں اور اسی وجہ سے وہ فنا جو ایک طبقے میں رشوت خوری نے اور دوسرے میں بے پاک خود مختاری نے پیدا کر دی تھی اپنی اصلی صورت میں اور اپنی کل خصوصیات کے ساتھ نظر آتی ہے، اور جس طرح نیک نیتی اور رست بازی کی خواہشوں اور ارادوں کا اس فنا میں گلا گھونٹا جاتا تھا وہ بھی صاف ظاہر ہو جاتا ہے۔

اسی دور کے دو ڈرامے اور ہیں جن میں زندگی کا تاریک پہلو دکھایا گیا ہے، گو ان میں کسی خاص طبقے کے گمراہوں کی شکایت نہیں۔ ”گناہ اور آفتیں سب ہی کا حصہ ہیں“ ایک غریب مگر محنتی اور نہایت درجہ وفادار اور محبت کیش ڈکاندار کو اس نون کے گھر کی تباہی کا

قصہ ہے۔ کہ اس نون نے ایک لڑکی سے شادی کی ہے جس کی پرورش
 ایک امیر گھرانے میں ہوئی تھی اور گو وہ ہر طرح سے اس کی دل چوٹی
 کرتا ہے، اس کی بیوی نہ اس کی مطلق قدر کرتی ہے اور نہ اس کی محبت
 کی۔ اتفاق سے اسی امیر کا لڑکا جس کے گھر میں کہ اس نون کی بیوی
 نے پرورش پائی تھی، اس شہر میں کسی کام سے آتا ہے، اس عورت کو
 نہ خود داری کا لحاظ رہتا ہے نہ شوہر کے احسانات یاد آتے ہیں اور وہ
 اس شریف زادے کے ساتھ بھاگ جانے پر تیار ہو جاتی ہے۔ لیکن
 انتہائی مکاری اور چال بازی کے باوجود وہ اس میں ناکامیاب
 ہوتی ہے اور کہ اس نون غصے میں آپے سے باہر ہو کر اسے مار ڈالتا ہے۔
 اس ڈرامے میں کہ اس نون اس کی بیوی اور سالی کی سیرتیں،
 بیوی کی احسان فراموشی اور عیاری، شوہر کی سادہ لوح و قادریا
 اور بعد کا خونخوار غصہ سب بہت خوبی سے دکھائے گئے ہیں۔
 کہ اس نون کا اندھا چچا جسے اس کی بیوی کے برتاؤ سے بہت
 تکلیف پہنچتی ہے۔ روسی عجز اور انکسار اور قوت اعتقاد کا ایک اچھا
 نمونہ ہے اور اس کی گفتگو داستان کو اور بھی عبرت آموز بنا دیتی ہے۔
 اسی ڈرامے کی طرح "نازک مقام" روسی زندگی کا تاریک پہلو
 دکھاتی ہے اور اس کی مرکزی سیرت ایک کسان ہے جو ایک سسرانے
 کا مالک ہے، اپنا کاروبار پڑھانے اور مہانوں کی تعداد میں اضافہ
 کرانے کے لیے اپنی بیوی کی نیک نامی کا مطلق خیال نہیں کرتا اور

اور اُسے امیر مسافروں اور مہسایوں کو پھانسنے کے لیے استعمال کرتا
ہے۔ بیوی کو اس میں عذر نہیں، صرف کسان کی بہن اپنی آپرہ کا
پاس رکھتی ہے اور اسی کی وجہ سے ڈرامے کے آخر میں کسان کے
دل میں کچھ روشنی پہنچتی ہے۔

”مفلسی عیب نہیں“ اوس تروف سکی کا پہلا ڈراما ہے جس میں
اس نے روسی سیرت اور طرز معاشرت کے بارے میں اپنی رائے
ظاہر کی، اور معاصر زندگی سے چند ایسی سیرتیں منتخب کر کے جن کی
مثالیں ہر طرف مل سکتی تھیں ایک بصیرت افروز داستان بنائی ہے۔
تورٹ سون ایک دولت مند تاجر ہے جو یورپی وضع پر رہنا چاہتا ہے
اس نے ایک اپنے ہی جیسے امیر کارخانہ دار کورٹونوف کو اپنا رہبر
بنایا ہے۔ کورٹونوف یورپی تہذیب کی اصلی خوبیوں سے بے بہرہ
ہے، صرف پھیلا بننا اور عیاشی کرنا جانتا ہے، اور یہی وہ تورٹ سون
کو جس میں پہلے سے بہت سے مزاجی عیب موجود تھے سکھا دیتا ہے۔
اسی کورٹونوف نے کچھ عرصہ پہلے ماسکو میں تورٹ سون کے چھوٹے
بھائی لیویم تورٹ سون سے دوستی گانٹھی تھی، جس زمانے میں اسے
ورٹے میں بہت سا نقد روپیہ ملا تھا اور اس کی سمجھ میں نہیں آتا
تھا کہ اسے کیسے صرف کرنے۔ کورٹونوف نے اس کا سارا روپیہ
خود دھوکے سے حاصل کر لیا یا لٹا دیا اور جب وہ بالکل کنگال ہو گیا
تو اس سے نہایت بے مروتی سے اپنا پیچھا چھڑا لیا۔ جس وقت

ڈرامے کا قصہ شروع ہوتا ہے لیویم تورٹ سوٹ کو اس کے بڑے
 بھائی نے کورٹونوف کے کہنے پر گھر سے نکال دیا ہے اور وہ مسخرہ پن
 کی حرکتیں کر کے لوگوں کو ہنساتا ہے اور بھیک مانگ کر گزر کرتا ہے۔
 اسے رستے سے ہٹا کر کورٹونوف ایک قدم اور آگے بڑھتا ہے اور
 تورٹ سوٹ کی لڑکی سے شادی کرنے کی خواہش ظاہر کرتا ہے۔
 تورٹ سوٹ اس کا ایسا معتقد ہے کہ بیٹی کا اس کے ساتھ نکاح
 کر دینا اپنی عزت افزائی سمجھتا ہے، گو کورٹونوف کی عمر ساٹھ کے
 قریب ہے اور اس کی بیٹی نوجوان خاندان کے لوگ سب اس سے
 بہت خائف رہتے ہیں اور شادی کی مخالفت کرنے کی کسی کو بھی
 ہمت نہیں ہوتی، مگر آخر وقت جب سنگنی کی رسم ادا ہونے والی
 ہے اور کورٹونوف اسی غرض سے تورٹ سوٹ کے یہاں آیا ہے،
 لیویم تورٹ سوٹ ممانعت کے باوجود گھر میں کورٹونوف کی موجودگی
 میں بھائی کو اپنی ساری سرگزشت سُناتا ہے اور آخر میں اس سے
 التجا کرتا ہے کہ کورٹونوف کی بجائے بیٹی کا نکاح اپنے کارندے کے
 ساتھ کر دے جو مدت سے اس پر عاشق ہے، مفلسی کے باوجود نہایت
 شریف طبیعت رکھتا ہے، کسی کا احسان نہیں بھولتا اور کسی سے بے
 مروتی نہیں کرتا۔ بھائی کی منتیں بالکل خلافت توقع کارگر ہوتی
 ہیں اور ڈراما خوشی کے گیت پر ختم ہوتا ہے مگر یہ اندیشہ دل میں ضرور
 باقی رہتا ہے کہ اس کا انجام بالکل برعکس ہو سکتا تھا، بلکہ اس کا

برعکس ہونا ہی زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے۔ ٹورٹ سون کی فرعونیت، کورٹونوف کی چالیں، اس زندگی کی دل فریبی جس کا لالچ ٹورٹ سون کو دیا جا رہا تھا، وہ فرماں برداری جو روسی فلسفہ حیات نے اولاد پر لازم کی تھی، اگر یہ سب مل کر ٹورٹ سون کی بیٹی کو قصائی کے کھونٹے سے باندھ دیتیں، اس کی بیوی کا دل توڑ دیتیں اور بھائی سے عمر بھر بھیک منگواتیں تو کوئی تعجب کی بات نہ ہوتی، کیوں کہ یورپی طرز معاشرت یہی فرعونیت، بے مروتی اور بے دردی روسی قوم کو سکھا رہا تھا۔

اس ڈرامے میں یورپی اور روسی فلسفہ حیات کی بے تکی آمیزش کا انجام صرف یہ ہونا کہ امکانات پیش کر کے نہیں واضح کیا گیا ہے۔ ڈرامے میں دو چار سین ایسے بھی ہیں جہاں معمولی باتوں میں دونوں کا فرق ظاہر ہو جاتا ہے اور ساتھ ہی روسی طرز معاشرت اور ذہنیت کی فضیلتیں بھی دکھائی جاتی ہیں۔ ٹورٹ سون کی بیوی بہت ملن سار، خوش مزاج، مسادات پسند اور صاحب ذوق ہے۔ ایک منظر ہے جس میں اس نے گھر میں محلتے کی بہت سی لڑکیوں اور لڑکوں کو جمع کیا ہے، سب گارہے ہیں اور نہایت بے تکلفی سے مگر انتہائی سناستگی کے ساتھ گفتگو اور منہسی مذاق ہو رہا ہے، کہ ایک بار لڑکی ٹورٹ سون اپنے مرشد کو رٹونوف کو لے کر پہنچتا ہے۔ کورٹونوف کے آتے ہی جلے کی فصنا بالکل بدل جاتی ہے جو لوگ مشوق سے گارہے

تھے ان سے روپے کے بدلے گانے کو کہا جاتا ہے اور جہاں پہلے بے تکلفی اور معصومیت تھی وہاں کورشنوں کی ذات شہوت کی بوچھلا دیتی ہے۔ یہ بڑی تاثیر روسی سیرت میں دولت اور دولت پرستی نے پیدا کی ہے اور لیو بوم تو رٹ سوٹ بالکل ٹھیک کہتا ہے کہ ”ارے، اگر میں عزیز ہوتا تو مسکن ہی انسان بھی ہو جاتا مفسلسی عیب نہیں ہے۔“

اس کے بعد کا ڈراما، ”اپنی ہی مرضی پرست چلو“ (۱۸۵۴) بے اصول زندگی بسر کرنے کی زیادہ صاف طور پر مخالفت کرتا ہے۔ اس تروتسکی نے اپنا خاص طرز چھوڑ کر نصیحت یا تنبیہ نہیں کی ہے نہ زندگی کی عام روش یا عام انسانی تجربے کے باہر قدم رکھا ہے اور ایسے حالات کو اپنا موضوع بنایا ہے جو دوزمرہ پیش آتے ہیں۔ ایک میاں بیوی ہیں جن کی شادی کو صرف ایک ہی سال گزرا ہے اور جنھوں نے محبت کی بنا پر شادی کی تھی۔ ان کے درمیان ناچاقی ہو جاتی ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اپنی محبت کے باوجود دونوں ایک دوسرے سے بیزار ہو جاتے ہیں۔ شوہر اپنا غم غلط کرنے کے لیے گھر میں آنا تقریباً ترک کر دیتا ہے اور بیوی اس کی سرد مہری دیکھ کر ایسی برداشتہ خاطر ہو جاتی ہے کہ میکے واپس جانے کی غرض سے گھر سے بھاگ نکلتی ہے۔ شوہر سے ناچاقی کی خبر اس کے بوڑھے ماں باپ تک پہنچ جاتی ہے، وہ اسے سمجھانے کے لیے آتے ہیں اور

اتفاق سے ان کی رستے ہی میں ملاقات ہو جاتی ہے۔ اس موقع پر ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اس نوجوان عورت نے ماں باپ کی رضامندی کے بغیر شادی کی تھی اور اس خوف سے کہ کہیں وہ مخالفت نہ کریں اپنے محبوب کے ساتھ چھپ کر بھاگ گئی۔ اس کے ماں باپ ناراض نہیں ہوئے، گو اس کے روئے سے انھیں صدمہ بہت پہنچا، لیکن جس طریقے پر شادی ہوئی تھی ویسی ہی بعد کی زندگی رہی۔ فریضہ کا احترام اور ذمہ داریوں کا احساس نہ ہونے کی وجہ سے ذرا سی ناچاقی پر میاں بیوی ایک دوسرے سے بگڑ گئے اور وہ نازک رشتہ جو جوانی کی محبت اور جوش نے قائم کیا تھا ٹوٹ گیا۔ بیوی کے ماں باپ نے یہ رشتہ پھر قائم کر دیا۔ اور اپنی نصیحتوں سے وہ تلون جو جوانی کے جذبات میں ہوتا ہی دور کر کے ان کے رشتے کو استوار کر دیا۔

”مفلسی عیب نہیں“ میں لیویم تورٹ سوٹ اور اپنی ہی مرضی پر مت چلو“ میں نوجوان بیوی کے ماں باپ جس فلسفہ حیات کے معتقد ہیں اس کا ”پرائی گاڑی میں مت بیٹھو“ اور ”مزاج موافق نہ تھے“ میں یورپی طرز معاشرت اور آئین زندگی سے مقابلہ کیا گیا ہے۔ ”پرائی گاڑی میں مت بیٹھو“ ایک مال دار تاجر کی لڑکی اذوتیا کی سرگزشت بیان کرتا ہے جسے ”مہذب“ بننے کا شوق ہے اور اسی شوق میں وہ ایک فوجی افسر سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ اس کی بھوپھی جس نے کسی یورپی ڈھنگ کے اسکول میں تعلیم پائی تھی اور تاجروں کے

رہن سہن کو نہایت وحشیانہ سمجھتی ہے اپنی نا تجربہ کار بھتیجی کو اور بھی اکساتی
 ہے اور اسی کی مدد سے وہ فوجی افسر کے ساتھ فرار ہو جاتی ہے کیوں کہ باپ
 کی منظوری ملنے کی اسے کوئی توقع نہیں۔ لیکن پہلی ہی منزل پر فوجی
 افسر کو معلوم ہو جاتا ہے کہ تاجر کی بیٹی کے ساتھ تاجر کی دولت ملنے کی کوئی
 امید نہیں اور چوں کہ اسے دولت ہی کی فکر تھی اس وجہ سے وہ
 محبت جس کا وہ بڑی لسانی اور گرمی کے ساتھ اظہار کیا کرتا تھا سرد
 پڑ گئی اور اذیتیا کو جب اپنے عاشق کی اصلی نیت معلوم ہوئی تو
 وہ اپنے باپ کے پاس بھاگ آئی۔ اس ڈرامے میں روس کے دونوں
 طبقوں کی کمزوریاں دکھائی گئی ہیں۔ تاجر شادی بیاہ کے معاملے
 میں اپنی اولاد کی خواہشوں کا لحاظ نہیں کرتے اور نہ انھیں اتنی
 آزادی دیتے ہیں کہ وہ اپنی خواہشیں ظاہر کر سکیں یا تجربے کے ذریعے
 سے صحیح اور غلط میں تمیز کر سکیں۔ تعلیم یافتہ طبقے کے لوگوں میں آزادی
 ہی اور سلامت روسی کے واسطے جتنے تجربے کی ضرورت ہوتی ہے وہ
 بھی انھیں حاصل ہے، لیکن ان کے اوتھے فلسفہ حیات میں عاقبت
 اندیشی کو کوئی دخل نہیں، وہ تہذیب کے معنی عیش و آرام سے
 زندگی بسر کرنا سمجھتے ہیں اور انھیں بس اسی کی فکر رہتی ہے کہ ایسی
 زندگی کے لیے جس سرمایے کی ضرورت ہے وہ فراہم کریں، چاہے
 اس کوشش میں کتنا ہی جھوٹ بولنا اور دھوکا دینا پڑے۔ اذیتیا
 اور اس کی پھوپھی قدیم روسی طرز معاشرت کے ان نمائندوں کی

مثالیں ہیں جو تہذیب کے صحیح مفہوم سے واقف نہیں ہیں، نہ اپنے
 آئین کی قدر کر سکتی ہیں نہ دوسروں کے اور اسی قسم کے لوگوں کی گمراہی
 اور ان کی زندگیوں کی تباہی پیداوس تروف سکی کو سب سے زیادہ
 رنج ہوتا تھا۔ اس قسم کی شادیاں جن کی آرزو اور ناکامی اس ڈرامے
 میں دکھائی گئی ہے، دس میں بہت ہو کر تھی اور اسی طرح لوگ
 ایک دوسرے کی اصل نیت کو معلوم کر کے پشیمان بھی ہو کر تھے۔
 اوس تروف سکی نے وہ قلم فہمی جس میں مبتلا ہو کر نوجوان مرد اور عورتیں
 اپنی زندگی دو بھر کر لیتی تھیں واضح کر دی اور سیرت اور تربیت کی وجہ سے
 تاجر اور "مہذب" طبقے کے لوگوں میں جو آگ پانی کی سی عداوت
 ہونا لازمی تھی اس کی اصلیت بھی ظاہر کر دی۔ "مزاج موافق نہ
 تھے" اسی حقیقت کو دوسرے لباس میں دکھاتا ہے۔ ایک نوجوان
 تاجر کی بیوہ مہذب کہلانے کے لالچ میں ایک رئیس زادے سے شادیاں
 کر لیتی ہے جس کے پاس ریاست کے حوصلوں کے سوا کچھ بھی نہیں اور
 جس نے صرف اپنا قرضہ ادا کرنے اور ٹھاٹھ سے رہنے کی نیت سے
 شادی کی ہے۔ تاجر کی بیوہ کو چند روز ہی میں معلوم ہو جاتا ہے کہ مہذب
 بننے کے لیے اسے اپنا سارا روپیہ شوہر اور مہذب زندگی کی لوازمات
 کی نذر کرنا ہوگا، اور وہ اپنے شوہر کو چھوڑ کر میکے میں جا بیٹھتی ہے۔
 ایسے حادثوں کو لوگ مزاج کی ناموافقیت سے تعبیر کرتے ہیں۔
 فنی کمال اور شاعرانہ خوبیوں کے اعتبار سے اوس تروف سکی کے

پہلے دور کے کارنامے "غریب کنواری" اور "طوفان" ہیں۔ "غریب
 کنواری" ایک مفلس مگر تعلیم یافتہ اور حوصلہ مند لڑکی کے بیاہے جانے
 کی داستان ہے۔ لڑکی کی ماں ایک کمزور اعصاب کی اور کم عقل عورت ہے
 جو ہر وقت پریشان اور مشیر اور مددگار کی تلاش میں رہتی ہے اور وہ
 لڑکی کے لیے سہارا ہونے کے بجائے الٹی اس کے لیے ایک مصیبت
 ہو جاتی ہے۔ لڑکی صورت کی اچھی ہے اور تین نوجوان اس سے شادی
 کرنے کے امیدوار ہیں۔ ان میں سے ایک ایسا جھپو اور دٹو ہے کہ اپنی
 خواہش زبان سے ادا نہیں کر سکتا اور دو معصن ایک دوسرے کو زچ
 اور مات کرنے کی فکر میں ہیں، لڑکی سے بے دریغ جھوٹ بولتے ہیں
 اور اس کی روحانی تکلیف کا مطلق پاس لحاظ نہیں کرتے۔ آخر میں
 ایک سرکاری ملازم شادی کے آرزو مندوں میں نمودار ہوتا ہے اور
 لڑکی کو مجبوراً اس سے شادی کرنا پڑتی ہے، کیوں کہ زیادہ انتظار
 کرنے میں بھوکوں مرنے کا اندیشہ ہے۔ سرکاری ملازم خود پرست، بے تمیز
 اور بدچلن ہے، اس سے پہلے وہ کئی لڑکیوں کو دھوکا دے کر ان کی
 زندگی برباد کر چکا ہے، لیکن اس کے پاس کھانے پینے کو ہے اور یہ
 صفت ان نوجوانوں میں سے کسی میں نہیں جو لڑکی کی نظر میں تھے۔
 بھوک سے بچنے کے لیے ایک شریف لڑکی کو اپنی انسانیت اور انسانیت
 کے حوصلوں سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے۔ اس تروف سکی نے زندگی کی یہ
 دل سوز تصویر دکھاتے ہوئے ناظرین پر کسی طرح کا اثر ڈالنے کی تدبیر

ہنہیں کی ہی، ان حالات کی سچائی اور عموماً خود دل کو تڑپاتی
ہی اور آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں۔

”طوفان“ میں یہی تباہی دوسرے اور زیادہ پرتاثر رنگ
میں نظر آتی ہے۔ قدیم روسی طرزِ معاشرت نے جو انوکھی سیرتیں پیدا
کی تھیں اور جن میں سے بعض کا اوس تروف سکی نے اس سے پہلے کے
ڈراموں میں عکس اتارا ہے ان سب کی تصویریں ”طوفان“ میں ڈراما نویس
کا منجھا ہوا قلم ایسی نفاست سے کھینچتا ہے جو پہلی کوششوں میں نہیں
پائی جاتی۔ دیکوئی اور کابانو وافر عورت، بے باکانہ خود مختاری اور
خود رائی کے محبتے ہیں۔ کابانو واکا بیٹا کابانو ف اس بودے پن کاشی
نمونہ ہے جو والدین کی سختی اور تند مزاجی اولاد میں پیدا کر دیتی ہے؛ ایک
ستر برس کی بڑھیا، جو لوگوں کو عذاب سے ڈراتی پھرتی ہے اور نوجوان
عورتوں کو حکم دیتی ہے کہ خدا سے دعا مانگیں کہ ان سے حن کی دین واپس
لے لے، اس مذہبیت کا عبرت آموز نمونہ ہے جس کا کل سرمایہ عذاب کا خوف
ہوتا ہے، کولی گن، ایک مستری، اس خبط میں مبتلا ہے کہ اس نے ایک
دائم حرکت کل ایجاد کر لی ہے، بس ایک پیسے کی کسر اور ہی، بوریس
گرگیور و وچ، دیکوئی کا ایک رشتہ دار، ان ردیوں کی مثال ہے جن کے
ذہن اور طبیعت میں یورپی تہذیب نے ہر طرح کی نفاست اور شائستگی
پیدا کر دی، مگر انھیں ہمت اور ارادے کی قوت سے بالکل محروم کر دیا۔
ڈرامے کی مرکزی سیرتیں کابانو ف کی بہن وارورا اور اس کی بیوی

کارترینا ہیں۔ وارورا اپنے بھائی کی طرح ماں سے ڈرتی ہی، اور بھائی
 کی طرح چھپ کر دل کے ارمان پورے کرتی ہی۔ یوں وہ بزرگوں کے
 تحکم اور ان کی روکھی اخلاقی تعلیم کو برداشت کر لیتی ہی، کارترینا کو ناپنی
 طبیعت پر اتنا قابو ہی نہ سخت کلامی اور جبر کا جھوٹ اور دھوکے بازی
 سے جواب دینے کی عادت اور اسی کی سرگزشت اس ڈرامے کا موضوع
 ہی۔ شادی سے پہلے اس نے پرندوں کی سی آزاد اور بے فکر زندگی بسر
 کی تھی، دل کی ہر خواہش پوری کرتی اور من کی ہر موج کے ساتھ بہ
 جاتی۔ اس کا دل بھی پرندوں کا سا صاف اور معصوم ہی، نہ جانے کیسی
 کیسی شاعرانہ امنگوں سے چور رہتا ہی، آنکھیں آنسو بہانے پر تیار
 رہتی ہیں اور عقل گم ہو جانے پر۔ اسی وجہ سے وہ کسی قسم کی بے التفاتی
 یا سردہری نہیں سہہ سکتی، مگر قسمت نے اسے ایسا شوہر دیا جس کی
 محبت اس کو تسلی نہیں دے سکتی اور ایسی ساس جو ہر وقت اس کے
 دل کو دکھانا اور تڑپانا اپنا خاص فرض سمجھتی ہی۔ شوہر اور ساس کی
 طرف سے بالکل مایوس ہونے کے باوجود کارترینا خاندانی زندگی کے
 اصولوں کی خلاف ورزی نہیں کرنا چاہتی۔ لیکن جب اس کی بورس
 گرنگور ووج سے ملاقات ہوتی ہی اور بورس کی شرافت اور نشتگی
 اور اس کے خوبصورت چہرے کا مایوسانہ انداز اور کھلائی ہوئی نگیت
 اسے بتا دیتی کہ وہ بھی اسی غم میں مبتلا ہی اور اسے بھی ناقدر دانی ہلاک
 کر رہی ہی تو وہ ہم جنبی کا حق ادا کرنے سے انکار نہیں کر سکتی۔ بورس کی

محبت کا جذبہ جس قدر قوی ہوتا جاتا ہے اسی قدر کارترینا کا ضمیر روکتا ٹوکتا
ہی، مگر آخر میں محبت اسے بے بس کر دیتی ہے اور وارورا کے مشورے پر
اور اسی کی مدد سے وہ چھپ کر بورس سے ملاقات کرتی ہے۔ وارورا کا
بھی ایک یا رہی، دونوں روز ملتے ہیں اور اپنا لڑ چھپانے میں اس قدر کامیاب
رہے ہیں کہ دوسروں کو ان پر کبھی شبہ نہیں ہوتا، وارورا کا جذبہ محض
جسمانی ہے، کیوں کہ جسمانی خواہشوں کے سوا اور کچھ ماحول کی ناموزد نیت
اور طبیعت کی افتاد نے اس کی سیرت میں باقی نہیں رہنے دیا۔ ان
خواہشوں کو جائز طور پر پورا کرنے کی اسے اجازت نہیں اس لیے وہ
بے دھڑک انھیں چھپ کر پورا کرتی ہے اور کارترینا سے اس کا اقرار
کرتے ہوئے اسے شرم بھی نہیں آتی۔ کارترینا لذت پرست نہیں ہے نیک
زندگی کا دل میں بہت لحاظ رکھتی ہے۔ وہی چوری جو وارورا کا معمول
بن گئی تھی پہلے تجربے کے بعد کارترینا کے ضمیر کو ایسا پریشان کر دیتی ہے کہ
وہ مذامت کے جوش میں اپنے شوہر سے ساس کی موجودگی میں جرم کا
اقبال کرتی ہے اور عشق اور معشوق کو خیر باد کہہ کر دریا میں کود پڑتی ہے۔
اسی رات کو بڑا زبردست طوفان آتا ہے، اندھیرے میں بہت دیر تک
سب اسے ادھر ادھر تلاش کرتے رہتے ہیں اور آخر میں اس کی
لاش دریا کے کنارے پر ملتی ہے۔

اوس تردت سکی نے ۱۸۵۸ میں قوم پرست عالموں کی ایک
جماعت کے ساتھ ودلگا کی وادی میں سیاحی کی اور وہیں "طوفان"

کا موضوع اس کے خیال میں آیا۔ کاترینا کے جذبات کی شدید جنگ کے لیے دریا کے طوفان زدہ کناروں سے زیادہ موزوں پس منظر تصور کرنا دشوار ہے اور ڈرامے کے آخر میں کالی گھٹاؤں کی کرٹک اور گرج جو کاترینا کے دل کو دہلا دیتی ہے اس روحانی ہنگامے کی ایک آسمانی صدا سنے بازگشت معلوم ہوتی ہے جس میں جذبات کی خانہ جنگی اور آرزوؤں کا طلاطم انسان کو مبتلا کر دیتا ہے۔ لیکن اس طوفان کی اور تشریحیں بھی ہو سکتی ہیں، کاترینا کی دہشت زدگی اور درون ناک تو کوہر شخص اپنے مذاق اور تجربے اور تعصبات کے لحاظ سے معنی پہن سکتا ہے، وہ عشق کا انجام بھی قرار دی جاسکتی ہے، زمانے کی ناساز گاری سے ایک غریب حوصلوں بھرے دل کا ٹوٹنا بھی، ”ناصح“ چاہے تو اسے اخلاقی آئین کی خلافت و رزی کی سزا بھی بتا سکتا ہے اور تردف سکی کا مقصد صرف ایک منظر، زندگی کی ایک تصویر دکھانا تھا۔

”طوفان“ کے بعد اس تردف سکی نے کئی ڈرامے لکھے، بعض فرحیہ، بعض المیہ، لیکن ”طوفان“ کا مرتبہ اس دور کے کسی اور ڈرامے کو حاصل نہیں اور کوئی تعجب نہیں کہ لوگ یہ سمجھے کہ اس تردف سکی کا فن انتہا کو پہنچ چکا ہے۔ پھر حال کچھ نقادوں کی سرد مہری کچھ ٹھیٹروں کے منتظموں اور مالکوں کے برتاؤ نے اس تردف سکی کو تاریخی ڈرامے لکھنے کی طرف مائل کر دیا۔ شروع کے ڈراموں میں

اوس تروف سکی کا مقصد تھا ہی نہیں کہ وہ اسٹیج پر دکھائے جائیں، وہ صرف روسی تاریخ کے چند واقعات پیش کرنا چاہتا تھا، مگر ڈرامے کے طرز سے گریز کرنے کی خواہش کے باوجود اوس تروف سکی اپنی طبیعت اور خاص رجحان پر قابو نہ لاسکا اور اس کا ڈراما "وسی لی سلمے لت یفنا" اس فن کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے اور اسٹیج پر دکھانے کے واسطے بہت موزوں ہے۔ اس کی داستان میں کچھ یونانی المیہ ڈراموں اور کچھ شیکسپیر کی تصنیف کارنگ اور ڈھنگ نظر آتا ہے، کیوں کہ وہ تاریخی واقعات جو اس میں بیان کیے گئے ہیں ان قصوں سے بہت ملتے جلتے ہیں جنہیں یونانی ڈراما نویسوں اور شیکسپیر نے اپنا موضوع بنایا۔

۱۸۶۸ سے اوس تروف سکی کی تصانیف کا تیسرا دور شروع ہوتا ہے۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے، ۱۸۶۱ کی اصلاحوں کے بعد روسی معاشرت اور اس کے ساتھ روسی فلسفہ زندگی نے ایک پلٹا کھایا، اور جہاں پہلے چند ادارے اور رواج اصلاح طلب تھے یا چند رسمیں اور تعصبات ترک کر دینے کا سوال تھا، وہاں اب ہزاروں معیے اور پیچیدہ مسائل پیدا ہو گئے جن کا کسی ایک اصول کے مطابق حل کرنا ناممکن تھا۔ روشن ضمیر لوگوں کے لیے اس سے بھی زیادہ پریشان کن یہ بات تھی کہ ان مسائل کا حل کرنا ایک انفرادی ذمہ داری کا معاملہ ہو گیا تھا، گویا ہر مریض پر یہ فرض عائد ہو گیا تھا کہ اپنے مریض کا علاج خود ہی کرے۔ اوس تروف سکی نے بہت سے مسئلوں پر جو اسے غور کے لائق

معلوم ہوئے اپنے ڈراموں میں بخت کی اور حسب استعداد گمراہوں کی
 رہ تھائی کافرین ادا کیا، لیکن اپنے خاص انداز سے۔ اس نے نصیحت
 کرنا، تعلیم دینا یا کسی مخصوص فلسفہ حیات کا پرچار کرنا اپنا مقصد نہیں
 بنایا، ہم کسی خاص ڈرامے کی نسبت قطعی طور سے یہ بھی نہیں کہہ سکتے تھے
 اس کا موضوع کون سا معاشرتی یا اخلاقی مسئلہ ہے۔ لیکن جو زندگی
 ہماری نظروں کے سامنے مشاہدے کے لیے پیش ہوتی ہے، جن سیرتوں
 کے تجربے اور سرگزشت سے ہم واقف کرائے جاتے ہیں اس سے
 کوئی نہ کوئی نتیجہ ضرور نکلتا ہے، اور ہم اس سے فائدہ بھی حاصل کرتے
 ہیں، مگر بغیر یہ محسوس کیے کہ ہماری رہ نمائی کی جا رہی ہے یا ہم کو کسی
 خاص قسم کی تعلیم دینے کی کوشش کی گئی ہے۔

اس دور کے دو چار ڈرامے ایسے بھی ہیں جن میں نئی زندگی کے
 مسئلے اور پیچیدگیاں نظر انداز کر کے صرف وہ انوکھی سیرتیں دکھائی
 گئی ہیں جو اس وقت نمودار ہوئیں اور جو اس وقت کے حالات کی
 بدولت بہت زیادہ نمایاں بھی ہو گئیں۔ "ہر چالاک آدمی میں کچھ
 بھولا پن ضرور ہوتا ہے" (۱۸۶۸) اور "دل سوزاں" (۱۸۶۸) اس
 سلسلے میں خاص طور سے قابل ذکر ہیں اور نئے رنگ کی سیرتوں کا بہترین
 مجموعہ ان دونوں میں نظر آتا ہے۔ ہر چالاک آدمی میں کچھ بھولا پن ضرور
 ہوتا ہے" گلو موف نامی ایک نوجوان کا قصہ ہے جو بہت چلتا ہوا آدمی ہے
 لوگوں کی کمزوریاں معلوم کر کے ان سے فائدہ اٹھانے کا گرو سمجھتا ہے اور

چند مہینوں کی کوشش کے بعد سب کی نظروں میں بہت رتبہ حاصل کر لیتا ہے۔ لیکن ہر شخص کی نسبت اس کی جو اصل رائے ہے اور ملازموں وغیرہ کو جو اس نے رغبت دی ہے اس کا سارا حساب وہ ایک روز نامچے میں لکھتا جاتا ہے اور آخر میں اتفاق سے یہی روز نامچہ ان لوگوں میں سے ایک کے ہاتھ لگتا ہے جنہیں گلو موف نے اُتو بنایا ہے اور یوں اس کا بھانڈا پھوٹ جاتا ہے۔ ان لوگوں میں اس کا دور کارشتہ دار ایک مالدار تاجر مائٹف ہے، جو ہر دن صبح سے شام تک رہنے کے لیے مکان تلاش کیا کرتا ہے، گو اسے مکان کی ضرورت بالکل نہیں۔ اس کی بیوی کو حُسن کے قدر دانوں کی تلاش رہتی ہے اور وہ منظر بھی عجیب ہوتا ہے جب مائٹف گلو موف سے کنایتاً کہتا ہے کہ اگر تم میری بیوی سے عشق کرو یا اس کے روبرو عاشقوں کا انداز اختیار کرو تو مجھے کوئی شکایت نہ ہوگی، کیوں کہ مائٹف اپنی بیوی کی کمزوری سے واقف ہے، اسے معلوم ہے کہ کسی نہ کسی سے اس کا یارا نہ ضرور رہے گا، اور اس صورت میں گلو موف ہی یہ منصب اپنے ذمہ کرے تو بہتر ہوگا۔ ان میاں بیوی کے علاوہ اور لوگ جو گلو موف کا شکار بنے کچھ کم دل چسپ نہیں۔ تو روسی نا ایک نوجوان بیوہ، دہم پرستی کی انتہا ہے۔ ڈراے میں پہلی بار جب اس کا ناظرین سے تعارف کرایا جاتا ہے تو وہ گاڑی پر بیٹھ کر کہیں جانے والی ہے، مگر رستے میں کچھ بُرے نمگونہ نظر آنے پر وہ واپس آجاتی ہے۔ اسے رمالوں پر بہت اعتقاد ہے، جو کچھ کرتی ہے فال دیکھ کر اور گلو موف ایک

رٹالہ کو رشوت دے کر تو روسی نا کے مستقبل میں خاص اہمیت حاصل کر لیتا ہے۔ تو روسی نا کی ایک رشتہ دار مارشن کا ہی جو صرف اس نیت سے شادی کرنا چاہتی ہے کہ بھڑکیلے کپڑے پہنے، ٹھیکڑ میں سب اسی کو دیکھا کریں اور وہ سوسائٹی کے اعلیٰ طبقے میں شمار کی جائے۔ اسے مطلق پروا نہیں کہ اس کی شادی کس سے ہوتی ہے، بشرطیکہ اس کے یہ جو صلے پورے ہو جائیں، اور وہ اچھی طبیعت کی ہند ب روسی عورتوں کا ایک مثالی نمونہ ہے۔ اسی کی طرح گورو دولن، جو اپنے آپ کو اس وقت سے بہت انتہا پسند سمجھنے لگا، جب سے کسی نے اس پر لبرل ہونے کا الزام لگایا ایسی ذہنیت کا نمونہ ہے جو روس کے سرکاری ملازموں میں بہت پائی جاتی تھی اور گورو دولن کے سے لوگ روسی نادلوں میں بہت ملتے ہیں۔ اس تروف سکی نے اس آزاد خیالی اور بے باکی کی، جس پر اس قسم کے لوگوں کو ناز تھا، ساری کیفیت ظاہر کر دی ہے۔

”دلی سوزاں“ روسی سوسائٹی کے اس طبقے کا ایک تصویرخانہ

ہے جس پر یورپی تہذیب کا زیادہ اثر نہیں پڑا، اگرچہ آزادی کی امنگیں نوجوانوں کے دلوں میں پیدا ہو رہی ہیں۔ اس ڈرامے کی ہیروئن پرائشا اپنی سوتیلی ماں اور خطیبی باپ سے دہتی اور ڈرتی نہیں ہے اور ایک موقع پر جب اسے اندیشہ ہوتا ہے کہ اپنی مرضی کے مطابق شادی نہ کر سکے گی تو بلا تامل گھر چھوڑ کر بھاگ نکلتی ہے۔ پرائشا کی سیرت بہانیت

لہ یعنی آزاد خیال۔ اس زمانے میں آزاد خیال سمجھا جانا بڑے فخر اور بڑے اندیشے کی بات تھی۔

پیاری ہے، اس میں وہ شوخی اور ہمت ہے جو جوانی کی خاص شان ہوتی ہے
 اور وہ دل کی نیک بھی بہت ہے۔ اسے تاجر طبقے کی لڑکیوں کا جن کی سیرتیں
 دکھانے میں اس تروف سکی نہایت مشاق تھا، بہترین نمونہ سمجھنا چاہیے۔
 لیکن ڈرامے میں دلچسپی کامرکز وہ اور اس کی سرگزشت نہیں، بلکہ اس کا
 باپ، کوروسلے پوف اور اسی شہر کا ایک اور مال دار تاجر خلی نون۔
 کوروسلے پوف نے بہت سی دولت پیدا کر لی ہے، اور عمر کے آخری
 سال چین سے گزارنا چاہتا ہے، مگر اسے ایک خبط ہو گیا ہے جس کی وجہ
 سے وہ ہر وقت بے حد پریشان رہتا ہے۔ اسے اندیشہ ہے کہ قیامت
 آنے والی ہے اور یہ اندیشہ اس کے دل میں ایسی وحشت پیدا کرتا ہے کہ
 وہ اکثر سوتے سے چونک پڑتا ہے اور باہر جا کر دیکھتا ہے کہ کہیں آسمان
 پھٹ تو نہیں گیا خلی نون اس سے بھی زیادہ مال دار ہے، وہ کسی
 خاص خبط میں تو مبتلا نہیں مگر اس کے کسی طرح سمجھ میں نہیں آتا کہ
 اپنا وقت کیسے کاٹے اور اپنی دولت کیسے صرف کرے۔ اس نے شرفا
 کے طبقے سے دو مصاحب نوکر رکھے ہیں، ایک نئی وضع کی تمام ہارکیاں
 اور نکات سکھانے کے لیے، دوسرا اس لیے کہ وہ وقت گزارنے کی
 نئی اور دل چسپ ترکیبیں سوچے۔ زندگی میں لطف پیدا کرنے کی آخری
 تدبیر جو خلی نون کا مصاحب سوچتا ہے وہ یہ ہے کہ سب کے سب
 ٹاکو بن کر شہر کے قریب جنگل میں چھپ کر بیٹھیں، جو مسافر راستے سے
 گزریں انھیں زبردستی گرفتار کر کے خوب شراب پلائیں اور پھر خست

کر دیں۔ انہیں مسافروں میں سے پرانا بھی ہے، جو اپنے گھر سے بھاگ
 گئی تھی اور اسی کی گرفتاری سے ڈرامے کے تمام مسائل حل ہو جاتے ہیں۔
 ”دل سوزاں“ لکھنے کے بعد سے اس طرف سکی نے نئی معاشرت
 کے معاملات پر غور کرنا شروع کیا اور ظاہر ہے کہ سب سے پہلے اسے
 نئی اور پرانی سیرتوں کا مقابلہ کرنے کا خیال ہوا۔ ”مفت کی دولت“
 (۱۸۶۹) کا موضوع یہی ہے۔ وسیل کوف، مصافحات کا ایک تاجر جس
 نے جدید تجارت کے تمام گڑھ سیکھ لیے ہیں اور خاصاً روپیہ کمایا ہے شرفا
 کے طبقے کی ایک لڑکی لیدیا پر عاشق ہو جاتا ہے، لیدیا کو وہ پسند نہیں
 لیکن دولت کی ہوس میں وہ اس سے شادی کر لیتی ہے۔ شادی کے
 چند روز بعد ہی دونوں میں ناچاقی پیدا ہو جاتی ہے۔ لیدیا کو خیال تھا
 کہ وسیل کوف بہت مال دار آدمی ہے اور اسے ڈھیروں روپیہ صرف
 کرنے کو ملے گا، مگر وسیل کوف ایک بندھی ہوئی رقم سے جو لیدیا کو بہت
 ناکافی معلوم ہوتی ہے زیادہ دینے پر راضی نہیں ہوتا اور ماں کے اکٹھے
 پر وہ وسیل کوف کو چھوڑ کر اپنے گھر واپس چلی جاتی ہے۔ اس کی ماں
 اپنا کل سرمایہ گنوا چکی ہے، ٹھاٹھ سے رہنے کے واسطے اپنے شوہر کی
 جائداد تک بکوا دی ہے اور چونکہ دونوں کے پاس کچھ نہیں اور قرض خواہ
 مکان اور کپڑے تک نیلام کرانے کی دھمکی دیتے ہیں لیدیا کو مجبوراً
 شوہر کے پاس واپس آنا پڑتا ہے۔ لیکن وہ با اصول آدمی ہے اور لیدیا کے
 واپس آ جانے پر وہ اسی وقت راضی ہوتا ہے جب وہ اس کی چند

شرطیں منظور کر لیتی ہیں، یعنی یہ کہ لیدیا دو سال تک گائون میں رہ کر خانہ داری
کافن سیکھے گی، اس کے بعد بھی فضول خرچی نہ کرے گی اور ریسا نہ
مشاغل کے بجائے اپنے شوہر اور اپنے گھر بار کو دل چسپی کام کر سمجھے گی۔
لیدیا کو اپنے تمام مصیبتوں کے باوجود یہ شرائط منظور نہیں، لیکن اس
آڑے وقت میں اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ شرفا میں سے اس کے جتنے
دوست اور اس کے حسن کے مدح سرا تھے وہ سب جھوٹے اور
دغا باز ہیں اور اگر وہ شوہر کی شرائط منظور نہ کرے گی تو اسے قاقہ کرنا
ہوگا۔ اسی سلسلے میں اسے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ مفت کی دولت
کسی کے ہاتھ میں ٹھیرتی نہیں اور امیر وہی ہو سکتا ہے اور رہ سکتا ہے جو
اپنی محنت سے روپیہ کمائے۔ لیدیا کا یہ تجربہ حاصل کر کے مجبوراً راہ
راست پر آنا ڈرامے کے ناظرین کے لیے خوشی کا باعث نہیں ہوتا،
لیدیا نہایت درجہ بے اصول عورت ہے، نفس پرستی کے سوا اس کے
دل میں اور کسی جذبے کا گزر نہیں اور اسے دولت کی اتنی شدید ہوس
ہی کہ وہ اس پر اپنی عصمت اور آبرو تک نثار کرنے کو آمادہ رہتی ہے،
ناظرین کے دل میں یہ کھٹکار ہوتا ہے کہ اگر وسیلہ کو ف جیسے با اصول
اور نیک آدمی کی جگہ اسے اور کوئی صاحب دولت ملتا جسے اس کی
زندگی کے بگڑنے اور بننے کی پروا نہ ہوتی اور وہ صرف اس کے حسن کا
خریدار ہوتا تو لیدیا اپنے آپ کو بیچ دینے میں تامل نہ کرتی۔ بے کاری
اور مفت کی دولت نے روسی شرفا کو اس حد تک بگاڑ دیا تھا!

لدیا کی سیرت ڈراما نویس کی ایجاد نہیں۔ روس میں ایک طرف
 آزادی، دوسری طرف وہ ریسا نہ عادتیں جو اس دور کے مشرق کو درنگ
 میں ملی تھیں اور ایک طوق کی طرح ان کے گلے میں پڑی تھیں، ان
 دونوں نے مل کر بہت سی عورتوں کو لدیا کا سا بنا دیا تھا۔ اس طرف
 سکی کے اس دور کے ڈراموں میں جو لوگ ہماری نظروں کے سامنے
 آتے ہیں ان کے جذبات میں کوئی شدت ہی نہ شان، ان کی
 محبت پر یا تو شہوت اور نفس پرستی کا رنگ غالب آجاتا ہے، یا وہ
 ادنیٰ اغراض پر نثار کی جاتی ہے، مردوں کے حوصلے یہ ہوتے ہیں کہ
 عیش کریں، عورتوں کے یہ کہ اپنے حسن اور ریسا نہ لباس اور بہن
 سہن سے مردوں کے دل بھائیں اور دوسری عورتوں میں رشک
 اور حسد پیدا کریں۔ خانگی زندگی کی کسی کو تاب نہیں، مرد اور عورتیں
 یکساں اس سے گریز کرتی ہیں اور پناہ چاہتی ہیں۔ مگر اسی وجہ سے
 کہ ان میں فرائض کا احساس نہیں، ان کی زندگی بالکل بگڑ جاتی ہے۔
 وہی لطف اندوزی جس کے پیچھے سب کچھ کھویا جاتا ہے ایک نایاب
 دولت بن جاتی ہے، اور وہی آزادی اور تہذیب جو کسی زمانے میں
 روسیوں کو جنت معلوم ہو رہی تھی حاصل ہونے کے بعد دوزخ بن
 جاتی ہے۔

”امیر کنواریاں“ (۱۸۷۵) اور ”بے چیر دالی“ (۱۸۷۸)

دونوں ڈرامے روسی سماج کی اس کیفیت کو خوب ظاہر کرتے ہیں۔

پہلے میں ایک لڑکی کی سرگزشت دکھائی گئی ہے جو شروع سے رُمیا نہ زندگی کی عادی بنا دی گئی تھی اور چوں کہ وہ اپنے آپ کو رئیس سمجھتی ہے اسے اس کی بھی فکر نہیں کہ اس کی زندگی کا طریقہ درست ہے یا نہیں اور اس کی اخلاقی حالت کی نسبت نیک چلن لوگوں کی رائے کیا ہے۔ اتفاقاً سے اس کی ایک نوجوان سے ملاقات ہوتی ہے جو بچپن میں اسے جانتا تھا، وہ لڑکی پر عاشق ہو جاتا ہے، مگر جب اس کے چال چلن کا حال کھلتا ہے تو وہ غصے میں اسے بہت ملامت کرتا ہے اور یوں لڑکی حقیقت سے آگاہ ہوتی ہے۔

”بے جہیز دالی“ کی ہیروئن لاریسا کو اس طرح آگاہ کرنے والا بھی کوئی نہیں ملتا۔ اس کی ماں مفلس ہے مگر امیروں کی طرح رہتی ہے کیوں کہ اس کی عادت ایسی ہے، اسے امید ہے کہ کوئی نہ کوئی خوش حال نوجوان لاریسا کے حسن سے فریفتہ ہو کر اس سے شادی کر لے گا۔ لاریسا کے حُسن کے تو بہت سے لوگ فریفتہ ہوتے ہیں، اس سے شادی کرنے کی خواہش کسی کو نہیں ہوتی، اس کے سارے قدردان اسے دہشتہ بنا کر رکھنا چاہتے ہیں۔ آخر میں وہ ایک ادنیٰ سرکاری ملازم سے جس کا اس کے یار دوست مذاق اڑایا کرتے تھے، منگنی کر لیتی ہے، کیونکہ وہ عیش اور شراب خواری کی زندگی سے عاجز آگئی ہے اور سکون کے لیے تڑپنے لگتی ہے۔ لیکن اسے چین نصیب نہیں ہوتا۔ وہ اپنے منگیتر سے بالکل محبت نہیں

کرتی اور وہ محبت کے لائق بھی نہیں۔ شادی سے چند روز پہلے ہی حیب اس کا ایک پرانا آشنا پر اتوں جس پر وہ اس کی سردہری اور لالہ ابالی پن کے باوجود دل و جان سے فدا ہے، یکبارگی نمودار ہوتا ہے، تو وہ اپنے منگیتر اور اپنے شادی کے ارادوں کو بھول جاتی ہے اور پر اتوں کے ساتھ ایک ناپرح گانے اور شراب خواری کے جلسے میں شریک ہوتی ہے، جہاں جانے سے اس کے منگیتر نے اسے منع کیا تھا۔ اس کا منگیتر ویسے بھی خطی اور کمینہ آدمی ہے۔ اس واقعے کے بعد رقابت کے جوش میں وہ لاریا کے پستول مار دیتا ہے۔ لاریا کو زندگی کے اس انجام پر بھی افسوس نہیں ہوتا، وہ گولی لگتے ہی اپنے منگیتر کا شکر یہ ادا کرتی ہے اور اس سے پستول مانگا لیتی ہے، تاکہ سب سمجھیں اس نے خودکشی کر لی ہے۔

لاریا کی سیرت میں بہت سی خوبیاں ہیں اور سب سے بڑی خوبی اس کی گہری اور سچی محبت ہے، جو اس کے لیے ہر ایثار کو آسان بنا دیتی ہے۔ مگر جس طرز معاشرت میں والدین اپنا کل سرمایہ ٹھاٹھ سے رہنے میں صرف کریں، اولاد کے لیے گھر بار کے بجائے عیش اور آسائش کی امیدیں کریں اور اپنے اور اپنی اولاد کی نیک نامی کی فکر ہی نہ کریں اس میں لاریا جیسی نازک اور نفیس مذاق رکھنے والی ہستیوں کو موت کے سوا اور کسی نعمت کا شکر یہ ادا کرنے کا موقع نہیں ہو سکتا۔

"آخری شکار" (۱۸۸۷) اور "حسین مرد" میں اس تردف سکی نے کہا
 کرنا چاہا ہے کہ عورتوں میں آزادی کی خواہش تو پیدا ہوگئی ہے مگر اس
 کے صحیح استعمال کی وہ اہل نہیں ہیں، کیوں کہ وہی ایتار کا جذبہ جو
 نسوانی سیرت کا زیور اور مایہ ناز ہے۔ انھیں چالاک اور بے اصول
 مردوں کا شکار بناتا ہے۔ اس کے آخری ڈرامے، "بیگناہ مجرم" (۱۸۸۳)
 اور "اس دنیا کے لیے نہیں" (۱۸۸۴) اس کے اس عقیدے کو بھی
 ظاہر کر دیتے ہیں کہ معاشرت کے تمام تغیرات کے باوجود اولاد کی محبت
 اور گھریلو زندگی کی خواہش روسی سوسائٹی میں ناپید نہیں ہوگئی ہے
 "بیگناہ مجرم" ایک لڑکی لیوبوف اوت راوی ناکا قصہ ہے
 جسے ایک نوجوان موروف سے محبت ہوگئی ہے۔ دونوں میں میاں
 بیوی کے تعلقات ہو گئے ہیں، ایک لڑکا بھی ہوا ہے مگر نوجوان نے
 نکاح نہیں کیا ہے۔ آخر میں لڑکی کو ایک ہی روز میں یہ معلوم ہو جاتا
 ہے کہ اس کا شوہر شادی کرنے والا ہے اور لڑکا جو بیمار تھا، قریب مرگ
 ہے۔ وہ بھاگی ہوئی بچے کے پاس جاتی ہے اور جب موت اس کی آنکھیں
 بند کر دیتی ہے تو وہ گھر چھوڑ کر نکل کھڑی ہوتی ہے۔ اوت راوی نا
 اپنا نام بدل کر ٹیٹر میں لوکری کر لیتی ہے اور بہت جلد مشہور ہو جاتی
 ہے، کیوں کہ اس کے غم نے اسے اس فن کے لیے بہت موزوں
 بنا دیا تھا۔ سترہ اٹھارہ سال تک وہ روس اور مختلف یورپی ملکوں
 کی گشت لگاتی ہے اور پھر اتفاق سے پیشے کے سلسلے میں اپنے پیدائشی

شہر میں بھی آتی ہے۔ وہ نوجوان جس سے پہلے اس کا تعلق تھا، اب ایک معززہ شخصیت اور رئیسِ اعظم ہو گیا ہے۔ اس کی بیوی مرچکی ہے اور جب وہ اوت راوی نا کو پہچان لیتا ہے تو شادی کی خواہش ظاہر کرتا ہے۔ لیکن اوت راوی نا کو کہیں سے پتا چل گیا ہے کہ اس کا لڑکا مرانہیں تھا بلکہ اب بھی زندہ ہے اور وہ اسی کو شادی کی شرط بتاتی کہ مورون لڑکے کو تلاش کر لائے۔ مورون وعدہ کر لیتا ہے، مگر حیا سے باقاعدہ جستجو کرنے سے باز رکھتی ہے اور آخر میں وہ اس کا اظہار بھی کر دیتا ہے۔ اوت راوی نا کو اپنے عشق کی داستان یاد ہے اور اس کی مامتا بدنامی کے خیال کو اس کے دل میں نہیں آنے دیتی ہے۔ مورون سے وہ شادی نہیں کرتی، مگر اسے اپنا لڑکا مل جاتا ہے اور اسی کو وہ اپنی انتہائی کامیابی سمجھتی ہے۔

”اس دنیا کے لیے نہیں“ اس منطق کے اختلاف کو واضح کرتا ہے جو عورتوں کے ذہن کو گھر گھر رہتی کے معاملات اور ازدواجی زندگی کے تنگ دائرے تک محدود رکھتا ہے اور مردوں کو اسی دائرے کے باہر لا کر عام زندگی کی دلچسپیاں اور متاعل میں شریک ہونے پر مجبور کرتا ہے۔ کوچوئف، ایک خوش حال آدمی نے دولت کی ہوس میں ایک لڑکی سے شادی کی ہے جس کی تربیت خاندان میں ہوئی ہے اور قدیم اصولوں کے مطابق وہ شوہر کا فرض سمجھتی ہے کہ فرصت کا سارا وقت گھر پر صرف کرے اور کبھی سیر یا تفریح یا ملاقات

کے لیے جائے تو اپنی بیوی کے ساتھ کسی غیر عورت کی طرف آنکھ
اٹھا کر بھی نہ دیکھے اور ان تمام تفریح کے ذریعوں کو جو اخلاق پر بُرا
اثر ڈال سکتے ہیں اپنے اوپر حرام سمجھے، چاہتی تو سب عورتیں یہی ہیں
مگر تجربہ بہت جلد ظاہر کر دیتا ہے کہ یہ خواہش پوری نہیں ہو سکتی۔
لیکن کوچولف کی بیوی کے نیا اس دنیا کے لیے نہیں بنی ہوا وہ
کئی سال کے تجربے پر بھی اپنی رائے نہیں بدلتی، بلکہ اس کی کنوار پن
کی آرزوئیں اور زیادہ شدید ہو جاتی ہیں۔ کوچولف کی طبیعت ایسی ہے
کہ بیوی کی سیرت اور خیالات سے واقف ہونے کے باوجود وہ اپنا
رویہ ذرا بھی نہیں بدل سکتا اور اس کشمکش کا انجام یہ ہوتا ہے کہ کسے نیا
بیمار پڑ جاتی ہے اور اسے ایک آخری صدمہ ایسا پہنچتا ہے کہ وہ اس
دنیا ہی سے رخصت ہو جاتی ہے۔

اوس تردف سکی کے ساتھ ان لوگوں کا ذکر بھی لازمی ہے جنہوں نے
اس کے ڈراموں کو اسٹیج پر کامیاب بنایا اور صرف ڈراما نویس ہی
کے جوصلے نہیں پورے کیے بلکہ اس کے ڈراموں کا حق بھی ادا کیا۔
ٹھیٹروں کے مالکوں اور منتظمیوں سے تو اوس تردف سکی کو ہمیشہ شکایت
رہی، لیکن روسی ایکٹروں سے وہ ہمیشہ خوش رہا اور ان لوگوں نے
بھی ڈراما اور ڈراما نویس کی ترجمانی کرنے کی کوشش میں کوئی دقیقہ
باقی اٹھا نہیں رکھا۔ اوس تردف سکی کے حقیقت نگاری کے اصول
نے اس کوشش میں انھیں مدد بھی بہت پہنچائی اور ایکٹروں نے

بذاتِ خود قومی زندگی کا جو مشاہدہ کیا تھا اس سے وہ پورے طور پر
 کام میں لاسکے اور ڈراموں کی ساخت اور مصنف کی وسعتِ نظر
 نے اس کا بھی امکان پیدا کر دیا کہ وہ فن میں جدتیں کر سکیں۔ اکثر
 یہ ہوتا تھا کہ ناظرین میں سے کوئی ہو بہو اپنی ہی جیسی شکل کا آدمی
 اسٹیج پر دیکھ کر دنگ رہ جاتا ہی اور ایکٹروں نے ہر طبقے اور پیشے
 کے لوگوں کی بات چیت، خاص انداز اور حرکتیں اس طرح اپنا
 لیں کہ اس خاص طبقے والے بھی نقل اور اصل میں امتیاز نہ کر سکے۔
 لیکن محض نقل میں کامیابی حاصل کرنے سے اس ترددت سکی کا
 سارا مفہوم اور اس کی حقیقت نگاری کا پورا مطلب ادا نہیں ہو سکتا
 تھا۔ ایکٹروں پر یہ بھی لازم تھا کہ جن سیرٹوں کی وہ نقل کریں ان کے
 ظاہر کے ساتھ ان کا باطن یعنی ان کا فلسفہ حیات اور ان کی ذہنیت
 بھی اختیار کر لیں اور اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ اپنے ذہن میں ہی
 وسعت اور ہمہ گیری پیدا کریں جو ڈراما نویس کے ذہن میں تھی اور
 اسی طرح ہر سیرت میں موجود ہونا سیکھیں۔ یہ شرط پوری کرنا دشوار
 ہی اور یہ بھی صحیح ہے کہ ”اس سعادت بزورِ بازو نیست“، لیکن روس
 میں اس وقت ایسے صاحبِ ہنر موجود تھے جنہوں نے یہ شرط بھی
 پوری کر دی اور اس ترددت سکی کے ڈراموں کی خوبیاں دوہا
 ہو گئیں۔

تیسرا باب

(اوس تروف سکی سے انقلاب تک)

اوس تروف سکی کے ہم عصر انشا پردازوں میں سے کئی نے ڈراما نویسی کے میدان میں طبع آزمائی کی، لیکن اس فن کی قدرتی استعداد کسی میں نہیں تھی اور کسی نے مشق اور محنت بھی جیسی کہ چاہیے نہیں کی۔ تورگینف نے ۱۸۴۸ اور ۱۸۵۱ کے درمیان کئی فرحیہ ڈرامے لکھے جو زبان کے لحاظ سے بہت اعلیٰ ہیں، مگر فن ڈراما نویسی کے اعتبار سے کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ الکساندر تالسٹائی کے تین تاریخی ڈرامے، ”ادان سہیت ناک کی موت“، ”بورس گودونوف“ اور ”زار فیوڈراو انوویچ“ اس صنف کے خاصے نمونے ہیں اور روسی دربارہ کے جو مناظران میں دکھائے گئے ہیں وہ اسٹیج پر بہت شان دار اور موثر بنائے جاسکتے ہیں۔ الکساندر تالسٹائی زارا لکسانڈر دوم کا قریبی دوست تھا، درباری زندگی سے خوب واقف تھا اور وہ دشواریاں جو روس جیسے ملک کے بادشاہ کو گھیرے رہتی تھیں، وہ

قوتیں جو اسے راہ راست پر آنے سے روکتی تھیں سب تالستانی کی نظر میں تھیں۔ اس وجہ سے وہ تاریخی ڈرامے لکھنے کے لیے بہت موزوں تھا اور اپنی واقفیت اور تجربے سے اس نے فائدہ بھی اٹھایا۔ مگر اور تاریخی ڈراموں کی طرح تالستانی کی تصانیف میں بھی رومانیت اور مصنف کے اپنے خیالات اور تخیل نے ذرا زیادہ دخل دے دیا ہے اور معاشرتی حیثیت سے ان کی قدر کچھ کم کر دی ہے۔

مقبولیت اور جدت خیال کو دیکھا جائے تو اس تروف سکی کے ڈراموں کے بعد ناول نویں پی سم سکی کے ڈراما "بدبختی" کا درجہ آتا ہے۔ ڈراما کا موضوع ۱۸۶۱ کی اصلاح سے پہلے کے زمینداروں اور کسانوں کے تعلقات ہیں۔ قدرت نے نہ زمیندار کو اخلاقی حس سے محروم رکھا ہے نہ کسان کو، دونوں میں معقول زندگی بسر کرنے کی صلاحیت موجود ہے، لیکن "بدبختی" میں ہم دیکھتے ہیں کہ ایک دخیانہ قانون سب کی سیرتوں کو اس طرح بگاڑ دیتا ہے کہ وہ نیم مجرم ہو کر رہ جاتے ہیں اور انتہائی بد اخلاقی کی حرکتیں کرتے ہیں۔ ڈراما کا پلاٹ یہ ہے کہ ایک کسان نے، جو قانون کے رو سے غلام تھا، اتنی آزادی حاصل کر لی ہے کہ گانو چھوڑ کر دارالسلطنت میں اپنی قسمت آزمانے کو جا کے وہ کئی سال وہاں رہ کر واپس آتا ہے تو کیا دیکھتا ہے کہ اس کی بیوی کا زمیندار آقا سے ناجائز تعلق ہو گیا ہے اور آقا سے اس کے ایک بچہ بھی ہوا ہے۔ کسان غصے میں آ کر بچے کو مار ڈالتا ہے اور پھر اسے اپنے

جرم کی سزا بھگتنا پڑتی ہے۔ جو لوگ غلامی کے قانون سے نفرت کرتے تھے انہیں یہ ڈراما بہت پسند آیا، ہم بھی کسی ایسے قانون کو نفرت ہی کی نگاہ سے دیکھیں گے، لیکن ”بدبختی“ کے بارے میں یہی خیال ہوگا کہ اس میں نفاست اور شائستگی نہیں اور اس کی دلچسپی کا دار و مدار ایسی واردات پر ہے جو حد درجہ ناگوار ہوتی ہیں اور یہ ذرا مشکل سے یقین کیا جاسکتا ہے کہ وہ عام حقیقت کا آئینہ ہیں۔

”بدبختی“ کے علاوہ اور بہت سے ڈرامے اسی زمانے میں لکھے گئے جن کا محرک خالص ادبی شوق تھا یا اصلاح کی خواہش۔ کو بی لن، پالم (۱۸۲۲-۱۸۸۵) اور پوتیے خن (۱۸۲۹-۲-۱۹) ان ڈراما نویسوں میں سب سے ممتاز مانے جاتے ہیں۔ کو بی لن کا انداز طنزیہ ہے، اور اس کے ڈرامے جن میں ”کریش چن سکی کا نکاح“ سب سے زیادہ کامیاب ہوا، سرکاری ملازموں کی رشوت ستانی اور دوسرے عیبوں کو ظاہر کرتے ہیں۔ پالم کا مقصد روسی زمینداروں کی سیرت اور فلسفہ حیات واضح کرنا تھا اور اس طبقے کے چومونے اس نے پیش کیے وہ تورگینس کی مشہور سیرتوں سے کچھ کم حقیقت نما نہیں۔ پوتیے خن کا موضوع وہی ہے جو کو بی لن کا، فرق بس یہ ہے کہ اس کے ڈراموں میں جن سرکاری ملازموں کی قلعی کھولی گئی ہے وہ ۱۸۶۱ کی اصلاحوں کے بعد کے ہیں، وہ رشوت نہیں لیتے مگر کسی کا کام بھی نہیں کرتے اور ”ایمانداری“ نے ان کی خود پسندی اور خود غرضی کو اس حد تک پہنچا دیا ہے کہ وہ

ملک کے لیے اپنے پیش رووں سے بھی بدتر ثابت ہوئے ہیں۔
 ان تمام ڈراما نویسوں اور ڈراموں کو دیکھتے ہوئے بھی تسلیم کرنا
 پڑتا ہے کہ اوس تروف سکی کے مرنے پر جو عہدہ خالی ہوا اس کا کوئی حق دار
 ثابت نہ ہوا اور جب ۱۸۹۸ میں ماسکو آرٹ ٹھیٹر نے چخوف کا پہلا
 ڈراما دکھایا تب ہی لوگوں نے محسوس کیا کہ روس کو اوس تروف سکی کا
 ایک جانشین نصیب ہوا ہے۔ یورپ کے اہل ذوق میں اوس تروف سکی
 سے بہت پہلے چخوف کا چرچا ہوا اور یورپ میں چخوف ہی خاص روسی
 طرز کا موجد اور استاد مانا جاتا ہے، لیکن اگر اس کے ڈراموں کا اوس تروف
 سکی کے آخری کام سے مقابلہ کیا جائے تو ظاہر ہو جائے گا کہ چخوف
 نے کوئی نیا طرز ایجاد نہیں کیا بلکہ اوس تروف سکی کے طرز کو ایک
 نیا رنگ دیا ہے۔ اسی طرح ماسکو آرٹ ٹھیٹر کو بھی ایک بالکل ہی نیا
 منظر نہ سمجھنا چاہیے۔ ایکڈنگ کا جو مسلک اس ٹھیٹر نے اختیار کیا اس
 میں پہلا قدم اوس تروف سکی نے رکھا تھا اور اس ٹھیٹر کے وہ اوصاف
 جو یورپ میں نئے اور بہت نرالے سمجھے گئے ان ایکٹروں میں موجود تھے
 جنہوں نے اوس تروف سکی سے سبق لیا تھا اور جو گفتگو اور واقعات
 کے سہارے اس خاص فصاحت کو بھی پیدا کر سکتے تھے جس میں ڈراما کی سیرتیں
 ڈوبی ہوئی ہوتیں۔ چخوف کے ڈراموں کا پورا اثر اسی وقت ہوتا ہے
 جب وہ اسٹیج پر دیکھے جائیں، اس لیے کہ وہ اسٹیج ہی پر جا کر مکمل ہوتے
 ہیں اور انہیں ایکٹری تکمیل کو پہنچا سکتے ہیں۔ ایکٹروں کو فن کے وہ

بھید بتانا کہ بھیس بدلنے کے ساتھ ان کی کایا بھی پلٹ جاتے اور تروف
 سکی کا کام تھا اور اس کی رہبری کے بغیر روسی ایکٹروں میں وہ مہارت
 ہرگز پیدا نہ ہو سکتی تھی جو چخوف کے ڈراموں میں جان ڈالنے کے لیے درکار
 چخوف کے ڈراموں کی سب سے نمایاں خصوصیت، جس پر یورپی
 نقادوں کی سب سے پہلے نظر پڑی، پلاٹ کی عدم موجودگی ہے۔ یہ خصوصیت
 ہم بیان کر چکے ہیں کہ اس تروف سکی میں بھی پائی جاتی ہے، چخوف نے
 ذرا مبالغہ کر کے اپنے آپ کو قصہ ستانے کی پابندی سے بالکل آزاد
 کر لیا، جس زندگی کے مناظر وہ دکھانا چاہتا تھا اسے انتہائی وسعت
 دے دی اور ان سیرتوں اور روحانی کیفیتوں کو جو اس کا موضوع
 تھیں اپنی اصلی اور مکمل صورت میں پیش کیا۔ اس کے زمانے تک وہ
 تمام مسائل جن پر اس تروف سکی بحث کرنا ضروری سمجھتا تھا اپنی اہمیت
 کھو چکے تھے، معاشرت میں جو تبدیلیاں ہو سکتی تھیں ہو چکی تھیں، اب
 ایسی رُکاوٹیں نہیں رہی تھیں جو جوصلے کو دبا کر ابھارتی ہیں، اس سیاسی
 غلامی باقی تھی اور اس سے جوصلے ٹکرا کر پاش پاش ہوتے رہتے تھے۔
 روس ایک جنگل تھا جسے باغ بنانے کی خاطر لوگ درختوں کو کاٹ کر
 برابر کر چکے تھے، لیکن جب ایک صاف سپاٹ میدان نکل آیا تو اسے
 زرخیز اور شاداب بنانے کی ہم سے سب جی چرانے لگے اور روسی
 زندگی کو ویرانی کی ہوا لگ گئی۔ چخوف کا زمانہ شدید مایوسی اور پست
 ہمتی کی فضا میں ڈوبا ہوا تھا اور زندگی کی جہل پہل پر بھی سناٹا چھایا

رہتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں چخوف کے ڈراموں میں انفرادی زندگی کے چھوٹے مقاصد بھی نہیں ملتے اور اس کشمکش کا تو نام و نشان بھی نہیں جسے پیش کرنے کے لیے ڈراما کا فن ایجاد کیا گیا۔

چخوف کا کمال اس میں ہے کہ اس نے ایسی سیرتوں اور ایسی زندگی کو جو مقاصد ہی نہیں بلکہ شکل سے محروم تھی ڈراما کی شکل دے دی۔ قصہ سنانا، نصیحت کرنا، اصلاح کو مد نظر رکھ کر عام زندگی کے بصیرت افروز نمونے منتخب کرنا آسان ہے، ایسے لوگوں کے حالات کو جو نہ کچھ ہونا چاہیں اور نہ کچھ کرنا چاہیں، ایسی معاشرت کو جس میں کوئی سحر یک باقی نہ رہا ہو ایک موثر ڈراما بنا دینا بہایت ہی نازک خیال، نکتہ ہیں اور اپنے فن میں کامل آرٹسٹ کا کام ہو سکتا ہے۔ بظاہر چخوف کے سامنے ڈراما کے لیے کوئی سامان ہی نہ تھا، لیکن اس نے اپنے ہم وطنوں کی بود و باش، ان کی ناکامیوں اور حسرتوں کو لے کر ایک پوری دنیا آباد کر دیا ان کی سیرتوں کے اس پہلو کو جو سب سے زیادہ عمومی رکھتا تھا خاص انداز سے نمایاں کر کے ان کی سرگزشت اور ان کی کیفیتوں کو ایک لطیف ہنگامہ بنا دیا۔ چخوف کے ڈرامے اپنے زمانے کی حقیقت کو، یعنی ایک نسل اور اس کی تہذیب کو فنا ہوتے ہوئے دکھاتے ہیں، مگر ناکامی اور زوال کی یہ کیفیت عام انسانی احساسات کا عکس ہے، روسی تاریخ کا ایک دور ہی نہیں، ہماری آپ بیتی کا ایک ٹکڑا ہے۔

چخوف کے ڈراموں میں پلاٹ نہیں ہوتا، بلکہ غور کیا جائے تو

فصحا کے سوا کچھ ہوتا ہی نہیں۔ چخوف نے حقیقت کا خیال کر کے معاشرتی مقاصد اور ان سطحی اور گہرے تعلقات کو جو یہ مقاصد لوگوں کے درمیان پیدا کرتے ہیں نظر انداز کیا اور آدمی آدمی کے رشتے کو بالکل ہی توڑ دیا۔ اس کے ڈراموں کی ہر سیرت ایک بالکل جدا بہتی رکھتی ہے، نگاہوں کے ملنے پر بھی دل دور رہتے ہیں اور محبت کی تیز آہنچ بھی دو ہستیوں کو گلا کر ایک نہیں کر سکتی۔ وہ سمجھتا تھا کہ انسان اتنا تنگ نظر، خود غرض اور سردہر ہوتا ہے کہ اس کے وہ اعلیٰ جذبات جن پر وہ ناز کرتا ہے، یا وہ حوصلے جو زندگی میں ربط اور ہم آہنگی پیدا کرتے ہیں اس کی سرشت کے ان عیبوں پر غالب نہیں آسکتے۔ چخوف کے ڈراموں کی گفتگو اکثر بے سر ڈپا ہوتی ہے، ہر شخص اپنی بات کہے جاتا ہے، دوسرے کی سمجھنا تو درکنار وہ سنتا ہی نہیں، ہر شخص اپنی ذات میں محور رہتا ہے اور اپنی آرزوؤں اور حسرتوں کے آگے کچھ دیکھتا ہی نہیں۔ یہ بیگانگی جانوروں کی سی بے تعلقی نہیں ہے، ایک مجبوری معلوم ہوتی ہے، ایک منرا جسے سب کو یکساں بھگتنا پڑتا ہے اور جس کا سب کو صدمہ ہوتا ہے۔ سب ذات کی اس کال کی بھری سے نکلنا چاہتے ہیں، ایسی جماعت بننا چاہتے ہیں کہ جس پر وہ اپنی انفرادیت نثار کر سکیں، لیکن انھیں نہ اپنی ذات میں ثبات اور استحکام نظر آتا ہے اور نہ جماعت میں، وہ نہ درخت کی طرح زمین کو مضبوط پکڑ سکتے ہیں نہ پانی کے قطروں کی طرح دریا بن کر بہ سکتے ہیں، بس ایک غبار ہیں کہ جس کا اٹھنا بیٹھنا اس کے اپنے اختیار میں نہیں بلکہ بے مقصد

حادثات کا سب سے حقیر اور بے معنی پہلو ہے۔

حجوف کے نقطہ نظر کی تمام خصوصیات اس کے پہلے ڈرامے "ادانوف" میں پائی جاتی ہیں۔ ادانوف ایک حوصلہ مند نوجوان ہے جو خاصے مفید کام میں مشغول ہے اور روسیوں اور یہودیوں کے درمیان تعصب کو مٹانے کے خیال سے اس نے ایک یہودن سے شادی کی ہے۔ سیرت کی ناموافقیت سے دونوں میں ناچاقی پیدا ہو جاتی ہے، جس کے صدمے سے ادانوف کی بیوی کو درد ہو جاتی ہے۔ بیوی کی بیماری اور آئے دن کی مالی دشواریاں ادانوف کی زندگی کو بالکل بے لطف کر دیتی ہیں اور اس کا مزاج بہت بگڑ جاتا ہے۔ پہلے تین ایکٹ میں میاں بیوی کے تعلقات کا یہ رنگ ہی بس ڈراما کا موضوع ہے اور باقی جو سیرتیں ہیں وہ اپنے اپنے خیال میں محو اور ایک دوسرے سے بے خبر رہتی ہیں۔ بیوی کی بیماری کے زمانے میں ادانوف اور ایک لڑکی ساشا کے درمیان ہمدردی اور ایک نئی زندگی تعمیر کرنے کا اشتیاق خاص لگاؤ پیدا کر دیتا ہے اور (چوتھے ایکٹ میں) جب ادانوف کی بیوی کا انتقال ہو جاتا ہے تو ساشا ادانوف کو خوش رکھنے اور اس کے دل سے گزشتہ غموں کی یاد مٹانے کا بیڑا اٹھاتی ہے۔ لیکن بیوی کے مرنے پر ادانوف کی طبیعت میں ایک اور انقلاب رونما ہوتا ہے، پہلے وہ ہمدردی کی تلاش میں تھا تو اب اپنی سرشت کی خرابیوں کا ہر وقت ذکر کرتا رہتا ہے اور پھلی غلطیوں اور ناکامیوں کا اس کی اپنی

طبیعت سے جو تعلق تھا اسے بیان کرتا رہتا ہے۔ ساشا کا نوجوان دل جو ایثار پر آمادہ ہو گیا تھا اس قسم کی ایذا رسانی کو برداشت نہیں کر پاتا، وہ اپنے مستقبل سے بہت مایوس ہو جاتی ہے مگر اداؤں سے شادی کرنے کے ارادے پر قائم رہتی ہے۔ ڈراما کے آخری سین اس بے تعلقی کو جو تمام اشخاص کے درمیان تھی بالکل واضح کر دیتے ہیں، سب محسوس کرتے ہیں کہ کوشش کرنے پر بھی وہ ایک دوسرے کی طبیعت کو سمجھ نہیں سکتے اور یہ احساس سب میں ایک عجیب سی بے چینی پیدا کر دیتا ہے۔ آخر میں اداؤں، جو یہ نہیں چاہتا کہ اس کی اپنی زندگی کو سدھارنے کی امید میں ساشا کا مستقبل خطرے میں ڈالا جائے، خود کشی کر لیتا ہے اور ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایسے حالات اور ایسی سیرتیں زندگی میں جو گتھیاں ڈال دیتی ہیں انھیں موت کے سوا کوئی سلجھا نہیں سکتا۔

”اداؤں“ میں بہت صفتوں کے ساتھ وہ خامیاں بھی موجود ہیں جن سے تجربے اور مشق کی کمی کا پتہ چلتا ہے۔ مختلف اشخاص میں جس طرح کی بے تعلقی دکھائی گئی ہے اس پر مبالغے کا شبہ ہوتا ہے، اداؤں کی سیرت اچھی طرح سمجھ میں نہیں آتی اور نفسیات کے معنی پیش کرنے میں سبب اور نتیجے کا اصول کچھ نظر انداز کیا گیا ہے۔ چخون کی ڈراما نویسی کے تمام اوصاف اس کے دوسرے ڈرامے ”بگلے“ میں پائے جاتے ہیں اور انسان کی طبیعت اور اس کی زندگی کی فضا کا ایک

دوسرے سے جو تعلق ہی وہ بھی صاف ظاہر ہو جاتا ہے۔ ”انوانوف“ کے مقابلے میں یہ ہم کو کہیں زیادہ افسردہ اور اُداس کرتا ہے اور اگر پہلے طبع میں ایک اوانوف تھا جسے زندگی کی دشواریوں نے عاجز اور دیوانہ کر دیا تھا تو ”بگلے“ میں کئی سیرتیں ہیں جن کی یہی کیفیت ہے اور جنہیں چند روز کے لیے بھی ساشا کی طرح کا کوئی قدر دان اور غم میں شریک ہونے والا نہیں ملتا۔ لیکن بعد کے تینوں ڈراموں ”وانیا مامون“ ”تین بہنوں“ اور ”باغ“ کی طرح یہ بھی خوف کے فن کا کامل نمونہ ہے، اس میں کوئی بات ادھوری، کوئی رنگ ہلکا یا پھیکا نہیں رہ گیا ہے۔

”بگلے“ میں کوئی مرکزی مسئلہ یا سیرت نہیں۔ ہر ایک کا اپنا الگ دکھ ہے اور سب یکساں بے بسی میں تڑپتے رہتے ہیں۔ آرکا دینا ایک سن سے اُترتی ہوئی ایکٹرس ہے جو دن رات بس اپنی شہرت اور کامیابیوں کے خیال میں ڈوبی رہتی ہے، یہاں تک کہ اسے اپنے بیٹے کونستان تن سے بھی، جو ایک ہونہار، حوصلہ مند اور شاعرانہ مزاج کا نوجوان ہے کوئی مطلب نہیں۔ کونستان تن سے آرکا دینا کے داروغہ کی لڑکی ماشا کو ایسی محبت ہے کہ اس کا نام ہی پکارنے میں ماشا کو بڑا مزہ آتا ہے، مگر کونستان تن کو اس سے ذرا بھی لچھی نہیں اور اس کو اسی سے الجھن ہوتی ہے کہ ماشا اس کا نام لیا کرتی ہے۔ خود کونستان تن کو پڑوس کے ایک زمیندار کی لڑکی نینا سے محبت ہے

مگر جب نینا کی آرکا دینا کے یہاں ایک مشہور انشا پر داڑ تری گورن
 سے ملاقات ہوتی ہی تو وہ کونستان تن اور اس کی دوستی کو بالکل
 بھول جاتی ہی اور تری گورن پر عاشق ہو جاتی ہی۔ نینا کو شہرت حاصل
 کرنے کی ہوس ہے، وہ ٹھیٹر میں نام پیدا کرنا چاہتی ہی اور ستا پراسی
 امید میں کہ تری گورن کی سرپرستی اسے جلد کامیاب کر دے گی
 وہ کونستان تن کو چھوڑ دیتی ہی۔ لیکن تری گورن کچھ دنوں اس
 کی محبت سے ناجائز فائدہ اٹھانے کے بعد اپنا پرتاؤ بدل دیتا ہی
 اور دوسری عورتوں کے پیچھے لگ جاتا ہی اور ٹھیٹر میں بھی نینا کو
 قابلیت کی داد دینے والے نہیں ملتے، حسن کے خریدار ہی ملتے ہیں۔
 نینا کا باپ خفا ہو کر اسے گھر سے نکال دیتا ہی اور شریف عورتیں
 اسے دیکھ کر منہ پھیر لیتی ہیں، پھر بھی نینا اپنی شکست کو تسلیم نہیں
 کرتی اور آخری ایکٹ میں کونستان تن کو اپنا سارا ماجرا سننا کر کہتی
 ہی کہ میں یہ اور ایسے اور صدے پر داست کر تی رہوں گی۔ وہ
 جانتی ہی کہ کونستان تن کو اس سے سچی محبت ہی، یہ بھی جانتی ہی
 کہ دنیا میں بس وہی اس کی تمام لغزشوں کو معاف کر سکتا ہی اور
 اس کی قدر بھی کر سکتا ہی، مگر یہ سب جانتے ہوئے بھی وہ تری گورن
 کو نہیں چھوڑتی اور بڑا پرتاؤ اس کی محبت کو گھٹاتا نہیں بلکہ اور
 بڑھا دیتا ہی۔ اس آخری گفتگو کے بعد کونستان تن اپنے افسانوں
 وغیرہ کے مسودے جلا دیتا ہی اور اپنے گولی مار لیتا ہی۔

”بگلے“ میں جذبات کا جوا بچھاؤ ہو اسے سلجھانا خالی ارادے کے بس کی بات نہیں ایک موقع پر ماشاٹا ڈاکٹر ڈورن سے کہتی ہے۔
 ”میری مدد کیجیے، ورنہ میں کوئی بے تنگی حرکت کر بیٹھوں گی، اپنی جان لے لوں گی، تباہ ہو جاؤں گی... مجھے بڑا دکھ ہے، میرے دکھ کا حال کوئی بھی نہیں جانتا، کوئی بھی۔ (ڈورن کے سینے پر سر رکھ کر) میں کونستان تن کو چاہتی ہوں!

بچارے ڈاکٹر کے پاس اس بیماری کی کوئی دوا نہیں۔ وہ جواب دیتا ہے۔
 ”تم سب کے اعصاب کیسے کمزور ہیں!.. اور محبت کی بھی کیا پھر مار رہی!.. (ترمی سے) مگر، میری بچی، میں کیا کر سکتا ہوں؟ میں کیا کر سکتا ہوں؟“

ماشانے خود ایک تدبیر سوچی ہے، جو وہ ترمی گورن سے بیان کرتی ہے۔

”میں یہ سب آپ کو اس خیال سے بتا رہی ہوں کہ آپ انشا پر داز ہیں... دیکھیے میں نے بیٹھے بیٹھے طے کیا ہے کہ کونستان تن کی محبت کو اپنے دل سے نکال دوں گی، جہڑے سے اکھاڑ کر پھینک دوں گی... محبت کرتا، جب کوئی امید نہ ہو، برسوں انتظار کرنا کہ شاید کچھ ہو جائے... لیکن جب میں شادی کر لوں گی تب محبت کرنے کی مہلت ہی نہ ہوگی، نئی فکریں اور ذمہ داریاں سب گزرے ہوئے زمانے کی یاد کو مٹادیں گی۔ اور پھر یہ بھی ہے کہ ذرا تبدیلی

ہو جائے گی،

ماشا شادی کر لیتی ہے اور اس کے ایک بچہ بھی ہو جاتا ہے، مگر کونستان تن کی محبت اُسے دیوانہ بنائے رکھتی ہے۔ اسے یہ خیال ہوتا ہے کہ اگر اس کے شوہر کا کسی اور شہر میں تبادلہ ہو جائے تو شاید اس کی حالت سنبھل جائے گی، مگر اس کے انداز سے ظاہر ہوتا رہتا ہے کہ یہ بھی خالی بہلاوا ہے۔

چخوف کے تیسرے ڈرامے "وانیا ماموں" میں جذبات کا وہ اُبھار نہیں ہے جو روسی معاشرت نے پیدا کیا تھا، لیکن اس وجہ سے اس کو پڑھ کر دل پر اور بھی زیادہ سخت چوٹ لگتی ہے۔ سرب ریاکوف، ایک پروفیسر اور انشا پرداز، جس کی پہلی بیوی کا انتقال ہو چکا ہے دوسری شادی کرتا ہے اور بیوی کے ساتھ اس مکان میں جا کر رہتا ہے جو اس کی پہلی بیوی کو جہیز میں ملا تھا۔ مکان کے ساتھ کھوڑی سی جائداد بھی ہے جس کا انتظام شروع سے اس کے سالے (پہلی بیوی کے بھائی) ووی نیٹسکی کے سپرد رہا ہے اور سرب ریاکوف کی لڑکی سونیا بھی ہوش سنبھالنے کے بعد سے جائداد کے کام میں اپنے ماموں کی مدد کرتی رہی ہے۔ ماموں بھانجی دونوں خوش اور مطمئن تھے اور چوں کہ انھیں خیال تھا کہ سرب ریاکوف علمی اور ادبی دنیا میں بڑی حیثیت رکھتا ہے اس لیے وہ اس کی خدمت کرنا ضروری اور اچھا سمجھتے تھے۔ مگر جب پروفیسر اپنی جوان اور

خوبصورت بیوی کے ساتھ مکان میں آکر رہنے لگتا ہی تو دونوں کی آنکھیں کھل جاتی ہیں۔ سونیا شروع میں اپنی سوتیلی ماں سے بات تک نہیں کرتی، دومی نیٹ سکی کو یقین ہو جاتا ہے کہ پروفیسر اوجھے علم اور کمینی طبیعت کا آدمی ہے، وہ اسے خوبصورت بیوی رکھنے کا مستحق نہیں سمجھتا، اسے موقع بے موقع بُرا بھلا کہتا ہے اور اس کی بیوی سے ایسی باتیں کرتا ہے جو کوئی شریف عورت گوارا نہیں کر سکتی۔ دومی نیٹ سکی کو سب سے زیادہ شکایت اس بات کی ہے کہ وہ ۴۷ برس کا ہو گیا ہے، قابلیت میں کسی سے کم نہیں، مگر ایک غلط فہمی کی وجہ سے اس کی عمر کا بہترین حصہ ضایع ہو چکا ہے اور اب اس کے لیے زندگی کا لطف اٹھانے کا موقع نہیں۔ سریب ریا کو ف کو عورتیں نہ معلوم کیوں پسند کرتی ہیں، وہ واقعی نہایت خود غرض اور تکلیف دہ مزاج کا ہے اور ہمیں اس پر مطلق افسوس نہیں ہوتا کہ دومی نیٹ سکی اسے طعنے دے کر گھر سے بھگا دیتا ہے۔ لیکن اس کے چلے جانے سے کوئی مشکل آسان نہیں ہوتی۔ دومی نیٹ سکی کے شکوہ شکایت کا انداز وہی رہتا ہے اور بیچاری سونیا کو دنیا سے کوئی امید نہیں رہتی۔

جب تک پروفیسر مکان میں رہا، آسٹرون، ایک ڈاکٹر، اسے اکثر دیکھنے آیا کرتا تھا۔ سونیا کی ڈاکٹر سے پہلے بھی ملاقات ہوتی تھی، اور سونیا کو اس سے بڑی محبت تھی، مگر سونیا کی صورت شکل اچھی نہیں تھی، اس لیے ڈاکٹر نے کبھی اس کی محبت کی پروا نہیں کی۔

باپ کی موجودگی کے زمانے میں سوئیا نے ایک مرتبہ اپنی سوئیلی ماں سے کہا کہ آسٹرونڈ سے باتوں باتوں میں دریافت کرے کہ وہ شادی پر راضی ہوگا یا نہیں، اسے کیا خبر تھی کہ اس درمیان میں آسٹرونڈ اس کی سوئیلی ماں کا گردیدہ ہو گیا ہے، اور وہ بھی اپنے اصولوں کے باوجود ڈاکٹر سے بالکل بے التفاتی نہیں برت سکی ہے۔ وہ گفتگو جس میں سوئیا کی قسمت کا فیصلہ ہونے والا تھا ڈاکٹر کے لیے اپنے جذبے کے اظہار کا موقع بن جاتی ہے اور ڈاکٹر کو سوئیا کی سوئیلی ماں کے میلان کا بھی پتہ چل جاتا ہے۔ گفتگو کا نتیجہ صرف یہ ہوتا ہے کہ ڈاکٹر سوئیا کی سوئیلی ماں کو دو چار مرتبہ پیار کر لیتا ہے اور وہ شوہر کے ساتھ جانے لگتی ہے تو یادگار کے طور پر ڈاکٹر کی ایک پسل اپنے پاس رکھ لیتی ہے۔ آخر میں جب سب چلے جاتے ہیں تو سوئیا اور اس کے ماموں کے لیے کسی نہ کسی طرح دل کو سمجھا بچھا کر تنہائی اور بے لطفی کی زندگی برداشت کرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں رہتا۔ چوٹ نے ڈرامے کے آخری سین میں اپنے دل کا سارا درد بھر دیا ہے:-

وہی نیٹ سکی (سوئیا کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے) میری

بچی میرے دل پر بڑا بوجھ ہے، تجھے کیا بتاؤں کیا بوجھ ہے!

سوئیا: کیا کریں، چنیا تو پڑے ہی گا (خاموشی) تو کیا ہوا، وائیا ماموں،

پھر جنیں گے۔ دنوں کا ایک لگاتار سلسلہ، شام کا گراں وقت، گزار

دیں گے، قسمت ہماری جس طرح پر بھی آزمائش کرے، ہم اُسے صبر کے

ساتھ بھگت لیں گے۔ اب اور بڑھاپے میں ہم دوسروں کے لیے محنت کریں گے آرام کا نام نہ لیں گے۔ اور جب ہماری گھڑی آئے گی تو عاثری کے ساتھ مرجائیں گے اور قبر کے اس پار پہنچ کر ہم کہیں گے کہ ہم نے مصیبتیں تھیلی ہیں، روتے ہیں، ہم کہیں گے کہ ہمارے لیے زندگی تلخ تھی، خدا کو ہم پر رحم آنے کا اور تب ماموں، میرے پیارے ماموں، ہم پر ایک روشن حسین، بڑے لطف زندگی کا دروازہ کھلے گا، اس وقت کے غم پر ہم کو حیرت ہوگی، اس کا خیال کر کے ہم مسکرائیں گے اور تب ہمیں آرام ملے گا۔ مجھے یقین ہے، دل دجان سے یقین ہے... دگھٹنوں پر کھڑی ہو کر ماموں کے ہاتھوں پر سر رکھ دیتی ہے، تھکی آواز سے) ہم کو آرام ملے گا... مجھے یقین ہے یقین ہے... (ماموں کے آنسو پونچھتی ہے) میرے پیارے، پیارے ماموں، آپ رورہے ہیں... (خود رو کر) زندگی میں تو آپ کو کوئی خوشی نصیب نہیں ہوئی، مگر ٹھیرے، وانیا ماموں، ٹھیرے، ہم کو آرام ملے گا... (ماموں کو لپٹ کر) آرام ملے گا... آرام ملے گا۔“

”وانیا ماموں“ کے آخر میں ان آنسوؤں کے ساتھ تھوڑا بہت غم بھی یہ جاتا ہے اور طبیعت کچھ ہلکی ہو جاتی ہے، ”تین بہنوں“ میں تسلی کا یہ بہانہ بھی کام نہیں آتا اور شروع سے آخر تک ایک ایسی اُداسی چھائی رہتی ہے کہ جس سے دم گھٹتا ہے۔ ڈراما کی مرکزی سیرتیں تین بہنیں، اولگا، ماشا اور ایرینا ہیں۔ پہلے ہی سین میں ان کی ساری کیفیت معلوم

ہو جاتی ہے، ان کے ارمان، ان کی مصیبتیں اور وہ غم جو ہر ایک کے دل
 میں گھر کیے ہوئے ہے۔ ان کا باپ فوج میں کسی بڑے عہدے پر
 ملازم تھا اور کسی زمانے میں وہ سب دارالسلطنہ ماسکو میں رہتی
 تھیں۔ لیکن باپ کا انتقال ہو گیا، مالی دشواریوں نے ان کو ایک
 قصبے میں جا کر رہنے پر مجبور کیا، جہاں رہتے انھیں گیارہ برس
 ہو گئے ہیں۔ اولگاسکول میں پڑھاتی ہے، مگر اس کام میں اس کا جی
 نہیں لگتا اور اسے اتنی محنت کرنی پڑتی ہے کہ اس کے ہر وقت سر
 میں درد رہتا ہے۔ غالباً اس خیال سے کہ اس کی عمر بہت زیادہ
 ہو گئی ہے وہ شادی کا حوصلہ نہیں کرتی، مگر اس کے دل میں محبت
 اور انسانی ہمدردی کا جذبہ اتنا قوی ہے کہ اپنا اور پر ایادکھ درد
 اسے ہر وقت بے چین رکھتا ہے۔ دوسری بہن ماشا کی ایک اسکول
 کے استاد سے شادی ہو گئی جسے وہ پہلے بہت لائق سمجھتی تھی اور اس
 سے ڈرتی دبتی بھی تھی۔ لیکن ساتھ رہنے نے شوہر کی قلعی کھول دی
 ہے اور ماشا کو معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کی ذہانت اور علمی قابلیت
 معمول سے بھی کم ہے اور وہ ایک دلو، خوشامدی اور بد مذاق آدمی
 ہے۔ ماشا نے اس کا ادب اور لحاظ کرنا بالکل چھوڑ دیا ہے، اپنے آپ
 کو بالکل آزاد رکھتی ہے مگر اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اس آزادی کو
 کرے کیا۔ سب سے چھوٹی بہن ایرینا کو اس کا حوصلہ ہے کہ ماسکو جا کر
 وہاں رہے اور اسے یقین ہے کہ وہ ایسا کر سکی تو اس کی تمام مصیبتیں ختم

ہو جائیں گی اور اسے جینے میں وہ مزاملے گا جس کو وہ اب تک ترستی
 رہی ہے۔ وہ صرف بڑے شہر میں رہنے، شائستہ لوگوں سے ملنے، اچھا
 کھانے اور اچھا پہننے کی خاطر ماسکو نہیں جانا چاہتی، وہ ایک موقع پر
 کہتی ہے کہ ”محنت کرنا چاہیے، محنت۔ ہم خوش اس وجہ سے نہیں
 رہتے، زندگی کو ہم ایسی اُداس نظروں سے اس لیے دیکھتے ہیں کہ ہم
 محنت کرنا نہیں جانتے، ہم ایسے لوگوں کی اولاد ہیں جو محنت کو
 حقیر جانتے تھے۔“ وہ خود محنت کر کے عمل اور خیال میں مطابقت
 قائم رکھتی ہے۔ مگر اس کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ اگر وہ ہاسکو
 نہ جاسکی تو سب کچھ بیچ ہوگا اور اس لیے محنت کرنے پر بھی اس کی
 طبیعت پتھر مردہ رہتی ہے۔ ایک فوجی افسر تو زین باخ، جو ایرینا سے
 محبت کرتا ہے، محنت کر کے روٹی کمانے کے شوق میں ملازمت سے استعفا
 دے دیتا ہے۔ ایرینا جانتی ہے کہ وہ بڑی خوبیوں کا آدمی ہے اور دل
 سے اس کی قدر کرتی ہے۔ مگر اسی دل کو اس کی طرف سے ٹھنڈا بھی
 پاتی ہے، اس سے شادی کرنے پر راضی ہو جاتی ہے، مگر جو محبت اس
 کے خیال میں عورت کو مرد سے ہوتا چاہیے اس سے اپنے سینے کو
 خالی دیکھتی ہے۔ شادی کی نوبت نہیں آنے پاتی، اس لیے کہ تو زین
 باخ کا ایک ملاقاتی فوجی افسر رشک میں اسے مار ڈالتا ہے اور ایرینا
 ہاتھ مل کر رہ جاتی ہے۔ ماشا پر اس سے بھی زیادہ سخت مصیبت آتی
 ہے۔ وہ ایک فوجی افسر سے ملتی ہے، دونوں ایک دوسرے کو بہت

پسند آتے ہیں، لہٰذا پھر محبت کی آگ بجھانے کی تدبیریں کرنا پڑتی ہیں
کیوں کہ فوجی افسر بیوی بچوں والا آدمی ہے اور اس کی شاعرانہ گفتگو
بے بسی اور منطوقیت کا ترانہ ہے۔

”تین بہنوں“ کو پڑھنے کے بعد یہ خیال ہوتا ہے کہ روسی سوسائٹی
زیادہ دن قائم رہنے والی نہیں اور چٹون نے اپنی طرف سے اس کے
عنقریب فنا ہو جانے کی پیشین گوئی ”باغ“ میں کی۔ ڈراما میں مرکزی
حیثیت ایک شریف خاندان کی عورت لیو پوف آندرے یفنا کو دی
گئی ہے۔ اس نے اپنے گھر والوں کی مرضی کے خلاف ایک وکیل سے
شادی کر لی تھی جو طبیعت کا بہت اچھا لڑکھڑا تھا اور
اسی لٹ کی وجہ سے جلد مر گیا۔ اس کے مرنے پر لیو پوف آندرے یفنا
کی ایک اور شخص سے آشنائی ہو گئی جس کی خاطر اس نے اپنی ساری
جائداد گنوا دی اور پھر اس کے قریب رہنے کے لیے پیرس میں جا کر پڑی۔
ڈراما کا قصہ جب شروع ہوتا ہے تو وہ پانچ برس کے بعد پہلی دفعہ گھر
واپس آئی ہے۔ اپنا پیدائشی گھر دیکھ کر اسے جو خوشی ہوتی ہے، جس محبت
سے وہ ہر ایک سے ملتی ہے اس سے ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ وہ دل کی
بہت اچھی ہے، مگر ہم یہ بھی دیکھ لیتے ہیں کہ اسے اپنی طبیعت پر ذرا بھی
قابو نہیں اور نہ وہ سمجھتی ہے کہ دنیا میں گزر بسر کرنے کے لیے کیسی احتیاط
اور عاقبت اندیشی درکار ہے۔ اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مکان اور
ملہ ڈراما کا پورا عنوان ”چری کا باغ“ ہے۔

بانغ نیلام ہونے والا ہے تو اسے بچانے کی وہ خود کو مئی فکر نہیں کرتی اور کسی دوسرے کو بھی کچھ کرنے نہیں دیتی۔ لیکن جب مکان اور بانغ نیلام ہو جاتا ہے تو وہ ہر شخص اور ہر چیز سے اس طرح رخصت ہوتی ہے کہ آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں۔

لیوبوف آندرے یفنا کا بڑا بھائی گالیف اپنی طبیعت میں کچھ کم تباہی کا سامان نہیں رکھتا۔ وہ ذہین تو ہے مگر ساری عمر بیکاری میں گزارنے سے پچاس برس کی عمر میں اس کا یہ حال ہو گیا ہے کہ اس کی بچوں کی طرح دیکھ بھال کرنا اور اسے بات بات پر ٹو کنا پڑتا ہے۔ معاملے کی کوئی بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی، وہ ہر وقت یا تو تقریر کرتا ہے یا بلیرڈ کے ہاتھ دکھاتا ہے۔ اسی ذہنیت اور مزاج کا ایک اور نمونہ تروفی موف ہے، جو کسی زمانے میں لیوبوف آندرے یفنا کے بچے کو پڑھایا کرتا تھا اور اس کے انتقال کے بعد بھی گھر میں پڑا رہا۔ اس کی تقریریں سن کر خیال ہوتا ہے کہ وہ نہایت بلند حوصلہ اور مضبوط ارادے کا آدمی ہے اور ضرور کچھ کر دکھائے گا، دراصل اس کے تخیل کی بلند پروازی گالیف کی تقریروں کی طرح ایک لت ہے، جس نے اس کو بالکل نکلنا کر دیا ہے۔ ڈراما کی سیرتوں میں اگر کوئی ہے جس میں زندہ رہنے کی استعداد ہے تو وہ ایک تاجر کا لڑکا لوپوخن ہے۔ وہ ڈنڈے کھا کھا کر پلا ہے، یورپی تہذیب سے بے بہرہ ہے، مگر اپنے فائدے نقصان کو سمجھتا ہے اور اس میں اتنی چستی اور دوردھوپ کا مادہ ہے کہ اپنے

منصوبے پورے کرے۔ اس تروف سکی کو روسی سوسائٹی کی فلاح
اسی طبیعت کے آدمی پیدا کرنے میں نظر آئی تھی، چخوف نے بھی اس
حقیقت سے انکار نہیں کیا، لیکن وہ جانتا تھا کہ تعلیم یافتہ روسی دنیا
سے رخصت ہو جانا اپنی وضع بدلنے سے زیادہ آسان سمجھیں گے۔

چخوف کو رونے اور رُلانے کے ساتھ ہنسنے اور ہنسانے میں بھی
کمال حاصل تھا۔ اس کے فرحیہ ڈرامے، جو بہت مختصر ہیں اپنے طرز
میں بے مثل ہیں۔ لیکن ان کا مزہ سیرتوں کی خصوصیات میں نہیں
بلکہ گفتگو میں ہے۔ اور بغیر ڈراموں کو پڑھے حاصل نہیں ہو سکتا۔

چخوف کا خاص طرز بہت مقبول ہوا، لیکن چخوف استاد کا کام
نہ دے سکا، اس لیے کہ اس کے طرز کی نقل کرنا ممکن نہیں۔ اس
کے اور ان استعاریت پسندوں کے درمیان جن کا جنگِ عظیم سے
پہلے چرچا تھا صرف گورکی کا ڈراما ”قعر ندالت“ ذکر کے لائق ہے،
جس پر چخوف کا اثر نظر نہیں آتا بلکہ دستہ نعت سکی کا۔ روسی نقادوں
نے تو اس میں کوئی خاص خوبی یا حدت نہیں پائی، کیوں کہ ان کے
تزدیک گورکی اور دوسرے انشا پرداز ایسے فلسفیانہ مزاج کے خانہ
خراب لوگوں کو جن کی ذہنیت اور حالات اس ڈراما کا موضوع ہیں
بہتیری تصانیف میں پیش کر چکے ہیں، مگر یورپ میں یہ ڈراما بہت پسند
کیا گیا اور واقعی وہ ہزار خوبیوں کی چیز ہے۔ اس کا پس منظر ایک رات
ہے جس میں بے روزگار اور جہایم پیشہ لوگ رات کو پناہ لیتے ہیں اور

ایک چور، ایک شرابی، ایک مفلس خطاب یافتہ زمیندار، ایک لوہار اور اس کی مدقوق بیوی، سرانے کی بھٹیاری، اس کی ایک رشتہ دار جوان لڑکی ستاشا، اس کی خادمہ ناستیا ڈراما کی ممتاز سیرتیں ہیں۔

ان سب کے دن کسی نہ کسی طرح کٹ رہے ہیں کہ اچانک لوکا، ایک فقیر آکر ان کی طبیعتوں میں انقلاب پیدا کر دیتا ہے۔ کسی کو معلوم نہیں کہ وہ کون ہے اور کہاں سے آیا ہے، لیکن اس میں معاملے کو سمجھنے اور سلیقے سے بات کرنے کی ایسی حیرت انگیز قدرتی صلاحیت ہے کہ وہ فوراً اعتبار حاصل کر لیتا ہے اور سب کا راز داں بن جاتا ہے۔ اس کے لہجے میں کچھ ایسی نرمی، اس کی زبان میں ایسا جادو ہے کہ سب اسی کی بات کو سنتے ہیں اور اسی کو سننا چاہتے ہیں، دنیا ان سے جو برتاؤ کرتی رہی ہے اس سے معاف نہیں کرتے مگر لوکا کے سامنے سر جھکا لیتے ہیں۔ لوہار کی مدقوق بیوی، جس نے ساری عمر میں ایک لمو بغیر تکلیف کے نہیں گزارا ہے خدا کے رحم و کرم اور جنت کے سکون اور آرام کی کہانی سنتے سنتے آخر کو مسکراتی ہوئی اپنی آنکھیں ہمیشہ کے لیے بند کر لیتی ہے، شرابی کو، جس کے قوی آہستہ آہستہ جواب دے رہے ہیں لوکا ایک ہسپتال کا قصہ سناتا ہے جہاں شرابیوں کا سفٹ علاج کیا جاتا ہے اور ان کو اس مہلک عادت سے نجات دلائی جاتی ہے۔ ہسپتال کا ذکر سن کر شرابی کی ڈھارس بندھ جاتی ہے اور یہ امید کہ وہ ہسپتال تک پہنچ جائے گا اس کی زندگی کا ایک اکیلا

سہارا بن جاتی ہے، ایسا سہارا کہ جب لوگ شرارت میں اس سے کہتے ہیں کہ یہ ہسپتال فقیر کی ایجاد ہے اور کوئی اصلیت نہیں رکھتا تو شرابی مایوس ہو کر خودکشی کر لیتا ہے۔ فقیر کی خاص توجہ چور اور تاشا کی طرف رہتی ہے اور انھیں وہ نئی اور پاک صاف زندگی کی رغبت دلانے کی بڑی کوشش کرتا ہے۔ چور دراصل خاصا نیک دل ایمان دار آدمی ہے، جس کا باپ چور تھا اور جسے لوگوں نے چور کہتے کہتے باپ کا پیشہ اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔ اس کا چوری کرنا اور نہرہب اور اخلاق کو ڈھکوسلا سمجھنا اس کے اخلاقی حس کا پتہ دیتا ہے، اسے عیب اور ریاکاری پر غصہ آتا ہے، نیکی پر ہنسی نہیں آتی۔ ایک موقع پر وہ فقیر سے پوچھتا ہے کہ بتاؤ خدا ہی یا نہیں، اور فقیر جواب دیتا ہے کہ ”مانتے ہو تو ہے اور نہیں مانتے ہو تو نہیں“ یہ جواب سن کر چور ایسا چپ ہوتا ہے کہ دیر تک اس کے منہ سے کوئی بول نہیں نکلتا اور وہ فقیر کا دل سے معتقد ہو جاتا ہے۔ لیکن فقیر کا حوصلہ کہ چور اور تاشا ایک دوسرے سے محبت کریں پورا نہیں ہوتا، اس لیے کہ چور کا بھٹیاریں سے پارا نہ ہی اور وہ اسے تاشا کی طرف مائل دیکھ کر ایسا فتنہ برپا کرتی ہے کہ چور اور فقیر دونوں غائب ہو جاتے ہیں۔

”دقعر مذلت“ کے علاوہ گور کی نے اور کئی ڈرامے لکھے جو کوئی خاص خوبی نہیں رکھتے۔ شاعر دیاچلاں اوانوں نے چخوف کے طرز

میں طبع آزمائی کی، لیونڈ آندرے یف نے ڈراما کو اعصابی دیوانہ پن میں رنگنے کی کوشش کی، اگلے ہی تالیف نے نفسیاتی سمجیدگیوں اور روحانی امراض کے مطالعے کو چھوڑ کر صحیح العقل یورپی انشا پر دازوں کی طرح قصے اور کشمکش کو نمایاں کرنا چاہا اور استعاریت پسندی نے ڈراما میں اپنے خاص انداز کو کھپانا چاہا۔ ان میں سے کسی میں اتنا مادہ نہیں تھا اور کسی کے پاس علم، تصورات اور عقائد کا اتنا ذخیرہ نہیں تھا کہ ایک نیا ڈھب اختیار کیا جاسکے اور انشا پر دازی کی دوسری قسموں کی طرح انقلاب سے پہلے کی ڈراما نویسی بہت سے رنگوں کی یک جہی ہو جسے تصویر نہیں کہا جاسکتا۔ ان کوششوں میں اگر کوئی قابل ذکر ہیں تو استعاریت پسندوں کی، جن میں سب سے ممتاز شخصیت الکساندر بلوک کی ہے۔

بلوک کے ڈرامے بہت انوکھے اور نرالے ہیں، ان کی زبان بہت فصیح ہے اور ان میں سے جو اسٹیج پر دکھائے گئے وہ خاصے مقبول ہوئے۔ لیکن زندگی کو بلوک جس رنگ میں دکھاتا ہے، انسانی کیفیتوں کو جس انداز سے وہ پیش کرتا ہے اسے سمجھنا ذرا مشکل ہے اور نتیجے کے طور پر جو حقیقت آخر میں واضح ہوتی ہے وہ ہمیں ایسی بلند اور بصیرت افروز نہیں معلوم ہوتی کہ جس کی خاطر روزمرہ زندگی کا نقشہ اس طرح بگاڑا جائے جیسے کہ استعاریت پسند چاہتے ہیں۔ مثلاً بلوک نے اپنے ڈراما "انجان عورت" "

میں اس حجاب کو اپنا موضوع بنایا ہے جو دیدار کے مشتاق شاعر کو
 حسن کامل سے جُدا رکھتا ہے۔ حسن کامل کا مجسمہ ایک انجان عورت
 ہے جو آسمان پر ایک ستارہ تھی اور زندگی اور جذبات کی یہ سج و تاب
 کافرہ اٹھانے کے شوق میں زمین پر اتر آئی۔ چوں کہ شاعر میں اتنا
 حس نہیں کہ اس کے قرب کو محسوس کرے نہ آنکھ میں اتنی قوت
 کہ اسے پہچان سکے، انجان عورت کا کوئی پُرساں حال نہیں۔
 پہلے وہ ایک شراب خانے کے دروازے پر جس کے اندر اور لوگوں
 کے ساتھ شاعر بھی بیٹھا شراب پی رہا ہے منتظر کھڑی رہتی ہے، پھر
 ایک میدان میں نازل ہوتی ہے جس میں سے کچھ پہلے دو آدمی مست
 اور بے خبر شاعر کو پکڑ کر لے جا چکے ہیں، شاعر کو کچھ تو خیال ہوتا ہے
 کہ وہ کہیں قریب آئی ہے، مگر جب تک اس کا نشہ اترے اترے
 انجان عورت کو ایک بوا لہوس لے اڑتا ہے۔ تیسرا منظر ایک مکان
 ہے جس میں بہت سے مہمان جمع ہیں، انھیں میں شاعر بھی ہے اور
 اس وقت جب وہ اپنی ایک نظم سناتا ہوتا ہے، انجان عورت بھی
 آہنچتی ہے۔ شاعر اسے پہچان تو لیتا ہے، مگر خاکساری اور بے مانگی
 کا احساس اسے انوکھے مہمان سے دور رکھتا ہے، انجان عورت
 مایوس ہو جاتی ہے اور پھر آسمان پر جا کر ستارے کی طرح چمکنے لگتی ہے۔
 اس ڈراما کا وہ پہلو جو استعاریت پسندوں کے نزدیک اس کی جان
 ہے سج پوچھا جائے تو بہت کمزور ہے، البتہ وہ حصے جن میں عام

زندگی کی بیہودگی اور لغویت ظاہر کی گئی ہے، یعنی اس میں حقیقت نگاری کا جو پہلو ہے، وہ بہت مؤثر ہے اور واقعی دنیا کو نشانہ اور پاک کرنے کا حوصلہ پیدا کرتا ہے۔

۱۹۱۰ تک سمجھنا چاہیے چخون کے طرز کا دور ختم ہو گیا اور استعاریت کی ادبی تحریک کمزور پڑ گئی۔ اسی کے ساتھ ایکٹنگ کے وہ اصول جن کے مطابق حقیقت نگاری اور ڈراما کی فنسٹریج پر پیدا کرنا فن کا اصل مقصد تھا چھوڑے جانے لگے۔ خود ستانسان سکی، ماسکو آرٹ ٹھیٹر کے بانی نے پرانے مسلک سے ہٹ کر نئی راہیں تلاش کرنا شروع کیا اور انقلاب، جو ٹھیٹروں کے حق میں بہت مفید ثابت ہوا، نئے تجربے کرنے کی تحریکوں کی سرپرستی کرتا رہا۔ ان مظاہر پر یہاں بحث نہیں کی جاسکتی، اس لیے کہ ایسی بحث یا نکل اصطلاحی ہو جائے گی اور ہمارا موضوع ایکٹنگ اور سٹیجنگ کا فن نہیں بلکہ ادب ہے۔

اصطلاحات پیشہ وراں - جلد اول و دوم

یہ بہت ہی قابل قدر کتابیں ہیں جس کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ ہماری زبان میں کیسا کچھ خزانہ بھرا پڑا ہے جو ہماری غفلت سے ناکارہ اور زنگ آلودہ ہو گیا ہے پہلے حصے میں تیاری مکانات اور تہذیب و آرائش عمارات کے ذیل میں بیس پیشوں کی اصطلاحات ہیں۔ دوسرے حصے میں تیاری لباس و تزئین لباس کے ذیل میں چھپس پیشوں کی اصطلاحیں بیان کی گئی ہیں۔ ہر اصطلاح کی مناسب تشریح کی گئی ہے اور حسب ضرورت ذہن نشین کرنے کے لیے تصویریں بھی دی گئی ہیں۔ باقی حصے زیر طبع ہیں مولوی ظفر الحسن صاحب نے ساہا سال کی محنت سے مرتب کی ہیں۔ ہر ادیب کی میز پر اور ہر کتب خانے کی الماری میں رکھنے کے قابل ہے۔

قیمت حصہ اول مجلد ۴۱ غیر مجلد ۴۲ حصہ دوم مجلد ۴۳ غیر مجلد ۴۴

کالمنے پتہ

انجمن ترقی اردو دہلی